صبح کا نور ہمارا ہے

(ناول)

اُمِ مریم

انتساب!

نہایت احترام کے ساتھ
اسامہ بن لادن کے نام
جنہوں نے سرحدوں کی درجہ بندی کیے بغیر
فی سبیل اللہ جہاد کیا

پیش لفظ

''صبح کا نور ہمارا ہے:'' میرا بے حد خاص ناول ہے جسے میں اپنے قلم کی تمام تر لاپرواہی اور بے نیازی کو ایک سائیڈ پر دھر کے خدائے پاک سے مدد کی خاص اپیل کرتے ہوئے لکھنے جا رہی ہوں تو وجہ اس میں موضوع جہاد ہی نہیں روحانیت کا شامل ہونا بھی ہے۔ قارئین کرام یہی دو بے حد خاص اور اہم موضوع ہیں جب میں لکھنے سے قبل خود کو بے حد حقیر اور بے مایا محسوس کرتی ہوں۔ موضوع کی حساسیت اور نزاکت کا مجھے اس درجہ احساس مغلوب کرتا ہے کہ ہفتوں نہیں مہینوں تلک قلم کو چھونے کی ہمتیں مجمع کیا کرتی ہوں اور اللہ پاک سے مدد کی درخواست بھی۔

مجھے یاد ہے میں بہت چھوٹی تھی اتنی چھوٹی کہ مجھے تب نبی پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی کا بھی تعارف حاصل نہیں ہوا تھا مگر تب حضرت امام حسینؓ کی شخصیت مبارک کے اوصاف خصائل اور شہادت سے آگاہی خدا نے عطا فرما دی تھی تو وجہ یہی تھی کہ ان کی شہادت کے دنوں میں ہمارے گھر میں انؓ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا تھا۔ انؓ سے محبت اور عشق کی وجہ یہی ذکر خیر تھا اور تب میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی قلم ہاتھ میں لے کر انہیں عظیم شخصیات کو تھوڑا سا خراج عقیدت پیش کرنے کا شرف مجھے بھی حاصل ہونے والا ہے۔

غلام حسین اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور یہ نام اس کردار میں نے حضرت حسینؓ کی محبت اور عقیدت میں ہی دیا ہے اور مجھے یقین ہے آپ کو یہ ناول اپنے موضوع کی تمام تر خاصیت واہمیت سمیت اتنا ہی پسند آئے گا جتنا مجھے خود پسند ہے۔

ڈیئر قارئین ہمارا ملک اس وقت اپنے ایک کٹھن اور آزمائشی دور سے گزر رہا ہے۔ یکم مئی 2011ء کا المناک دن ہر سچا پاکستانی اور اسلام دوست انسان کبھی نہیں بھول سکتا جس دن ایک نہایت بھونڈا ڈرامہ پیش کیا گیا۔ اسامہ بن لادن کو پاکستان میں ایک میجر آپریشن میں شہید کر دینے کا سنسنی خیز نا قابل یقین ڈرامہ۔ اس میں کس حد تک سچائی تھی یہ بھی آپ کو اس ناول کو پڑھنے کے بعد پتا چل جائے گا۔ وہ دن میرے لیے بے حد اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔ اسی دن

میں نے اسامہ بن لادن کی شخصیت کو واضح کرنے کی ایک سعی کرنے کا بھی سوچا تھا جس کا نام ''صبح کا نور ہمارا ہے'' کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

قارئین کرام میرے لیے یہ ایک بے حد کربناک اور اذیت انگیز انکشاف تھا کہ اکثریت (پاکستانی عوام) اسامہ جیسے عظیم مجاہد کے ان کارناموں سے آگاہ نہیں جو انہوں نے انجام دیئے۔ صد افسوس کہ لوگ یہ تک نہیں جانتے اسامہ بن لادن ایک مجاہد تھے۔ لوگ انہیں دہشت گرد سمجھتے ہیں اور اس میں ہمارے میڈیا کا کتنا قصور ہے اس بات پہ غور کرنا بھی بے حد اہم بات ہے اور خود ہمارے عوام کی لاپرواہی پہ تاسف بھی لازم وملزوم۔ ہمیں یہ تو پتا ہے انگلش اور انڈین نئی آنے والی مووی کون سی ہے مگر ہمیں یہ نہیں پتا کہ مذہب اور ملک کی بقا کیسے کاموں میں پوشیدہ ہے۔ ''صبح کا نور ہمارا ہے'' ایک سعی ہے ایسے لوگوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی اس دعا کے ساتھ کہ خدا اس سعی کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور مسلمانوں کو جہاد کی افادیت اور اہمیت سے روشناس فرمائے۔ آمین ثم آمین

اُمِ مریم

باب 1

صبح کا نور ہمارا ہے

آیا نہ ہوگا اس طرح حسن و شباب ریت پر
گلشنِ فاطمہؓ کے تھے سارے گلاب ریت پر
ترسے حسینؓ آب کو میں جو کہوں تو بے ادب
لمسِ لبِ حسینؓ کو ترسا ہے آب ریت پر
عشق میں کیا لوٹایئے عشق میں بچایئے
آلِ نبیؐ نے لکھ دیا سارا نصاب ریت پر
جتنے سوال عشق نے آلِ رسول ﷺ سے کیے
ایک سے بڑھ کر ایک دیا سب نے جواب ریت پر
آلِ نبی ﷺ کا کام تھا آلِ نبی ﷺ ہی کر گئے!
کوئی نہ لکھ سکا ادیب، ایسی کتاب ریت پر
آیا نہ ہوگا اس طرح حسن و شباب ریت پر
گلشنِ فاطمہؓ کے تھے سارے گلاب ریت پر

بند پر سکون کمرے میں خوشگوار حدت تھی۔ ہیٹر آن تھا اور کرسیوں پر فروکش تینوں مردوں کے چہرے پر سوز تھے۔ نوجوان عبدالعلی کی ریشمی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ نعت خواں تھا اس کی آواز کا سوز اور خوش الحانی خدا کی خاص عطا تھی۔ وہ پرکشش تھا مگر اس نوجوانی میں بھی کمال کا تدبر اور بردباری اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ یہ دس محرم الحرام کا دن تھا اور محفل میں ذکرِ حسینؓ جاری تھا جب دادا غلام محمد نے عبدالعلی سے فرمائش کر کے حسینؓ کے متعلق کلام سنانے کا کہا تھا۔ عبدالعلی خاموش ہو چکا تھا مگر اس کی آواز کا رچاؤ، الفاظ کا سوز کمرے کی فضا میں اپنا تاثر

قائم کر چکا تھا۔ ددا نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں اور گلا کھنکھار کر گویا ہوئے تھے۔

"شیطان کربلا میں کھڑا حسینؓ کا آخری سجدہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک آسمان کی طرف دیکھا اور کہا، تیری خدائی کو تو غور سے آج دیکھا ہے۔ کہاں معلوم تھا کہ نورِ عالم ایسے ہوتے ہیں۔

"اے خدا" سجدے سے انکار کبھی نہ کرتا اگر مجھے پتا ہوتا کہ انسان ایسے ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ!

دونوں بلندیوں کا نہیں ہے کوئی جواب
پشتِ نبیﷺ سے نوکِ ثنا تک گئے حسینؓ

"اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں حسینؓ کو پتا تو تھا سب کچھ پھر وہ کیوں جانتے بوجھتے وہاں چلے گئے۔ ددا نے کہا تھا پھر تاسف سے سر کو جنبش دی تھی۔

"ہاں انہیں پتا تھا مگر اسلام کی بقا کی خاطر یہ ضروری تھا۔ محمدﷺ کا بیٹا ہو کر وہ حق کے لیے نہ ڈٹ جاتے یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ ان کی شایان نہیں تھا۔

سجدے میں سر کٹانے پر عبادت ناز کرتی ہے
خون سے وضو جو کیا تو طہارت ناز کرتی ہے
شہیدوں کو تو اکثر ناز ہوتا ہے شہادت پر
حسینؓ ابنِ علیؑ تجھ پر شہادت ناز کرتی ہے

اور یہ کہ:۔

پوچھو یزید سے کہ تیرا راج ہے کہاں؟
وہ خون سے آلودہ تیرا تاج ہے کہاں
زندہ ہیں حسینؓ ابنِ علیؑ زندہ رہیں گے
لعنت کے سوا ذکر تیرا آج کہاں ہے

مزید یہ کہ:۔

نہ مدرسے، نہ مسجد، نہ فلسفے، نہ کلام
ثبوتِ حق کے لیے بس اک حسینؓ کافی ہیں

سبحان اللہ! سبحان اللہ!

کمرے کے باہر مدھم قدموں کی آہٹ ابھری پھر دروازہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ ددا سمیت عبدالعلی اور بابا نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔ بی جان اندر داخل ہوئیں تو ان کا سرخ و سفید چہرا اندرونی جذبات کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔

"مبارک ہو آپ کو، خدائے پاک نے بہو کی مشکل کو آسان کیا اور صحت مند بچے سے نوازا ہے....." ددا نے عبدالعلی کو دیکھا تھا پھر فرطِ مسرت سے اٹھ کر بے اختیار نہیں گلے لگا کر پیشانی چومی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے تھے۔

"**الحمد اللہ رب العالمین**" مبارک ہو بیٹے! اور اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اس بچے کا نام غلام حسین رکھنا چاہوں گا (حسینؓ ابنِ علیؑ کا غلام)

"اعتراض کیوں ہوگا ددا جان! حسینؓ ابنِ علیؑ کی غلامی سے بڑھ کر کیا شرف ہو سکتا ہے" عبدالعلی کے جواب پہ ددا کی نم آنکھیں بھیگی چلی گئیں تھیں۔

☆☆☆

آفس کی بڑی ٹیبل کے پار ریوالونگ چیئر پر بیٹھا وہ اپنے سامنے کھلی فائل کے مطالعے میں محو تھا جب ٹیبل کے کونے پر پڑے ٹیلی فون کی بیل زور و شور سے بجی اور ایک تسلسل سے بجتی چلی گئی۔ اسی آواز نے اس کی توجہ کا انہماک توڑ دیا تھا۔ فائلوں کے بے ترتیب انبار میں مشکل سے سہی مگر جگہ بنا کر چائے کا مگ رکھا تھا اس نے ہاتھ کو بڑھا کر ریسور اٹھانا چاہا تو چھناکے کی آواز کے ساتھ چائے کا مگ زمین بوس ہو گیا تھا تو وجہ اس کی عدم توجہ کی تھی ماربل کے چکنے فرش پہ چونکتی ہوئی مگر متاسفانہ نگاہ ڈالتا ہوا وہ ریسور کان سے لگا چکا تھا۔

"ہیلو! محبّ عبدالقدوس!"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا اور ریشمی کاندھوں تلک آتے لمبے بالوں کو ایک خفیف سے جھٹکے سے پیچھے گرایا۔

"ہاؤ ڈیئر یو محبّ عبدالقدوس!"

غراہٹ زدہ پھنکارتا ہوا لہجہ اس کے چہرے پہ موجود سنجیدگی کو گھمبیر سنجیدگی میں ڈھال گیا۔

"کون؟"

اس کی فراخ پیشانی پہ ناگواری شکنوں کی صورت نمودار ہوئی تھی۔

"تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو۔ دو ٹکے کے معمولی تنخواہ دار جرنلسٹ!"

جواباً دانتوں کو بھینچ کر ہتک آمیز لہجے میں کہا گیا جو محبّ عبدالقدوس کے چہرے پر زہر خند بکھیر گیا۔

"اس تکلیف کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

چہرے کے تاثرات کی طرح اس کے لہجے میں بھی زہر پھیلا۔

''وجہ تم جانتے ہو۔ اس خبر کی تردید خود ہی کر دو ورنہ کسی روز تمہارے گھر والوں کو تمہاری گلی سڑی لاش کسی گٹر سے ملے گی اور لوگ تم سے عبرت حاصل کریں گے''

تمسخرانہ لہجے میں تنبیہہ سے بڑھ کر دھمکی کا رنگ واضح تھا وہ سمجھتا تھا پھر بھی خائف نہیں ہوا۔

''اگر آپ کا مقصد مجھے باز رکھنا ہے تو آپ کی اطلاع کے عرض کر دوں میں ان گیدڑ بھبکیوں سے خائف ہونے والا نہیں ہوں آپ سے جو ہو سکتا ہے وہ کریں۔ بس اتنا خیال رکھئے گا یہاں دوبارہ کال کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے''

ہونٹ سکوڑ کر نخوت سے کہتے ہوئے اس نے ریسور کریڈل پر پٹخا اور پھر فائل کھول لی۔

☆☆☆

آہستگی سے دروازہ کھول کر اس نے اندر قدم رکھا تو لابی میں جلتے انرجی سیور کی روشنی ہالے کی صورت نیم تاریک کمرے میں پھیلتی چلی گئی۔ اسٹڈی ٹیبل پہ بکھرے اوراق اسٹڈی ٹیبل پہ پھڑ پھڑاتے تھے۔ ماحول میں ان کے ملبوس کے ساتھ سگریٹ کی بھی مہک رچی بسی تھی۔ جسے اس نے گہرا سانس کھینچ کر اندر اتارا اور سبک انداز میں چلتی ٹیبل تک آ گئی۔ صفحات کے درمیان قلم کھلا پڑا تھا۔ گویا وہ ابھی وہاں سے اٹھ کر گئے ہوں۔ واش روم کے ساتھ بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بھی نیم وا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی اس وقت وہ ٹیرس پر ہوں گے۔ اس نے کچھ دیر کو سوچا پھر پیپر ویٹ اٹھا کر رائٹنگ پیڈ اپنے سامنے کیا اور نگاہ صفحات پر جما دی مگر اگلے لمحے اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل کر رہ گئیں۔ کسی کالم۔ آرٹیکل یا فیچر کی بجائے جذبوں کی عکاس ایک طویل نظم تھی۔

کہا تھا نا
اس طرح سوتے ہوئے
مت چھوڑ کے جانا مجھے
مجھے بے شک جگا دینا بتا دینا
محبت کے سفر میں میرے ساتھ چل نہیں سکتیں
جدائی کے سفر میں میرے ساتھ چل نہیں سکتیں
تمہیں رستہ بدلنا ہے
میری حد سے نکلنا ہے
تمہیں کس بات کا ڈر تھا

تمہیں جانے نہیں دیتا
کہیں پہ قید کر لیتا
ارے پگلی!
محبت کی طبیعت میں زبردستی نہیں ہوتی
جسے رستہ بدلنا ہو اسے رستہ بدلنے دے
جسے حد سے نکلنا ہو اسے حد سے نکلنے دے
نہ کوئی روک پایا ہے نہ کوئی روک پائے گا
تمہیں کس بات کا ڈر تھا
مجھے بیشک جگا دیتیں
میں تم کو دیکھ ہی لیتا
تمہیں کوئی دعا دیتا
کم سے کم یوں تو نہ ہوتا
میری ساتھی حقیقت میں
تمہارے بعد کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں باقی
مگر پھر بھی مجھے دیکھو
ابھی کھونے سے ڈرتا ہوں
میں اب سونے سے ڈرتا ہوں

رائٹنگ پیڈ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ نیم وا ہونٹوں کے ساتھ ساکن پلکیں لیے وہ ششدر کھڑی تھی۔

''آج کیا ہوا انہیں؟ اتنے کمزور کیوں پڑ گئے۔ ہمیشہ اجتماعی دکھوں پر ملول اور افسردہ رہنے والا انسان ذاتی اور انفرادی دکھ پہ مضطرب تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ وہ بنا پلٹے جان سکتی تھی آنے والا ابن زید کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی انہیں اپنی ذات کی پرتیں کسی پہ کھلنا پسند نہیں اور انہیں شرمندہ و ملول دیکھنے کا یارا تو اسوہ میں بھی نہیں تھا۔ جبھی اس سے پہلے کہ وہ اس تک آتے اسوہ سرعت سے آگے بڑھی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ پیچھے اس کے آنچل کی سرسراہٹ کھلے دروازے سے در آنے والا روشنی کا ہالہ اور بکھرے کاغذات کے ساتھ ابنِ زید کا ٹھٹھکا ہوا وجود رہ گیا تھا جو اپنی اس

وقتی کمزوری پہ ہونٹ بھینچے کھڑے اس صفحے کو رائٹنگ پیڈ سے پھاڑ کر مٹھی میں بھینچنے کے بعد ڈسٹ بن میں ڈال رہے تھے۔

☆☆☆

وہ جب سے آئی تھی منہ سجائے بیٹھی تھی۔ زبردستی اسے ساتھ لا کر اس کی سہیلیاں اپنے فیورٹ سنگر کی سمت دل و جان سے متوجہ تھیں اسے یکسر بھلائے۔ ہوٹل کے وسیع و عریض سبزہ زار پہ منعقدہ یہ میوزک کنسرٹ اس وقت روشنیوں، رنگوں اور زندگی کے تمام رنگوں سے بوجھل تھا۔ انجوائے منٹ کا وہاں سارا سامان تھا مگر دیا جیسی لڑکی کے لیے نہیں۔ بے زاری و اکتاہٹ سمیت اس نے رنگ برنگی روشنیوں کی تیز بوچھاڑ میں اسٹیج پہ بے ہنگم سی اچھل کود مچاتے چار پانچ عجیب زنانہ قسم کے تیز رنگوں کے لباس میں ملبوس لڑکوں کو تاسف بھری نگاہوں اور کشیدہ ہوتے اعصاب سمیت دیکھا۔

حسین کی باڈی، حسین کی ادائیں، حسین کی آنکھیں، حسین کا ہیئر کٹ۔ اس کی سلجھی ہوئی سہیلیاں اس وقت کسی درجہ سطحی اور تھرڈ کلاس انداز میں مشہور و معروف پاپ سنگر حسین کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ اسی تیزی سے دیا کے غصے کا گراف بڑھ رہا تھا۔ لب بھینچتے ہوئے اس نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے تھے مگر برداشت جواب دینے لگی تھی تبھی اچانک ہی ہر سمت ہاہوکار سی مچ گئی۔ بے ساختہ اور اچانک مچ جانے والی اس افراتفری پہ دیا نے کسی قدر ہونق ہوتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا کہ شاید مجمع میں کہیں سانپ گھس آیا ہو مگر اپنے اطراف نگاہ ڈالتے ہوئے اسے شدید قسم کا دھچکا لگا تھا۔ اسٹیج پر اچھل کود مچا کر گانا گاتا ہوا سنگر اب ہزاروں کے مجمع میں آ گھسا تھا وہ جس سمت جاتا اسی طرف گویا کھلبلی سی مچ جاتی۔ اس کی اٹھکیلیاں تو جو تھیں سو تھیں ہر لڑکی اور لڑکا گویا اسے چھونا خوش بختی اور سعادت گردان رہے تھے اور دیا یہ دیکھ کر انگشت بدنداں تھی کہ لڑکیاں اس کوشش میں کیسے اس سے چمٹی جا رہی تھیں۔ یہ اپر کلاس کی بگڑی ہوئی امیر زادیاں تھیں۔ یہاں ایسی گری ہوئی اور عامیانہ حرکات قابل حیرت/ مذمت نہیں سمجھی جاتی تھیں مگر دیا تو حیرت، رنج اور تاسف کے احساس سمیت منجمد رہ گئی تھی۔ اپنی ہی صنف کا پستی میں گرا ہوا یہ روپ اسے شاکڈ کر چکا تھا۔ یہ کیسی انوکھی دنیا تھی جہاں قدم قدم پہ دھچکا لگتا تھا۔ آدھی پنڈلیاں ننگی آدھی ڈھکی ہوئیں اور سلیولیس ڈیپ گلوں کے ٹاپ میں ملبوس وہ لڑکیاں اپنی نسوانیت اور زینت کو چھپانے اور ڈھانکنے کی بجائے کچھ اور بھی نمایاں کیے دعوت نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اسلام تو عورت کو جسم ڈھانپنے کے علاوہ چہرے و ہاتھوں کو بھی عیاں کرنے سے روکتا ہے مگر یہاں انوکھے ہی انداز تھے۔ یہ کیسی ترقی تھی یہ کیسا فیشن تھا؟ وہ سب کچھ فراموش کیے گویا اسی سوچ میں گم تھی۔

جب ثنا نے اسے ٹہوکا دیا تھا۔

''دیکھا کتنا چارمنگ ہے نا حسین''

دیا نے نافہم نظروں سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی بات سمجھنے سے قاصر رہی ہو۔ سنگر اب اس طرح اچھلتا کودتا اسٹیج پہ جا چڑھا تھا۔ ''ونس مور، ونس مور'' کی صداؤں سے فضا گونجنے لگی جسے بڑی ادا کے ساتھ قبول کرتا وہ پھر سے نغمہ سرا ہو گیا اور اسی گانے کے دوران وہ اپنے البم کی آڈیو اور ویڈیو سی ڈیز ڈسک ہر سمت اچھالتا رہا تھا تبھی ایک ویڈیو کیسٹ ان کی سمت بھی آئی جہاں وہ اپنی دوستوں کے ساتھ موجود تھی جسے حاصل کرنے کو اگلی پچھلی دونوں رو میں ویسی ہی ایک اور جنگ سی چھڑ گئی تھی جو اب تک اچھالی گئی کیسٹ کو حاصل کرنے کے نتیجے میں وہ ملاحظہ کر چکی تھی۔ اب کے کانٹے دار مقابلہ اس کی فرینڈز اور اس سے اگلی نشست پر بیٹھی لڑکیوں کے درمیان چھڑا تھا جو بے حد ماڈرن اور طرح دار قسم کی تھیں دونوں طرف ہی ایک دوسرے کو لتاڑ کر ہر ممکن طریقے سے کیسٹ حاصل کرنے کی کوشش میں ہلکان تھیں معاملہ یہیں تک رہتا تب بھی غنیمت تھی۔ تو تکار سے یہ لڑائی آگے بڑھی اور ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ دیا تو حیرت کی زیادتی سے آنکھیں پھاڑے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جبکہ اس کی باقی فرینڈز ثنا سے وفاداری نبھاتے ہوئے ثنا سے زبردستی کیسٹ چھیننے والی لڑکی کو خوب نوچ کھسوٹ رہی تھیں۔ ظاہر ہے اکیلی تو وہ بھی نہیں تھی سو دو گروپ بنے تھے اور دونوں نے ہی انگلش میں ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنے کے علاوہ ایک دوسرے کا خوب حلیہ بگاڑا تھا۔ جبکہ اردگرد موجود کتنے ہی ایسے ہی منچلے اس مفت کے تماشے سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔

''یہ تبرک تھا جو تم حاصل کرنے کو اس حد تک چلی گئیں۔ غالباً اسی طرح کی کتنی ہی سی ڈیز تمہیں مارکیٹ سے باآسانی دستیاب ہو جاتیں۔''

جب ثنا اپنی فتح پر نازاں سی ڈی ڈسک سنبھالے گردن اکڑائے کھل کر بکھر جانے والے بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں جکڑ رہی تھی۔ دیا نے مخالف گروپ کی لڑکی کی خونخوار نظروں کو ایک نگاہ دیکھ کر بہت چڑے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''ارے واہ! اتنی سی ہی تو بات نہیں ہے۔ محترمہ یہ حسین کی نئی البم کی سی ڈیز ہے اور کور پہ اس کا آٹو گراف ود سگنیچرز ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حسین شاہ کی طرف سے ہمیں پریزنٹ ملی ہے۔''

ثنا نے ڈسک پہ فدویانہ نگاہ ڈال کر بہت چہک کر کہا تھا۔

''تو گفٹ اس طرح سے بھی دیا جاتا ہے؟ جیسے کتے کو حقارت سے ہڈی پھینکی جاتی

ہے‘‘ اسے غصہ آ گیا تھا۔ اور جب اسے غصہ آتا تھا تو پھر وہ بہت کم کسی کا لحاظ کیا کرتی تھی۔ جواباً ثنا کا چہرا خفت سے سرخ پڑ گیا۔

’’دیکھو دیا اب تم مجھے غصہ دلا رہی ہو‘‘

ڈسک بہت حفاظت سے اپنے بیگ کی زپ کھول کر اندر رکھتے ہوئے ثنا نے خفگی سے کہا وہ چپ رہی۔ وہاں موجود لڑکیوں کے بے حجابانہ لباس اور لوفرانہ انداز دیکھ دیکھ کر اس کا دل جس کڑھن کا شکار ہوا اس پر جیسے ہلکی سی ٹھنڈک پڑی تھی۔ کسی کمزور لمحے میں ہی وہ ان کے مجبور کرنے پر یہاں آنے کی غلطی کر چکی تھی اور اب تک پتا نہیں کتنی مرتبہ خدا سے اس بہک جانے والے دل پہ معافی طلب کرتی رہی تھی۔

’’چلو غصہ تھوکو اور کچھ پیٹ پوجا بھی کر لو‘‘

حیا نے ان کی توجہ بتانا چاہی تھی اور سینڈوچز کے ساتھ پیپسی کے ٹن پیک سب کو تھمائے مگر اس کی یاسیت میں کمی نہیں آسکتی تھی۔

’’چلو یار جانے بھی دو اب۔ جیو اور جینے دو کے مقولے پر عمل کیوں نہیں کرتی ہو؟‘‘ حیا نے اپنے مخصوص لاپرواہ انداز میں کندھے جھٹکے تھے۔

یعنی خدا کے احکامات کو مانو یا نہ مانو۔ دوسرے لفظوں میں تمہارا مقصد یہ ہے نا؟ مجھے سخت نفرت ہے اس ایک فقرے سے‘‘

دیا دانت بھینچ کر غصے سے بولی۔ ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں میں کچھ اشارے کیے تھے۔

’’افوہ یار ہر بندہ اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ تم نے تو سمجھانے کا فریضہ ادا کر لیا نا؟‘‘

’’اگر مجھے پتا ہوتا تم اس قسم کا ذاہیات پروگرام دکھانے لا رہی ہو تو......‘‘

اس کا گلا بھرایا تو بات ادھوری چھوڑ دی۔ سرخ و سفید اجلے چہرے پر بکھری اضطرابی کیفیت اس کے نکھرے ہوئے بے تحاشا حسین چہرے کو دو آتشہ کرنے لگی۔ ان تینوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور اشاروں کی زبان میں کچھ باتیں نظروں سے کیں اور مزید کچھ کہے بغیر اسٹیج کی سمت متوجہ ہو گئیں۔ کنسرٹ کے اختتام پر انہیں بھی دیگر حاضرین کی طرح حسین سے آٹوگراف کی ہڑک جا گی تھی اور اس کے غصے کی پرواہ کیے بغیر وہ لوگوں کے جم غفیر میں گھرے حسین کی سمت چلی گئی تھیں۔ جتنا ہجوم تھا اسے دیکھ کر لگتا تو نہیں تھا ان کی باری جلدی آ جاتی یہ سوچ کر دیا کی کوفت کچھ اور بھی بڑھ گی تھی۔ غصے کی زیادتی سمیت لب بھینچے وہ اتنی لاتعلق اور

اکتائی ہوئی نظر آئی تھی کہ ثنا حیا وغیرہ کو آٹوگراف دیتے حسین کو اس کی یہی بے زاری و لاتعلقی اپنی سمت متوجہ کر گئی تھی یا پھر اس کا چاندنی میں نہایا شعاعیں بکھیرتا حسن ہی اتنا غیر معمولی اور چونکا دینے والا تھا کہ حسین کی اڑتی پڑتی نگاہ اس کے چہرے پر جتنے سرسری انداز میں پڑی تھی اس قدر چونکتے ہوئے مڑی اور ساکن ہو کر رہ گئی۔

’’ایکسکیوز می میم! آپ آٹوگراف نہیں لیں گی؟‘‘

بہت سی نگاہوں کو اپنی اور پھر اپنی نگاہوں کے تعاقب میں دیا کی سمت اٹھتے محسوس کر کے وہ خفیف سا چونکا۔ دلچسپ آمیز تبسم لبوں پر سجا کر گویا ہوا تھا۔ دیا کو تو گمان تک نہیں تھا کہ وہ اسے بھی مخاطب کر سکتا ہے۔ وہ ثناء کے زور سے اپنی پسلی میں ماری گئی کہنی پر چونک کر متوجہ ہوئی اور اسے اپنی سمت اتنی گہری متبسم اور ستائشی نگاہوں سے انہماک سے تکتا پا کر وہ پہلے تو سٹپٹائی تھی پھر اگلے لمحے اس کی ناگواریت بھری حیرت سمیت اپنی پیشانی سے ذرا سر کی چادر کو کھینچ کر صحیح کرتی رخ پھیر گئی۔ درمیانہ قد۔ لچکتی ڈال جیسا موی سراپا اور ملکوتی نقوش سے سجا دلربا چہرہ وہ صحیح معنوں میں حسین شاہ کے حواسوں پہ بجلیاں گرانے کا سبب بن گئی تھی یہ بھی نہیں تھا کہ اس سے قبل اس نے حسن نہیں دیکھا تھا ہاں البتہ اس قسم کی لڑکیاں اب اس کی زندگی میں بہت کم ٹکراتی تھیں۔ جس طرح اسے دیکھ کر لڑکیاں بے قابو ہو جایا کرتی تھیں وہ ایسی عورت کی قسم سے اوب چکا تھا شاید یا پھر اس لڑکی کے چہرے میں کچھ انوکھی کشش تھی جس نے اسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔

’’چلو ثانی پلیز‘‘

رخ پھیر لینے کے باوجود بھی اس کی تمام تر توجہ کا مرکز اپنے چہرے کو بنا دیکھ کر وہ بے چین ہوئی جز بز سی بولی تھی۔

’’ہاں چلتے ہیں یار، جسٹ اے منٹ!‘‘

حسین کا یوں اسے دیکھنا دوسرے لفظوں میں توجہ و اہمیت سے نوازنا بہت سی نگاہوں میں ’’دیا‘‘ کے لیے رشک و حسد سمیت لایا تھا جسے خود دیا نے کیا محسوس کرنا تھا البتہ ثنا حیا اور ثانیہ ضرور کر چکی تھیں۔

’’پلیز اف یو ڈونٹ مائینڈ۔ ایکسکیوز می مس آئی ایم آسکنگ یور نیم!‘‘

وہ جیسے ہی ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج کی سیڑھیاں اتری حسین شاہ سب کچھ چھوڑے اس کے پیچھے بھاگا آیا تھا اور دیا کا راستہ روک کر اس نے جس دھڑلے سے کہا تھا یہ دھڑلہ اس کی نیچر کا حصہ تھا یا نہیں آج کل کی بہکی ہوئی گمراہ بے راہ روئی نسل کا عطا کردہ ضرور تھا مگر اس مرتبہ اس کے

رو برو نئی نسل کی فیشن اور گمراہی کی ماری کوئی لڑکی نہیں تھی بلکہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے اپنے مذہب کی تعلیمات، خدا کے احکامات اور اپنی روایات کی پاسداری بہت عزیز تھی۔

''تمہارا دماغ درست ہے مسٹر؟ اس طرح سے راستہ روکنے کا مطلب جانتے ہو؟''

دیا کا غصہ تو جیسے آسمانوں پر پرواز کرنے لگا تھا۔ تب سے اندر ابلتا اشتعال جیسے بند توڑ کر نکلا۔ حسین کچھ کنفیوژڈ ہوا تھا۔

''سوری سر یہ کچھ کچھ ڈسٹرب ہیں اس وقت۔ ویسے انہیں ''دیا'' کہتے ہیں''

حیا نے بڑھ کر اس نازک صورتِ حال کو سنبھالنے کی سعی کی تھی اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ بعد میں اس گستاخی پر دیا اس کا کیا حشر کرنے والی ہے۔ اس وقت بھی دیا نے تنک کر اسے دیکھا اور ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر دھڑا دھڑ اسٹیرھیاں اتر گئی۔ حسین شاہ مسکرایا تھا۔

''بالکل صحیح کہتے ہیں''

اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ وہ بہت سکون بھرے انداز میں تن فن کرتی دیا کو سیڑھیاں اتر کر جاتے دیکھتا جانے کس خیال کے تحت مسکراتا رہا۔

''ویسے جتنی کیوٹ اور فیسی نیٹنگ حسن کی مالک ہیں یہ ان کا نام بھی اسی قدر یونیک ہے''

وہ اتنا خوش اخلاق ہرگز نہیں تھا جتنا اس وقت ہو چکا تھا۔ ثنا اور حیا سمیت تینوں لڑکیاں گویا اس پل خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھیں کہ اس پل حسین شاہ جیسا سپر اسٹار ان سے مخاطب تھا یہ کم اعزاز کی بات تو نہیں تھی جس کی تصویریں لڑکیاں اپنے بیڈ روم میں سجاتی تھیں اور دن رات اس کے فراق میں آہیں بھرتی تھیں وہ اس درجہ خوش اخلاقی سے ان سے بات کر رہا تھا چاہے کسی بھی توسط سے سہی۔

''افوہ کیا افتاد آگئی تھی دیا کہ تم یوں وہاں سے بھاگی چلی آئیں؟ کتنا آکورڈ لگ رہا تھا ہمیں'' جب وہ اس کے پاس آئیں تو حیا نے سب سے پہلے اس کی خبر لی تھی۔

''یار تمہیں تو ملانی ہونا چاہیے تھا۔ ابھی بھی کسی مولوی کو دیکھو اور اس سے نکاح کر کے گھر بسا لو اپنا'' ثانیہ کو بھی غصہ آیا ہوا تھا بات معمولی تو نہیں تھی آخر کو اس نے حسین شاہ جیسے آسمان کی بلندیوں کو چھوتے سیلیبریٹی کو اگنور کیا تھا۔ دیا نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا اس کا گلا آنسوؤں سے بھرایا جا رہا تھا۔ روڈ پر آ کر اسے جو پہلا رکشا نظر آیا اسی کو روک کر اس میں بیٹھ گئی تھی انہیں بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے ساتھی کے ساتھ کھڑا حقوق نسواں کانفرنس کی کوریج میں مصروف تھا مگر یوں کہ مارے بندھے، ورنہ درحقیقت وہ خود بھی جانتا تھا اس سارے ڈرامے میں کس حد تک غیر حقیقی رنگ تھا بلکہ یہ سارا تھا ہی ایک ڈھونگ۔ مگر چونکہ یہ اس کی جاب کا ایک حصہ تھا۔ گو کہ وہ سمجھوتے اور کمپرومائز جیسے الفاظ سے سخت نالاں تھا اس کی یہاں موجودگی سچائی اور ڈپلومیسی کے درمیان فرق کا تجزیہ ہی تھا وہ لوگوں تلک یہی فرق پہنچانا چاہتا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں گونجتا نظمیہ اس کے ہونٹوں پر زہر خند بکھیرنے لگا۔

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

کانفرنس کی کرتا دھرتا این جی او کی چیئرپرسن کا اس کے ساتھی فوٹو گرافر نے دیگر چینل اور اخبار کے فوٹو گرافروں کے بیچ گھس کر دھکم پیل میں خصوصی پوز لیا جو اس مظلوم عورت کو تحفظ دیئے بیٹھی تھی۔ جس کو بقول این جی اوز کی ''چیئرپرسن مسز لاشاری'' نے اس کے شوہر کے ظلم سے بچا کر گوٹھ سے نکالا تھا۔ ظلم ستم کی ایک طویل فہرست تھی جسے یہاں پوری تفصیل سے سنایا جا رہا تھا۔

ہر سال جنم لینے والا بچہ۔ ایک ظلم!

گھر کی ساری ذمہ داری تن تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھانا دوسرا ظلم! اس میں شوہر کی مار پیٹ سہنا معذور ساس کی خدمت مزید ظلم وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

اب حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عورت کی ذمہ داریاں بھی مظالم میں شمار ہونے لگی تھیں۔

نظمیہ ہنوز گونج رہا تھا:

یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
شواھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیغمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

سکندر نے گہرا سانس کھینچا اور سرد نظریں چیئرپرسن پہ جما دیں۔ عجیب تھی یہ عورت بے حد کمال چیز! اس کے بیٹے کی شادی کے موقع پہ گرینڈ فنا نے ٹائپ کا مجرا ہوا تھا اور جو مذاق اور ہنسی

کھیل کے شغل کے نام پہ اخلاق سوز حرکات اس میں کھلے عام ہوئی تھیں ان کی چھپ کر تصاویر سکندر نے اپنے ہینڈی کیم میں محفوظ کی تھیں مگر اس عورت کی محض ایک فون کال پہ یہ تصاویر اور ان کے خلاف لکھا گیا کالم دونوں ہی اشاعت کے مرحلے سے گزرے بغیر ضائع کر دیئے گئے تھے۔ اور سکندر نے بہت مایوسی میں گھر کر سوچا تھا۔

"کب تک آخر کب تک باطل حق پہ چھایا رہے گا؟"

بلاؤ خدایانِ دین کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ

اب اس نام نہاد مظلوم عورت کی جگہ ایک اور مظلومہ کو کیمروں کے سامنے کر دیا گیا تھا۔ جس کی عزت تار تار ہونے کی روداد ننگے لفظوں میں لاؤڈ اسپیکر پر دہرائی جا رہی تھی۔ انصاف لینے کی آڑ میں مزید اڑنے والی عزت کی دھجیاں جن کی پرواہ وہاں کسی چہرے کسی آنکھ میں دکھائی نہ پڑتی تھی۔ اس قسم کے ایک اور کیس کو پہلے عالمگیری شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ہال میں بیٹھے لوگوں کے سنجیدہ چہروں پر بجی آنکھوں میں محظوظ کن مسکان چھلکتی تھی۔ پس منظر میں گونجتا نظمیہ اب اس داستانِ الم میں دب رہا تھا۔

یہ کیسے لوگ تھے؟
یہ کیسے تماشائی تھے؟
اور یہ کیسی عورت تھی جو انصاف کی آڑ میں اپنی مزید بے حرمتی پر آمادہ تھی
کیسا تھا یہ اضطراب جو کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ نہ چہرے پر نہ آنکھوں میں
مطمئن چہرے پر اتنی اہمیت اور متوقع شہرت کی چمک بے حد واضح تھی تو آنکھوں میں
مزید کی ہوس

سکندر کا صرف اضطراب اور اشتعال ہی نہیں بڑھا، بے دلی بھی اس کے اعصاب کو کشیدہ کرنے لگی۔ اس نے اپنا قلم بند کر کے جیب میں ٹھونسا اور پیڈ کو یونہی بیگ میں گھسیڑ دیا۔ وہ اتنا مضمحل تھا کہ ایک لفظ لکھے بغیر وہاں سے نکلا تو اس کا دل حالات کی اس ستم ظریفی پر کڑھن کا شکار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے آج میرا چاند اتنا خاموش کیوں ہے؟"

ماں نے اس کو صوفے پر بٹھایا اور خود کارپٹ پر بیٹھ کر اس کے جوتے اور موزے اتارنے لگی تھی مگر اس کے پھولے گالوں والے معصوم سے چہرے کی اداسی اور خفگی لمحے کے ہزارویں حصے میں نوٹس کی تھی۔

"اماں آپ نے میرا نام غلام حسین کیوں رکھا؟ صرف حسین کیوں نہیں"

وہ بسورا تھا پھر اس سے قبل کہ ماں جواب دیتی وہ اس خفگی سے مزید گویا ہوا تھا۔

"اسکول میں سب بچے مجھے چھیڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں غلام حسین ہوں اور غلام آپ کو پتا ہے سرونٹ کو کہتے ہیں۔ میں سروٹ تو نہیں ہوں اماں! ہمارے ہاں تو صابر ہے نا سرونٹ"

وہ ٹھنک کر بولا تھا۔ ماں رسانیت اور نرمی سے مسکرا دی۔

"آپ بچوں کی بات کا برا نہ مانا کریں بیٹے! آپ غلام حسین ہیں اور آپ کو پتا ہے حسینؓ کون ہیں؟ نبی کریم ﷺ کے پیارے نواسے حسینؓ ابنِ علیؓ جنہوں نے میدان کربلا میں اسلام کی بقا کی خاطر جامِ شہادت نوش کیا۔ نبی ﷺ کے بیٹے کا مقام جتنا ارفع و اعلیٰ ہے نا ہم جیسے لوگوں کو اگر ان کی غلامیت کا درجہ حاصل ہو جائے تب بھی ہماری خوش بختی کا شمار ممکن نہیں۔

دادا جو یہ بات سن رہے تھے سیرت النبی ﷺ کی کتاب بند کر کے سائیڈ پہ رکھی تھی اور پوری طرح سے پوتے کی سمت متوجہ ہو کر بہت پیار اور رسانیت سے سمجھایا۔ پھر مسکرا کر اسے گود میں لیا اور پیشانی چوم کر ملائمت سے بولے تھے۔

"آپ اس بات کا برا نہ مانا کرو بیٹے! وہ بچے بھی ابھی ناسمجھ ہیں اسی لیے آپ کو ایسا کہتے ہیں۔ چلیں میں آپ کو اسی حوالے سے حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ سناتا ہوں (یہ حسینؓ کا بچپن کا دور تھا) ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ کے ساتھ حضرت امام حسینؓ کا بچپن میں کسی بات پہ جھگڑا ہو گیا تو حضرت امام حسینؓ نے حضرت عبداللہؓ کو ابنِ غلام کہہ کر پکارا حضرت عبداللہؓ نے گھر آ کر اپنے والد گرامی سے شکایت کی کہ حسینؓ نے یہ بات کہی ہے حضرت عمر فاروقؓ نے بیٹے سے کہا جاؤ اور ان سے کہو یہ بات لکھ کر دیں حضرت عبداللہؓ گئے اور حسینؓ سے یہ بات لکھوا کر لے آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس تحریر کو پڑھا اور مسکرا کر فرمایا۔ روز قیامت یہ تحریر تم پر میری گواہی بن جائے گی کہ میں نبی کریم ﷺ اور اُن ﷺ کے نواسےؓ کا غلام ہوں"

بیٹے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اُن کے درجات کی عظمت اور بلندی کی تو صحابہ کرام بھی گواہی دیتے ہیں اور غلامیت کو فخر محسوس کرتے ہیں ہم تو پھر عام انسان ہیں۔ آپ وعدہ کریں

آپ کبھی اس بات پہ غصہ نہیں کریں گے۔بی کو زیبہ بات قابل فخر ہے۔حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے حضرت عباس علمدارؓ کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹے حسینؓ و حسنؓ کو بھائی نہیں اپنا آقا سمجھنا تیرا باپ نبی کریم ﷺ کے غلام تھے اور آپ محمد ﷺ کے بیٹوں حسنؓ و حسینؓ کے غلام ہیں"

دادا اکثر و بیشتر ایسی باتیں سمجھایا کرتے۔غرض اس کی پرورش ایسے ہی مکمل مذہبی اور دینی ماحول میں ہو رہی تھی۔اور دادا کو پورا یقین تھا ان کا پوتا عالمِ دین بنے گا

مگر یہ بات ان کے لیے نہیں پوری فیملی کے لیے باعث شاک تھی جس دن ان پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ حسین نے دورانِ تعلیم میوزک کی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنا البم نکالا تھا اور راتوں رات وہ شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا تھا۔ان تک یہ بات تب پہنچی تھی جب پانی سر سے اوپر گزر چکا تھا بابا کا غیض و غضب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور دادا تو صدمے سے گنگ ہو گئے تھے گویا، اور غلام حسین اسے تو جیسے سرے سے پرواہ نہیں تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔تم یہاں سے چلے جاؤ"

عبدالعلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔جس کے اس کی ماں آڑے آنے لگی تھیں۔

"آپ کو خدا کا واسطہ ہے عبدالعلی ایسا مت کریں۔آپ تو گویا اسے مزید بے مہار کر رہے ہیں۔"

"پھر کیا کروں؟ وہ سمجھانے کی حدوں سے نکل نہیں چکا؟"

انہوں نے ٹوٹتی آواز میں کہا تو دادا نے مداخلت کی تھی۔

"اسما غلط نہیں کہہ رہی ہے بیٹے! میں غلام حسین کو سمجھاؤں گا"

بابا جان اس نے میرے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا ہے۔مجھے لگ رہا ہے میں ہار گیا ہوں۔ایسی لادینی، اس نے تو اپنے نام کی حرمت کی بھی لاج نہیں رکھی۔

عبدالعلی کی آواز بھرا گئی تھی۔

"آزمائش میں خدا اپنے بندوں کو ہی مبتلا کرتا ہے۔بیٹے! خدا پر بھروسہ رکھو دعا کرو خدا سمیع الدعا ہے"

دادا کا حوصلہ اور ضبط کمال تھا۔عبدالعلی سرد آہ بھر کے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

ناراضی اور غصے کے اظہار کی خاطر وہ تب سے منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ثانیہ نے اندر داخل ہو کر اس کے خیمہ زن وجود کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس پر تنی چادر کھینچ لی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

دیا ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی

"ہاؤ امیزنگ! یہ تو بہت اعلیٰ طریقہ ہے تمہارے بات کرنے کا۔تمہارے اخلاق حسنہ کے اسباق کیا دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنے کے لیے ہی ہیں؟"

ثانیہ نے جواباً رکھائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طنز کا تیر چلایا تو دیا کے چہرے پر خفت پھیل گئی۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے غلط کیا؟ کسی کو چیٹ کرنا کیا غلط نہیں ہے؟"

وہ اسے شاپنگ کا کہہ کر ساتھ لے کر گئی تھیں۔اس کا غصہ اور خفگی بے جا نہیں تھی۔

اسے تو گمان تک نہ تھا وہ لوگ یہ پلان لے کر نکلی ہوں گی۔اس کا ساتھ تو محض وارڈن کو ڈاج دینے کو لیا تھا کہ وارڈن دیا پر بہت بھروسہ کرتی تھیں بلکہ وہ اس کی بہت عزت کرتی تھیں تو اس کی وجہ دیا کی وہ مذہبی اور محتاط روش تھی جس پر وہ اس نوجوانی میں بہت مضبوطی سے قائم تھی۔کتنے رشتے تھے اس کے چاچو، پھوپھیاں، ماموں، خالہ اور سب سے بڑھ کر باپ اور بھائی! مگر امی کے پاس صرف دادو تھیں جن کی محبت اور شفقت اسے نصیب ہو سکی تھی۔انہی کے زیر سایہ پرورش پانے کی بدولت وہ انہی کی ذات کا ایک عکس دکھائی دیا کرتی تھی۔عید، شب برأت یا کسی اور تہوار پر جب بھی وہ دادو کے ساتھ ددھیال جاتی وہاں اپنے نوجوان کزنز کے ساتھ ساتھ وہ چچیوں اور پھوپھیوں کے بھی مذاق کا نشانہ بن جایا کرتی۔تب وہ دادو کی گود میں سر رکھ کر اپنا دکھ رویا کرتی۔

"آپ یہاں کیوں آتی ہیں دادو؟ یہ لوگ مجھے اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔میرے کپڑے، میرا اٹھنا بیٹھنا بھی انہیں اچھا نہیں لگتا۔"

اور تب اولاد کی فیشن کی چاہ میں اپنے مذہب اور اقدار سے دوری جو خود دادو کو بھی افسردہ کیے رکھتی تھی وہ دیا کے سامنے خفگی کی صورت ظاہر ہوتی۔

"کرنے دے انہیں بکواس! میری بچی یہ مُہر زدہ عقل اور گمراہی میں پڑے لوگ ہیں۔انہیں کیا پتا کہ تمہارے اندر کیا ہے۔تو تو ہیرا ہے میری جان!"

وہ اسے لپٹا لیتیں اور دل جوئی کو پیشانی کو بار بار چوما کرتیں۔

"آپ یہاں مت آیا کریں۔" وہ اور کچھ سمجھتی یا نہیں یہ اصرار ضرور کیا کرتی۔

پتا نہیں پھر دادو نے اس کی بات پر عمل کیا یا خود ہی ان کی طرف سے مایوس ہو گئیں کہ ہر تہوار وہاں کا چکر لگانا چھوڑ کر صرف عید کے موقع پر وہاں جایا کرتیں۔ میٹرک کے بعد دیا انہیں چھوڑ کر ہوسٹل آنے پر راضی نہیں تھی مگر دادو اسے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتی تھیں جبھی اس معاملے میں اس کی ایک نہیں چلنے دی۔

''بھائی آپ ہی یہاں آ جائیں نا دادو کے پاس''

اس روز بھی مستقیم وہاں چند گھڑیوں کو مہمان ہوا تھا جب دیا نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے تئیں اسے احساس دلانا چاہا تھا۔ اور مستقیم نے جواباً اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ خجل سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں جیسے پتا نہیں کون سی غلط بات منہ سے نکال دی ہو۔

''تمہاری تیاری ہو گئی ہو تو چلیں؟''

چائے کا مگ خالی کر کے رکھتے ہوئے وہ اٹھنے کو پر تولنے لگا اور تب وہ سمجھی تھی کہ آج وہ گھر پر کیوں نظر آ رہا ہے۔ یقیناً دادو نے اسے یہ ذمہ داری سونپی تھی۔

''جی بھائی میں بس چادر لے لوں''

وہ اندر بھاگی تھی اور مستقیم رکشہ لے کر آیا تو دادو نے اسے گلے لگا کر اشک بار نظروں رخصت کیا تھا۔ تب انہوں نے بہت دلگیری سے کہا تھا۔

''دیا بیٹا بہت دل لگا کر پڑھنا اور خوب محنت کرنا اپنے بھائی کی طرح بوڑھی دادی کو بھول کر باہر کی رنگینیوں میں مت کھو جانا'' اور اس نے یہ بات اپنی گرہ سے باندھ لی تھی۔ دو سال ہونے کو آئے تھے اور وہ اس بات کو یاد رکھے ہوئے تھی تو وجہ دادی کی بات کی پاسداری ہی نہیں تھی خوفِ خدا بھی تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کمرے میں مسلسل ہونے والی اٹھا پٹخ اور کسی شوخ دھن پہ بجائی جانے والی سیٹی کی آواز پر کھلی تھی۔ ابو حذیفہ اس کا روم میٹ تھا جو یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا اور حسب عادت گنگنا رہا تھا۔ آج کل اس کا معاشقہ انگلینڈ کی سب سے حسین لڑکی لیزا سے چل رہا تھا اور وہ گویا خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا۔ ابنِ زید نے برا سا منہ بنایا اور کروٹ بدل کر منہ پر تکیہ رکھ لیا۔ ابو حذیفہ نے خود پر پرفیوم کی پھوار چھڑکتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور گنگناہٹ کے سلسلے کو روک دیا۔ پھر ذرا سا آگے بڑھ کر پہلے اس کا تکیہ کھینچا جس کو اس نے سر پہ رکھا تھا پھر کسی قدر سختی سے بولا تھا۔

''ابنِ زید اٹھ جاؤ، ایک تو میں تمہاری اتنی گہری نیند سے سخت عاجز ہوں''

''گہری نیند کہاں؟ تمہاری اس منحوس کھڑ پڑ سے کب کی ٹوٹ چکی''

جواباً وہ بدمزگی سے پھنکار کر بولا تو ابو حذیفہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

''میری تیاری کو منحوس نہ کہو۔ بہت خاص لڑکی کے لیے اہتمام کرتا ہوں۔ لنڈن کی سب سے حسین اور امیر لڑکی''

''اونہہ بندریا لگتی ہے مجھے تو''

ابنِ زید نے منہ بگاڑ لیا۔ ابو حذیفہ نے سرد آہ کھینچی۔

''یار وہ تجھ پر مرتی تھی۔ تیرے لفٹ نہ دینے پہ بڑی مشکل سے میں نے اسے پٹایا اب خدا کے لیے معاملہ بگاڑ نہ دینا''

''مجھے کیا ضرورت ہے؟''

ابنِ زید کے لہجے میں نخوت تھی۔ ابو حذیفہ کو قدرے اطمینان ہوا۔

''گڈ اب اٹھو جاؤ ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے''

''میں یونیورسٹی نہیں جا رہا''

''واٹ!!'' وہ زور سے چیخا!

''تمہیں پتا ہے وہ ضحیٰ کا؟ اتنے سوال کرے گی کہ عاجز کر دے گی''

''بھاڑ میں جائے وہ، میں تنگ آ گیا ہوں اس سے''

ابنِ زید کے نخوت زدہ انداز پر ابو حذیفہ نے رشک آلودہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''یار اک بات بتا؟ تو واقعی اتنا بے نیاز ہے یا بنتا ہے''

''شٹ اپ! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے بننے کی۔ میں نہیں جا رہا ہوں بس کہہ دیا نا''

اس نے رکھائی سے جواب دیا اور تولیہ اٹھا کر واش روم میں جا گھسا۔ نہا کر باہر نکلا تو ابو حذیفہ جا چکا تھا۔ اس نے سکون کا لمبا سانس بھرا اور ناشتے کے ارادے سے اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ ہاسٹل تقریباً سنسان تھا۔ اس کا دل قریبی ریستوران سے کافی پینے کو مچل گیا تو ہاسٹل کی عمارت سے نکل کر جب وہ قریبی ریستوران کی سمت جانے کے لیے سڑک پر آیا تو باہر کی خنک ہوا نے اس کا استقبال بہت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ رات بھر گرنے والی برف کی چادر تنی نظر آتی تھی۔ لنڈن شہر ابھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوا تھا جبھی خاموشی اور سناٹے کا ہر سُو راج تھا۔ اس نے ریستوران کے گرم ماحول میں بیٹھ کر کافی کے ساتھ دو سلائس لیے تھے اور اس مختصر سے ناشتے کے

ساتھ واپس آیا تو وارڈن کا پیغام اس کے لیے موجود تھا کہ فوری اس سے ملے وہ الٹے قدموں وارڈن کے آفس کی جانب چلا آیا تھا۔

''ینگ مین تمہاری طبیعت ٹھیک ہے، آج کالج نہیں گئے؟''

''یس میم! ایکچوئلی میں کچھ ریسٹ کرنا چاہ رہا تھا''

''او کے، عراق سے تمہاری کال تھی مگر تم تھے نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم کال بیک کرلو''

وارڈن کے پیغام نے اس کے اندر بے چینی بھر دی تھی۔ دل عجیب سے خدشات کے ہمراہ تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس کے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لاسٹ ٹائم جب ام جان کی کال آئی وہ ان کی وجہ سے پریشان محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب کھنگالی تو تین پاؤنڈ برآمد ہوئے تھے۔ وہ الٹے قدموں واپس ہوا تھا اور فون بوتھ پر جا کر سکہ حاصل کیا پھر عراق رابطہ کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

''ہیلو! اسلام وعلیکم! ام جان میں ابنِ زید ہوں۔ سب خیریت ہے نا؟ بابا جان ٹھیک ہیں نا؟'' رابطہ بحال ہوتے ہی اس نے بے صبری سے سوال کیا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہیں ابنِ زید مگر......''

ابنِ زید نے محسوس کیا تھا کہ ایکا ایکی ان کی آواز بھرا گئی ہے۔ اس کے اندر اضطراب یکلخت گہرا ہوگیا تھا۔

مگر کیا ام جان!''

''ابنِ زید بیٹا یہاں کے حالات ایک بار پھر بہت خراب ہو رہے ہیں۔ صدر صدام کے متعلق مختلف افواہیں اڑی پھرتی ہیں۔ لوگ ہراساں ہیں۔ ہر کوئی کہتا ہے مارشل لاء پھر لگ جائے گی۔ امریکہ ہم پر حملہ کرنے والا ہے''

بات پھر ادھوری چھوڑ کر وہ حوصلہ گنوا گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابنِ زید کے اعصاب شدید کشیدگی کا شکار ہو کر رہ گئے۔

''ام جان ضروری تو نہیں یہ سچ ہو۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاءاللہ!''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا!''

ابنِ زید بہت دیر تک انہیں تسلی دلاسہ دیتا رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے فون بوتھ کے شیشے کے کیبن سے نکال کر باہر آیا تو ابر آلود آسمان سے پہلی بوند نے لپک کر اس کے گال پر بوسہ دیا تھا

مگر وہ اتنا الجھا ہوا اور پریشان تھا کہ خدا کی اس رحمت کو محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو اچھی لڑکیو کیا احوال ہیں؟''

دیا اپنے بستر پر بیٹھی کورس کی کتاب گود میں رکھے پڑھنے میں مصروف تھی جب حیا نے دروازہ وا کر کے اندر سر ڈالا۔

''آجاؤ بھئی کیا تربوز جیسا سر اندر ڈال کر کھڑی ہو''

ثانیہ اپنے کپڑے تہہ لگا کر الماری میں رکھنے میں مصروف تھی یونہی مصروف رہ کر بولی۔

''میں تو دیا کے ہاتھ کی چائے پینے آئی ہوں۔ پلاؤ گی دیا؟''

حیا کا انداز خوشدلی اور دوستانہ رنگ لیے ہوئے تھا یہ گویا اسے منانے کا اقدام تھا۔ دیا اٹھی تھی مگر چائے بنانے کی خاطر الیکٹرک کیٹل تک جانے کی بجائے جا کر واش روم میں بند ہوگئی؟

''اوہ! اس کا مطلب مطلع ابھی تک ابر آلود ہے''

حیا نے کچھ تشویش زدہ انداز میں کہتے ثانیہ کو دیکھا جو کاندھے اچکانے کے بعد چیونگم چباتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی۔

''سنو بتایا اسے حسین شاہ کے فون کا؟''

حیا کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا۔ ثانیہ نے اسے باقاعدہ گھورا۔

''مجھے اپنا سر عزیز ہے''

''بہت عجیب لڑکی ہے۔ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا بر مل رہا ہے اور اس کے نخرے نہیں سنبھلتے۔ اس کی بجائے وہ بندہ مجھے لفٹ کراتا تو میں ہواؤں میں اڑتی۔''

حیا نے دیا کے بستر پر بیٹھتے ہوئے کسی قدر تلخی سے کہا تو ثانیہ بھی سلگ اٹھی تھی۔

مجھے پتا ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔

''ویسے یار یہ حسین شاہ تو بہت دل پھینک نکلا۔ واٹ از دس سو کالڈ محبت یا اٹریکشن؟''

ثانیہ کا انداز بے حد عجیب تھا حسد کی سلگن لیے ہوئے۔

''اسے کچھ مت کہنا''

حیا نے آنکھیں نکالیں۔

''اس کے باوجود کہ وہ تمہیں لفٹ دینے کی بجائے عزیزی دیا کے لیے مرا جا رہا ہے؟ کوئی ستر کالز اور ایک سو ساٹھ مسڈ کالز تو لازمی اس کی آچکی ہیں''

"ہاں اس کے باوجود بھی"

گو کہ ثانیہ کا انداز تاؤ دلانے والا تھا مگر حیا پر اثر نہیں ہوا تھا۔

"ویسے تم نے غلط نہیں کیا حیا اسے اپنا نمبر دے کر؟ یار ایسے لوگ تو گلے پڑ جاتے ہیں"

ثانیہ اچھی خاصی بددل ہو رہی تھی

"یہ بات نہیں ہے یارا۔ یہ بھی تو دیکھو دیا ہے بھی تو اس قابل کہ اگر کوئی اسے دیکھے تو پھر یونہی حواس کھو جائے"

حیا کی بات پر ثانیہ نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے کسی قدر اہم سوال کیا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اس کے لیے سیریس ہوگا؟"

"لگتا تو ہے۔ اب حقیقت کیا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے"

حیا نے کاندھے اچکا کر بات ختم کی تھی۔

☆☆☆

اب یہ توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
روز اک تازہ قصیدہ خوانی ہے نشیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے
دل کے معبود جبینوں کے خداؤں سے الگ!
ایسے عالم میں عبادت نہیں ہوگی ہم سے
اجرت عشق وفا ہے تو ہم ایسے مزدور
کچھ بھی کرلیں پر یہ محنت نہیں ہوگی ہم سے
ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

ایڈیٹر صاحب کی جھڑکیاں کھا کر وہ اتنا بددل ہوا کہ گھر جانے کی بجائے گرین لاج چلا آیا۔ سرسبز راستے فلک بوس پہاڑ اور درختوں کی قطاریں، گرین لاج کو تو جانے والا راستہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ مکینوں کے تو کیا ہی کہنے تھے۔ اس کے دل میں وہاں کے ہر مکین کے لیے محبت، احترام گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خنک ہوا میں شام ڈھلتے ہی برف کے اکا دکا ستارہ نما گالے شامل ہونے لگے تھے۔ شوریدہ سر ہوائیں اور [illegible] تن پر سردی سے بچاؤ کو صرف ایک

جیکٹ، جس کی لاتعداد جیبوں میں سے قلم کاغذوں کے چھوٹے موٹے ٹکڑے اور اخباری اہم خبروں کے تراشوں کے سوا شاید ہی کچھ برآمد ہو پاتا۔ اس نے بائیک گھاس کے خشک قطع کے سامنے بوڑھے برگد کی گھنیری چھایا میں کھڑی کردی تھی وجہ آسمان سے اترنے والی برف سے حفاظت کا خیال تھا گہرا سانس بھر کے جیکٹ کے کالر کھڑے کرتے ہوئے وہ پلٹ کر سرخ اینٹوں والے دو منزلہ مکان کی جانب بڑھ آیا جس کو پھول دار بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مکان کے آگے باغیچہ تھا جسے ہری باڑھ نے چہار اطراف سے احاطہ کر رکھا تھا۔ سکندر نے وہاں بیٹھ کر ابنِ زید کے ساتھ متعدد بار چائے اور کافی پیتے ہوئے دنیا جہان کے موضوعات پر گھنٹوں تبادلہ خیال کیا تھا۔ ابنِ زید کم گو تھے مگر سکندر کی چرب زبانی کے آگے ان کی کم گوئی ہار تسلیم کرلیا کرتی تھی۔ پھر جب وہ بولنے پہ آتے تو کھل کر بولتے تھے بلکہ دکھ پھولتے تھے۔ مکان کے چوبی منقش دروازے کی سائیڈ پر چھوٹا سا خوبصورت سا پوسٹ بکس لگا ہوا تھا۔ وہ بچپن میں سکندر کے لیے بہت اٹریکشن اور تجسس کا باعث ہوا کرتا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسوہ کے کمرے کی بالکونی کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور ٹیرس ویران پڑا تھا۔ اس سے سامنے کا خیال سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر بکھرنے لگا۔ دن بھر کی کسلمندی جیسے دور ہونے لگی۔ دروازہ ملازمہ نے کھولا تھا۔

"بی بی صاحبہ گھر پر موجود ہیں؟"

سکندر نے بے صبری سے سوال کیا تھا۔ ملازمہ جس کے چہرے پر خیر مقدمی مسکان تھی سر کو اثبات میں جنبش دینے لگی۔

"جی صاحب! چھوٹی بی بی بھی اور بڑی بی بی بھی ہیں"

گڈ! ایسا کرو کشمالہ بی بی بہترین کافی بنا کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

وہ آرڈر کرتا ہوا بی جان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ نماز کے تخت پر موجود تھیں۔ عصر کے بعد وظائف پڑھا کرتیں یہ سلسلہ مغرب تک چلا کرتا تھا۔ وہ انہیں سلام کرتا ہوا ان کے آگے جھکا۔ انہوں نے تپاک سے سر پہ ہاتھ پھیرا پیشانی چومی اور کچھ آیات پڑھ کر اس پر پھونک ماری تھی۔ سکندر کو لگا تھا محبت و شفقت کے اس مظاہرے نے اس کی ساری تھکن سمیٹ لی ہو۔

"میں ذرا ابنِ زید اور اسوہ خاتون سے مل لوں بی جان تب تک آپ بھی نماز پڑھ لیں گی"

وہ انہیں بتا کر پلٹا اور دروازے سے نکلتے ہی پہلا سامنا اسوہ سے ہو گیا تھا۔ ڈل گولڈن کلر کے بے حد نفیس جدید تراش خراش کے اسٹائلش سے سوٹ میں ملبوس میرون شال کاندھوں پر پھیلائے وہ اپنی تمام تر خوبصورتی، تمام تر دل کشی کے ساتھ اس کے روبرو تھی۔

''اسوہ خاتون ہاؤ آر یو؟''

وہ اسے دیکھتے ہی چہکا، لہجے میں آپ ہی آپ ترنگ اتر آئی تھی۔ اسوہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھی چونک کر مڑی اور اسے دیکھ کر گہرا سانس بھر کے خفیف سا مسکرا دی۔

''اوہ پور، جرنلسٹ!''

''ہاں پور، تو ہوں''

اس نے پہلی بار اعتراف کیا ورنہ وہ اس خطاب کو توہین سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس سے الجھ جایا کرتا تھا۔

اسوہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مان گئے نا آخر'' سکندر نے آہستگی سے سر جھٹکا۔

''میں نے سوچا ایک لڑکی کو ذرا سی خوشی دے دوں کیا حرج ہے''

اسوہ نے غصے سے اسے گھورا تو وہ ہنستا ہوا ابنِ زید کے کمرے کی جانب چلا آیا تھا۔

ابنِ زید ایزی چیئر پر جھولتے ہوئے سگریٹ کے گہرے کش لے رہے تھے۔ کمرا نیم تاریک تھا تو فضا دھویں سے بوجھل۔ سکندر نے آگے بڑھ کر پہلے لائٹ آن کی پھر کھڑکی سے پردہ ہٹا کر پٹ وا کر دیئے۔ ابنِ زید کے کمرے کی کھڑکی مکان کے پچھواڑے کھلتی تھی۔ درختوں کے بیچ گھری چوڑی نہر اور تارکول کی سڑک جس پر گرمیوں میں ہوا خشک پتے اڑایا کرتی تھی تو موسمِ سرما میں یہی سڑک برف کی سفید چادر اوڑھ لیا کرتی تھی۔ سکندر جب بھی ابنِ زید کے پاس آتا کچھ دیر کو کھڑکی کے پاس رک کر باہر کا منظر ضرور دیکھا کرتا۔ آسمان سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور کمرے کے اندر آتش دان میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز تھی اور دیواروں پر لپکتے شعلوں کے عکس تھے۔

''کیسے مزاج ہیں ابنِ زید؟ آپ کو تو شاید میرے آنے اور پھر واپس چلے جانے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا ہے نا؟''

یونہی کھڑکی کے پاس کھڑے باہر تکتے اس نے کسی ناراض بچے کی طرح سے منہ پھلا کر کہا تھا جواب میں ابنِ زید نے ایک طویل سرد آہ بھری اور سلگتا سگریٹ بجھائے بنا ایش ٹرے کی جانب اچھال دیا۔

''یہ سب احساسات تو دل کی خوشی کے تابع ہوا کرتے ہیں سکندر بابا! میرا دل تو کب کا خوشی محسوس کرنا چھوڑ چکا۔ مجھے خوشی منانے کا ڈھنگ بھول گیا ہے پلیز میری وجہ سے ڈس ہارٹ ہونا چھوڑ دو۔''

وہ بولے تو ان کا لہجہ بوجھل تھا بلکہ سکندر کو ان کا گلا بھرا ہوا محسوس ہوا تو چونک کر پلٹا۔ ابنِ زید سر جھکائے بیٹھے تھے۔ انداز میں اس قدر افسردگی اور دلگیری تھی گویا سب کچھ ہار بیٹھے ہوں سکندر تیزی سے ان کی جانب آیا اور گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں میں ابنِ زید کے ہاتھ تھام لیے۔

''سب خیریت؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟''

''تم جرنلسٹ ہونا سکندر بابا! تمہیں تو سب پتا ہونا چاہئے''

ابنِ زید کے شاکی انداز پہ سکندر خفیف سا ہو کر انہیں تکنے لگا۔ یقیناً کوئی تازہ روگ نیا المیہ تھا جو اس شخص کو زود رنج کرنے کا باعث بنا تھا۔

''فیس بک کے بعد یہاں ہمارے ملک میں بھی ناموس رسالت ﷺ پہ حرف آیا ہے۔ سکندر بابا ایک مسلمان نے اس جرم پہ سزا دینے کو کالا قانون کتنے دھڑلے سے کہہ ڈالا اور عوام خاموش ہیں۔ لوگ اتنے بے حس کیوں ہیں سکندر بابا! کوئی احتجاج بلند نہیں ہوا، کسی کی غیرت نہیں جاگی، ہم مصطفوی ﷺ ہو کر بھی کس غفلت اور گمراہی میں جا پڑے ہیں۔''

سکندر نے دیکھا۔ ابنِ زید کی آنکھیں باہر آسمان پہ چھا جانے والی لالی کی طرح سے ہی لہو رنگ تھیں اور کسی بھی پل برس جانے کو تیار۔ اس نے کسی ناقابل بیان اذیت سے گزرتے ہوئے ہونٹ بھینچ لئے۔

''میں نے اس موضوع پہ جو کالم لکھا تھا ایڈیٹر صاحب نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ کیسے سوئی ہوئی قوم کو جگائیں؟'' ''مذہبی جماعتوں اور کالج کے طلبا کے علاوہ چند صحافیوں نے بھی احتجاجی ریلی نکالی تھی ابنِ زید مگر پولیس کی شیلنگ و لاٹھی چارج اور گرفتاری کے سامنے یہ احتجاج بھی دم توڑ گیا''

سکندر نے جیسے صفائی پیش کی تھی مگر ابنِ زید کی شاکی نگاہوں کے سامنے خفت زدہ ہو کر نظریں چرا گیا

''وہ ہستی ﷺ جس نے ہماری خاطر ہر ظلم ہر جبر ماتھے پر شکن لائے بغیر سہا۔ کٹھن وقت برداشت کیا۔ ہر لمحہ ہر پل ہماری مغفرت، ہماری بخشش کی دعا مانگی۔ یہی ہے ہماری محبت اپنے نبی ﷺ کے لیے؟''

سکندر کے پاس جیسے اب صفائی دینے کو بھی الفاظ نہیں بچے تھے۔ مجرمانہ انداز میں وہ سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھا تھا جب دروازہ کھلا اور اسوہ ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے چلی آئی۔

''ابنِ زید آپ کی دوا کا ٹائم ہو گیا ہے'' اسوہ نے ٹرے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''مجھے نہیں کھانی یہ دوا''

ابنِ زید کا لہجہ ہنوز بھینچا ہوا تھا۔

''پلیز ابنِ زید پلیز!''

اسوہ نے پہلے چونک کر پھر سخت احتجاجی انداز میں کہا تھا۔ چائے بنانے کا کام ترک کیا اور ان دونوں کی سمت چلی آئی۔

''پلیز سکندر تم ہی سمجھاؤ نا انہیں''

اس نے سکندر کو بھی ہمنوا کرنا چاہا جو الجھن بھری نگاہوں سے کبھی ابنِ زید کبھی اسوہ کو تک رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟''

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ خواہ مخواہ کیوں دوائیں پھانکتا پھروں؟''

اس سے پہلے کہ اسوہ جواب دیتی ابنِ زید نے بے حد خفگی سے کہا تھا۔ اسوہ ٹھنڈا سانس بھر کے بے بس سی انہیں تکنے لگی۔ سکندر کی الجھن اپنی جگہ پر برقرار تھی۔ اسوہ اس وقت تک ابنِ زید کی منت کرتی رہی تھی جب تک ابنِ زید نے اس سے جان چھڑانے کو ابلے ہوئے انڈے کے ساتھ چائے کے چند گھونٹ لے کر دوا نہیں کھالی۔

''اب آرام کریں آپ! اور پلیز ریلیکس ہو جائیں''

اسوہ بالکل بچوں کی طرح سے ہی ان کا خاص خیال رکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھار تو سکندر کو ابنِ زید کی قسمت پہ باقاعدہ رشک آنے لگتا تھا۔ اس کا دل اکثر اسوہ کی اتنی توجہ اتنی اہمیت کو مچل جایا کرتا۔ اپنی سوچ پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا تھا۔ اسوہ نے اٹھتے ہوئے سکندر کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کرتی لائٹ آف کرنے کے بعد دروازے سے باہر نکل کر آئی تو اسے دیکھ کر بولی تھی۔

''احتجاجی ریلی میں شریک ہوئے تھے اور سب سے بڑی بات پولیس کے تشدد سے گھبرا کر بھاگے نہیں۔ نتیجتاً حوالات میں بند کر دیئے گئے۔ وہ تو دادو نے کونسلر صاحب کو کال کی تھی تب رہا ہوئے''

اسوہ کی بات نے سکندر کو ایک دم سے گم صم کر ڈالا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ میں کافی بنانے لگی ہوں تمہارے لیے''

اسے پلٹتے دیکھ کر اسوہ نے حیرانی سے پکارا تھا مگر وہ پلٹا نہیں۔

''پھر سہی۔ اب چلتا ہوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی''

اس نے آہستگی سے مگر بوجھل آواز میں کہا اور آگے بڑھتا باہر نکل آیا۔

کھلی فضا میں قدم رکھتے ہی سردی کی شدید لہر نے اس کے پورے وجود کو ٹھٹھرا کے رکھ دیا مگر اس کے احساسات منجمد سے تھے۔ برف باری اب باقاعدہ شروع ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف کی چادر نے ہر شے کے اصل رنگ کو چھپا کر سفید رنگ میں رنگ لیا تھا۔

(ابنِ زید ہمیشہ ہر مقام پر مجھ سے آگے نکل جاتے ہیں اور میں ہمیشہ ان سے پیچھے رہ جاتا ہوں)

بائیک کی سیٹ پر گری برف جھاڑ کر اس پر بیٹھتے ہوئے اس نے بہت دلگیری سے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس بار وہ روٹھا تو چپ بیٹھے رہے ہم بھی
اک بار منا لیتے تو ہر بار خفا ہوتا

دیا اپنی پیکنگ کر چکی تھی جب حیا نے اسے دیکھ کر چھیڑنے والے انداز میں شعر پڑھا۔

دیا کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آسکا تھا۔

''اب بس کرو یار، غصہ تھوک دو، معاف کرنا اجرِ عظیم ہے۔''

وہ بیگ کی زپ بند کر رہی تھی جب ثانیہ نے پیچھے سے آ کر اس کے گلے میں بازو حمائل کیے۔

دیا نے گہرا سانس کھینچا تھا اور اسے دیکھ کر جبراً ہی مسکرائی۔

''یو فیل سوری، او کے فائن! بٹ بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم!''

''اوہ تھینک گاڈ!''

ثانیہ نے سکھ کا سانس بھرا اور کانوں کو باقاعدہ ہاتھ لگائے۔

''ریئلی میرے تو بچوں کی بھی توبہ جو آئندہ کبھی......''

معاً دیا کی گھورتی نظروں کو دیکھتی وہ کھسیا کر ہنس پڑی پھر وضاحتی انداز کو اختیار کر کے بولی تھی۔

''کم آن یار کہاں رہتی ہو؟ یہ نیا دور ہے جو بہت فاسٹ جا رہا ہے''

''تو کیا اس فاسٹ دور میں شرم و حیا جیسے الفاظ بھی اپنی وقعت کھو چکے؟''

اسے واقعی ہی تاسف ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو مسلسل تبلیغ پر یقین رکھتے تھے اچھی بات کہنے اور بری سے ٹوکتے ہوئے اپنا فریضہ ادا کیے جاتے ہیں۔ ثانیہ ایک لمحے کو سہی خجل ضرور ہوگی۔

''اگین سوری! آئندہ اپنے بچوں کا نام تب ہی لوں گی جب وہ بیچارے اس دنیا میں تشریف لے آئیں گے'' اس نے مسکراہٹ دبائی تھی۔ پھر اسے سنجیدہ دیکھ کر خود بھی موضوع بدل دیا۔

''واپس کب آؤ گی؟''

پتا نہیں ابھی تو جا رہی ہوں۔ مجھے تو خوف ہے دادو کی طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو''

دیا نے چادر اوڑھتے ہوئے فکرمندی سے جواب دیا۔ اس کے جانے کا سن کر حیا اور ثنا بھی آگئی تھیں اور اسے رخصت کرنے گیٹ تک ساتھ چلی آئیں۔

''دیا تمہارا بھائی ہے یہ؟''

انہوں نے پہلی مرتبہ مستقیم کو دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھیں گویا!

''تمہاری طرح ہی ہے ظالم! بہت خوبصورت!''

ثانیہ نے سرگوشی کی۔ دیا نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا اور کچھ کہے بغیر گیٹ سے نکل کر مستقیم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ راستے بھر وہ مستقیم سے کرید کرید کر دادو کے متعلق سوال کرتی رہی اس کے ہر طرح کے اطمینان دلانے پہ بھی اس کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی مگر جب انہیں دیکھا، مل لیا اور صحیح سلامت پایا تب ذرا ریلیکس ہوئی تھی مگر اس اچانک بلاوے پر ضرور الجھ گئی۔

''دادو تو بالکل ٹھیک ہیں بھائی آپ پھر بھی مجھے لے آئے؟''

وہ کسی طرح بھی اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکی تو صحن میں چارپائی پہ لیٹے مستقیم کو جا پکڑا۔

''یہ تم مجھ سے نہیں دادو سے ہی پوچھو؟''

وہ یقیناً خود بھرا بیٹھا تھا۔ دیا اس کے چہرے کو ایک نظر دیکھتی واپس دادو کے پاس آگئی وہ وظائف پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ ان کی روٹین سے آگاہ تھی جانتی تھی دوران تسبیح کسی بات کا جواب نہیں دیں گی جبھی وہاں سے پلٹ کر کچن میں آگئی۔ رات کے کھانے میں اس نے دال چاول پکانے کا سوچا اور کام میں لگ گئی۔ ساتھ میں رائتے اور سلاد کا بھی اہتمام تھا۔ مستقیم کی وجہ سے وہ کھانے پہ اہتمام کر رہی تھی۔ میٹھے میں اس نے گاجر کا حلوہ بنانے کی تیاری بھی بہت عجلت میں کی تھی۔

''دروازہ بند کر لو دیا میں جا رہا ہوں''

وہ کش کی ہوئی گاجریں کڑاہی میں ڈال رہی تھی جب مستقیم دروازے پر آن کر رکا۔

خشک اور روکھا پھیکا سا لہجہ تھا وہ چونک کر پلٹی اور حیران رہ گئی۔

''مگر بھائی کھانا تو کھا لیں''

وہ جو اسے رات بھی روکنا چاہ رہی تھی کھانے کے لیے بھی کمزور سے لہجے میں اصرار کر سکی تو اس کی وجہ مستقیم کا سرد وسپاٹ اور پرایا سا انداز ہی تھا۔

''نہیں شکریہ! مجھے جانا ہے دیر ہو چکی ہے پہلے ہی''

کلائی پہ بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتا ہوا وہ اس اجنبی بیگانے پن سے بولا اور پلٹ کر مزید کچھ کہے سنے بغیر بیرونی دروازے کی جانب چلا گیا۔ دیا نے بے دلی سے دونوں چولہوں پر چڑھی پتیلیوں کو دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر بھیگتی آنکھوں سمیت اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس کا دل بے حد بوجھل ہوا جا رہا تھا یہ اس کا ماں جایا تھا۔ اس کے ہر درد سے بے نیاز کتنے فاصلوں پر محسوس ہوتا تھا ہمیشہ۔ بہن کے دل میں اپنے بڑے بھائی کے متعلق کیسی خواہشات پنپتی ہیں وہ شاید سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دادو کے پڑھائے صبر و استقامت اور ہر حال میں شکرگزاری کے تمام اسباق بھلائے وہ بھیگتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ کچھ کہنے کو اس کی سمت متوجہ ہوا تو اس کا چہرا دیکھ کر حیران ہونے لگا مستقیم کو اس کی آنکھوں کی نمی نے چونکا دیا تھا۔ ہ خاموش رہی بولنے کی اجازت ہی کہاں دے رہے تھے گلے میں پھنسے ہوئے آنسو۔

''اینی پرابلم دیا؟''

وہ چند قدم اس کے نزدیک آیا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا تھا۔ دیا بے اختیار اس کے کاندھے سے لگ گئی۔

''آپ ایک رات بھی ہمارے پاس نہیں رک سکتے ہیں بھائی؟''

وہ سسک اٹھی تھی مستقیم نے گہرا سانس کھینچا!

''اب اس طرح سے پریشان کرو گی مجھے! دیا تم تو بہت بہادر ہو گڑیا! اتنی چھوٹی باتوں پر رونے والی تو نہیں تھیں''

اسے بازو کے حلقے میں لیے نرمی سے سر تھپکتا وہ رسانیت سے سمجھانے لگا۔

''نہ تو میں بہت بہادر ہوں بھائی اور نہ ہی یہ چھوٹی سی بات ہے۔ ماں کو تو اللہ نے اپنے گھر بلا لیا تھا ان سے شکوہ نہیں مگر بابا، وہ کیوں ہمیں چھوڑ گئے کیا صرف اماں ہی ان کی محبت تھیں؟ ہم کچھ نہیں لگتے تھے ان کے؟ پھر آپ بھائی بتائیں میرا کیا قصور ہے کہ میں ہمیشہ محبت کو ترسوں''

وہ آج جیسے سارے ضبط گنوا کر بیٹھی تھی آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ مستقیم کچھ دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔

''اتنا حساس بنو گی دیا تو بہت سے مقامات پہ بہت پیچھے رہ جاؤ گی۔ جذباتی لوگ سب سے پہلے اپنا ہی نقصان کیا کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ جذباتیت اپنی ذات کے لیے نہیں ہونی چاہئے مثلاً اپنی قوم کے لیے اپنے لوگوں کے لیے......ہو تو......''

وہ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپکتا سمجھانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ دیا کچھ نہیں بولی۔ وہ بس اس سکون اور طمانیت کو محسوس کرنا چاہ رہی تھی جو مستقیم کی محبت اور توجہ کے باعث اس کے اندر سرائیت کر رہی تھی۔

''اگر میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا تو محنت نہیں کر سکوں گا اور محنت کے بغیر بڑا آدمی بننا ممکن نہیں ہے''

''کیسے بڑے آدمی بننا چاہتے ہیں آپ؟ جیسے چاچو، جیسے ہمارے بہت سے کزن ہیں؟''

وہ خفا خفا سی اسے دیکھنے لگی۔ مستقیم اس کی کیفیت پر مسکرایا تھا اور شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''آئی نو کہ تم انہیں پسند نہیں کرتیں مگر بے فکر رہو میں ویسا بڑا آدمی نہیں بننا چاہتا۔''

''تو آپ رات نہیں رکیں گے؟''

''فورس نہیں کرتے مجبوری ہے نا سویٹ سسٹر!''

''اور کھانا؟ میں نے اتنے شوق سے آپ کی وجہ سے اہتمام کیا ہے''

وہ پھر روہانسی ہونے لگی۔

''چلو وہ کھا لیتا ہوں۔ آؤ۔ دادو کو بھی بلا لاؤ''

مستقیم نے نرمی سے کہا اور پلٹ کر اندر چلا گیا۔ دیا اک نئے جوش کے ساتھ کچن کی سمت بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

اتنا تو میرے حال پہ احسان کیا کر
آنکھوں سے میرا درد پہچان لیا کر
کوئی ساتھ دے سفر میں بہت تھک گیا ہوں میں
کچھ پل ہوں تیرے ساتھ میری مان لیا کر

افسانے محبت کے ادھورے نہ چھوڑ تو
جرمِ وفا کا مجھ سے تو ہر بیان لیا کر
مدت ہوئی اس آس پہ بیٹھا ہوا ہوں میں
بھولے سے کبھی تو بھی میرا نام لیا کر
تو اپنی ذات سے وابستہ کر مجھے
ہو کر خفا نہ مجھ سے میری جان لیا کر

اطراف میں کتابیں بکھیرے وہ بہت مگن انداز میں اسائنمنٹ بنا رہا تھا جب ضحیٰ دھپ سے اس کے برابر آن کر بیٹھی اور باقاعدہ لہک لہک کر پوری غزل بالخصوص اسے سنائی تھی۔ ابن زید کا موڈ بے حد خراب ہو کر رہ گیا۔ اس نے زور سے فائل بند کی اور سر اٹھا کر سرد نظروں سے اسے دیکھا۔

''واٹس یور پرابلم''

کشادہ پیشانی پر ناگواری کی مخصوص شکن تھی جو اسے روبرو پاتے ہی ابھر آیا کرتی مگر وہ بہت مستقل مزاج تھی مجال ہے جو برا مانے یا بددل ہو۔

''محبت سے بڑھ کر بھی کوئی پرابلم ہو سکتی ہے بھلا؟''

جواباً وہ دل سے مسکرائی اور بظاہر منہ بسور لیا۔

''یہ میرا سر درد نہیں ہے''

ابنِ زید کی برہمی بڑھی اور وہ حظ لے کر ہنسنے لگی۔

میرا تو ہے نا اور تمہاری وجہ سے ہے مسٹر اپالو''

اس کے انداز میں ایک شوخی تھی کھنک تھی جو ابنِ زید کو ایک آنکھ بھی نہیں بھائی۔

''میں نے سنا تھا پاکستانی لڑکیاں بہت شائی ہوتی ہیں''

اس کے لہجے میں واضح تاسف در آیا تھا۔ مگر وہ ان باریکیوں پر غور کرنے والی ہی کہاں تھی۔

''ہوتی ہوں گی''

ضحیٰ نے لاپرواہی سے کاندھے جھٹکے تھے۔

''تم کیوں ہنسی ہو آخر؟''

وہ جیسے بری طرح سے زچ ہوا تھا۔ بس نہ چل رہا تھا اسے اٹھا کر وہاں سے کہیں دور پٹخ آئے۔

"پاکستانی جو نہیں ہوں"

ضحیٰ کے جواب نے ابنِ زید کو شاکڈ کر دیا تھا۔

"واٹ؟ تم پاکستانی نہیں ہو؟ مگر اس دن تو تم بتا رہی تھیں کہ تم کشمیری ہو"

"ہاں تو کشمیری پاکستانی کدھر سے ہو گئے؟"

وہ نخوت سے بولی اور ابنِ زید نے زور سے سر جھٹک دیا تھا۔

"نان سنس؟ پاکستان کا ہی حصہ ہے کشمیر بھی، یو نو میری ام جان بھی کشمیر سے ہیں مگر ہیں تقریباً پاکستانی"

"خواہ مخواہ پاکستان کا حصہ ہے کشمیر، پاکستان نے کشمیر کے لیے بھلا کیا کیا ہے آج تک؟ اتنے سالوں سے وہاں لوگ جبر اور ظلم سہہ رہے ہیں۔ پاکستان نے کب اور کس انداز میں مدد کی ان کی؟ جنگ بندی کرائی؟ علاقے سے بھارتی فوج کا تسلط ختم کرنے کو ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان سے جہاد کیا یا پھر کشمیری عوام کا کسی مرحلے پہ ساتھ دے کر یہ جتلایا کہ کشمیری بھی پاکستان کا ہی حصہ ہیں۔ انشاءاللہ دیکھنا تم جب ہم آزاد ہوئے اپنی الگ ریاست قائم کریں گے"

وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔ ابنِ زید کے ساتھ اس نے پہلی بار اس قدر تلخی سے بات کی تھی۔ خود ابنِ زید گنگ ہو کر رہ گیا تھا اس کے خیالات جان کو کہ یہ ساری باتیں کچھ اتنی بے جا بھی نہیں تھیں مگر اتنا بغض اتنی نفرت......"

"سوری تم نے شاید میری بات کو مائنڈ کیا"

اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ضحیٰ کو خود احساس ہوا تو نرمی سے بولی تھی۔ ابنِ زید نے کچھ کہے بغیر سر اونچا کر کے اسے دیکھا پھر آہستگی اور رسانیت سے گویا ہوا تھا۔

"کسی بھی قوم کا زوال تب شروع ہوتا ہے جب وہ خود کو صرف مسلمان سمجھنے کی بجائے فلسطینی، مصری، عربی یا پاکستانی سمجھنا شروع کر دے۔ اگر اس دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والا یہودی یا انگریز کا فائدہ دوسرے یہودی یا انگریز کا ہو سکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی بھی مسلمان کا نقصان میرا اور تمہارا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔ حدیث مبارک ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جسم کے ایک عضو کو اگر تکلیف ہو تو پورا وجود اس کو محسوس کر کے بے چین ہو جاتا ہے۔ تو ضحیٰ ڈیئر اگر دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمان تکلیف میں ہیں تو وہ ہماری بھی تکلیف کا باعث ہونا چاہیے۔ اپنے اپنے دکھ پر ہی اگر ہمیں پریشانی محسوس ہوتی ہے تو ہمیں یہ زیب نہیں دیتا"

"ہاں بالکل مگر یہ بات تم پاکستانیوں کو سمجھاؤ نا۔ جو آزاد ہیں۔ خوش باش اور مگن ہیں۔

جنہوں نے ہم سے منہ پھیر لیا ہے۔

"تم سے منہ پھیر لیا ہے۔ تم تو خود کشمیر سے منہ پھیر کر یہاں عیش کی زندگی جی رہی ہو۔ یہ کیسی محبت ہے ضحیٰ اور کیسا وفاداری کا احساس؟"

وہ بھڑکی تو ابنِ زید کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ ضحیٰ کچھ دیر خاموش مگر سلگتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ہنکارا بھر کے بولی تھی۔

"تمہاری ام جان کا تعلق کون سے کشمیر سے ہے۔ آزاد یا جموں؟"

"آزاد کشمیر سے"

"جبھی وہ پھر پاکستان کے گن گاتی ہیں"

وہ کاٹ دار طنز سے بولی پھر اسے دیکھ کر کچھ اور بھی تلخ ہونے لگی تھی۔

"ویسے تم تو عراقی ہو نا؟ تمہارے بابا جو عراقی ہیں"

"عراق میرا وطن ہے اور تمام مسلمان میرے بھائی! میں اپنے جذبات و احساسات کو پابند کرنے کا قائل نہیں ہوں"

"اب خدارا مجھے اپنی بہن مت بنا لینا"

وہ باقاعدہ خوف زدہ ہو کر بولی ابنِ زید پہلے جھینپا پھر اسے گھورنے لگا۔ ضحیٰ ہنسے جا رہی تھی۔

☆☆☆

غروب ہوتے سورج کی نارنجی کرنوں نے الوداعی نگاہوں سے سیڑھیوں پر بیٹھی اس سنہری رنگت اور ملکوتی نقوش کی لڑکی کی یاسیت کو دیکھا اور دیوار سے اچک کر منڈیروں پر بسیرا کر لیا۔ دن بھر کے رزق کی تلاش میں نکلے پنچھی پکھیرو واپس اپنے آشیانوں کی سمت لوٹ رہے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں دیا کو یہ وقت ہمیشہ گہری یاسیت میں مبتلا کرتا رہا تھا۔ عصر کے بعد سے اس نے کچن سنبھالا ہوا تھا۔ کڑھی کی خوشبو پورے گھر کی فضا میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے کچن میں آ کر خوشبودار قصوری میتھی کڑھی کے پتیلی میں ڈالی پھر ریک سے باؤل اٹھا کر اس میں کڑھی ڈالنے کے بعد باؤل ٹرے میں رکھا اور ڈھک کر ٹرے اٹھائے باہر آ گئی۔ عین اسی پل دیوار پر سے روبی کا سر نمودار ہوا تھا۔

"اے دیا کی بچی اکیلی اکیلی کڑھی ہڑپ کر گئی ہو کیا؟"

ناک سکیڑ کر خوشبو اندر اتارتے ہوئے وہ چہک کر بولی تھی۔ دیا اس کے ندیدے پن پر

مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''میں لا رہی تھی''

اس نے اسٹول اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھا اور احتیاط سے اس پر پاؤں جما کر ٹرے روبی کے حوالے کی، جسے روبی نے بڑی بے صبری سے تھاما تھا۔

''شکریہ جزاک اللہ! کچھ پتا چلا دادو نے کیوں بلوایا ہے تمہیں؟''

روبی نے باؤل سے چھلک جانے والی کڑھی کو انگلی سے لگا کر چاٹا اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں، مجھے تو کچھ نہیں بتایا''

دیا نے اسٹول سے اتر کر واپس اسے اس کی جگہ پر رکھ کر کہا تھا۔

''اچھا میں ابھی پیٹ بھر لوں۔ ساری ترکوں کی فوج فی الحال ٹیوشن پڑھنے گئی ہے اگر ان کی آمد پر کھانے بیٹھی تو ڈاڑھ بھی گیلی نہیں ہوگی''

روبی نے چھوٹے بہن بھائیوں کا ذکر کیا تھا اور دوسری جانب غائب ہوگئی۔ دیا ایک بار پھر لایعنی سوچوں میں گم ہونے کو اکیلی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''واٹ از دس؟''

اس کا کالم جو اس کی رات بھر کی جگارتا اور اضطراب کے نتیجے کا حاصل تھا ایڈیٹر صاحب نے پڑھا اور بھڑک دار انداز میں کاغذوں کا پلندہ اس کے سامنے پٹخ دیا۔ وہ جو کرسی کی بیک سے سر ٹیکے بے نیازی سے جھول رہا تھا ایک دم تھم گیا اور بہت احترام بھرے انداز میں اس کاغذی پلندے کو سمیٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔ سبکی کے علاوہ کسی اور احساس نے بھی اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

''تمہیں یہ جاب کرنی ہے سکندر کہ نہیں؟''

ان کے اگلے سوال نے اسے آگ لگا دی مگر وہ ضبط کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''آئی تھینک سر! یہ میرا کالم اسی بات کی علامت ہے غالباً''

اس کے لہجے میں ہزار ہا ضبط کے باوجود بھی کاٹ دار طنز سمٹ آیا۔ ایڈیٹر صاحب بھڑک اٹھے تھے۔

''شٹ اپ! یہ کالم نہیں ہے۔ یہ سیدھا سیدھا اخبار بند کرانے کا دعوت نامہ ہے''

''سر یہ محترم ممتاز قادری کو پیش کیا گیا خراج تحسین ہے اور ان زندہ دل لوگوں کا پیغام جو جینا جانتے ہیں کہ محترم ممتاز قادری کی باعزت رہائی......''

''یہ تم بھی جانتے ہو سکندر کہ حکومت اس بات کے کتنا سخت خلاف ہے''

''سو واٹ سر! حکومت کا کیا ہے وہ تو ہر اچھی اور حق بات کی مخالف بن چکی ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے یا پھر آزمائش کہ ہم پر بے ضمیر، لادین اور لٹیرے حکمران مسلط کر دیئے گئے ہیں''

وہ حسبِ عادت منٹوں میں جذباتی ہوا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے جواباً کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو میاں! میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے اپنا دھندا چلانا ہے۔ شام کو اخبار پریس میں جا رہا ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر دوسرا کالم چاہیے''۔

انہوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا تو سکندر کرسی گھسیٹتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''سوری سر اگر آپ میرا یہ کالم نہیں شائع کر سکتے تو پھر آج کا اخبار میرے کالم کے بغیر ہی شائع ہونے دیں''

ایڈیٹر صاحب کا غصیلا چہرہ دیکھے بنا ہی وہ پلٹ کر ان کے آفس سے نکل آیا تو اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر زائرہ نے ایک ہمدردانہ نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

''میں نے کہا بھی تھا یہ کالم نہیں لگے گا مگر تم سنو بھی تو......''

''اس دن حقوق نسواں کانفرنس سے واپسی پر آ کر جو رپورٹ تم نے تیار کی تھی جب وہ نہیں شائع ہو سکی تو پھر یہ تو اور بھی نازک موضوع تھا''

''لوگ ان حقیقتوں سے آگاہ ہوں کیا یہ ذمہ داری نہیں ہے ہماری!؟''

اس نے غصہ بھری نگاہ ان سب پر ڈالی۔

''وہ سب جھوٹ تھا۔ ڈرامہ تھا محض ایک ڈھکوسلہ۔ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ پاکستان ہم نے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی عورتوں کی کسی بھی حادثے میں یا جبراً نیلام ہو جانے والی عزت کے اشتہار لگاتے پھریں اور اس ذریعے سے سستی شہرت حاصل کریں۔ اقوام متحدہ سے انصاف مانگنے، ہمدردی حاصل کرنے کے چکر میں ان کی کسی ہوئی پھبتیاں سنیں؟ ہمارے تو ابھی اور المیے ہی ختم نہیں ہوتے یہ نیا المیہ......اس کی گنجائش کہاں سے نکلے گی''

وہ حسب سابق پھٹ پڑا تھا۔ ان سب کا خیال تھا وہ ضرورت سے زیادہ جذباتی اور حساس تھا اور ایسے لوگ آج کے دور میں احمق کہلاتے ہیں۔ مگر اس وقت وہ یہی چاہتے تھے اس

کے اندر کا غبار نکل جائے تا کہ وہ کچھ تو پر سکون ہو مگر وہ پر سکون ہی تو نہیں ہوتا تھا۔ یہی تو مسئلہ تھا اس کا، جب بھی بھڑکتا سلگتا پھر اگلے کئی دنوں تک جذبات کی بکل مارے رکھتا تب تک کوئی نئی بات اسے دہکا کر انگارہ کرنے کو موجود ہوتی۔

''چھوڑ پیارے کیوں جان جلاتا ہے۔ تصویر کا ہمیشہ ایک ہی پہلو مت رکھا کر نظروں میں، اگر خامیاں ہیں یہاں تو خوبیاں بھی تو جڑی ہیں۔ تو پاکستان کی توصیف میں ایک کالم لکھ۔ اس وقت جو حالات ہیں اس کی ضرورت بھی بہت محسوس ہوتی ہے''

ساجد بخاری نے گویا اسے ریلیکس کرنا چاہا مگر وہ مزید تلخ ہونے لگا تھا۔

''توصیف کروں۔ مثلاً کیا؟''

توصیف بخاری اس کے طنز کو صاف پی گیا اور مسکرا کر وضاحت بھرے انداز میں کہنے لگا۔

''مثلاً یہ کہ یہ وہ پاکستان ہے جس نے افغانستان کی سرزمین پر ایک سپر پاور کو شکست دی اور دوسری سپر پاور شکست کے قریب ہے''

''یہ وہ پاکستان ہے جس کے خلاف اسرائیل انڈیا اور امریکہ نے اتحاد کر لیا ہے لیکن اس کو توڑنے میں ناکام ہیں''

''یہ وہ پاکستان ہے جس نے عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے ایف سکسٹین گرادیئے۔ جبکہ سارے عرب اسرائیل کے آگے گھٹنے ٹیک چکے تھے۔''

''یہ وہ پاکستان ہے جب 1999ء میں سری لنکا کی 60,000 آرمی انڈیا کے Trainded Tamil Tigers کے محاصرے میں تھی تو پوری دنیا میں صرف پاکستانی آرمی نے آگ اور خون کے میدان میں اتر کر سری لنکن آرمی کو بچایا۔'' میری جان پاکستان واحد ملک ہے جس نے تریسٹھ سال کی عمر میں آٹھ جنگیں لڑی ہیں۔

(1) تقسیم کے وقت
(2) 1965ء
(3) 1971ء
(4) Rassian War
(5) کارگل، موجودہ جنگ، اس کے باوجود ہم نہ صرف زندہ بلکہ ایٹمی پاور بھی ہیں۔

ساجد بخاری کے لہجے میں ایک جوش سمٹ آیا تھا تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے۔
سکندر کے ہونٹوں پر ایک تھکی ماندہ افسردہ مسکان بکھر گئی تھی۔

''آپ کی باتیں بجا ہیں ساجد بخاری! مگر ان سارے کارناموں میں اگر تم غور کرو تو جرأت، بہادری اور دلیری کے مظاہرے ہماری پاک افواج کے سوا کسی حکمران کے دکھائے ہوئے نہیں ہیں۔ کارگل کی جیتی ہوئی جنگ شرمندگی و پچھتاوے اور ندامت کے ساتھ ختم کرنے کی وجہ جانتے ہو کیا تھی؟ نواز شریف کا سر جھکا دینے والا سرینڈر محترم تب وزیر اعظم تھے اور ملک کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ جبھی کہتا ہوں نار ہنے دو زخموں سے ابھی خون رستا ہے انہیں مت کریدو''

وہ دلگیری سے بولا پھر اسی یاسیت بھرے انداز میں آنکھیں بند کر کے خود کلامی کے انداز میں گنگنانے لگا۔

عجب رشتہ ہے یہ ترکِ مطلب کا
کہ جو اب تک رویوں کی ٹھٹھرتی
برف چادر میں اپنا منہ چھپائے
اپنے ہونے کی لڑائی لڑ رہا ہے
اور ایسے بے درد دیوارِ زنداں میں مقید ہے
جہاں معصوم روحیں فکرِ فردا سے ہراساں ہیں
جہاں پر خواب کی رنگین فضائیں بن نہیں سکتیں
جہاں سچائیں بھی اپنے بچے جن نہیں سکتیں
جہاں پر روشنی کے دائرے آزار ہوتے ہیں
جہاں پر حرفِ تسلی بھی یونہی بے کار لگتا ہے
جہاں پر زعم و تکبر عجز سے دامن چھڑاتے ہیں
دعاؤں کے پرندے راستوں سے لوٹ جاتے ہیں
جہاں پر تتلیوں کے پر بھی رنگوں سے مکر جائیں
جہاں پر سارے گیت فاختاؤں کے بکھر جائیں
یہی وہ عالمِ حیرت ہے دشتِ بدگمانی ہے
جہاں دل کی حویلی میں وفا برباد رہتی ہے
یقیں کے باب میں ساری فضا ناشاد رہتی ہے
یہاں ذہنوں پر کوئی خوش خیالی چھا نہیں سکتی
محبت بن کے اس در پر سوالی آ نہیں سکتی

سکندر کی آواز آخر میں بھرانے لگی تو ایک جھٹکے سے کرسی دھکیل کر اٹھا اور سرعت سے پلٹ کر باہر نکلتا چلا گیا۔ اخبار کے دفتر میں ایک گہری جامد خاموشی در آئی جس میں تکلف دہ افسردگی کا رنگ بے حد گہرا تھا۔

☆☆☆

''جس کے باپ نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اس کی بیٹی کو بھلا کون اپنائے گا۔ صرف ڈرافٹ بھجوانے سے فرائض کی ادائیگی پوری نہیں ہو جاتی''

وہ دادو سے کھانے کا پوچھنے آئی تھی اندر سے آتی ان کی آواز پر دروازے کے باہر ہی ٹھٹھک گئی۔

دادو وہ واحد ہستی تھیں جن کی زبان سے اس نے ایسا شکوہ کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ تو حوصلے کی مضبوط چٹان تھیں پھر آج ایسا کیا ہوا کہ وہ یوں ڈھے رہی تھیں۔

''بھلا کیا کمی ہے میری بچی میں! مگر اپنے کیا قریب کریں گے الٹا اس پر پھبتیاں کستے ہیں کیا مذہب سے قریب ہونا اور سادگی سے زندگی گزارنا آج کے دور میں اتنا ہی دشوار ہے۔ کتنے رشتے آئے مگر اس ایک معمولی وجہ کو بنیاد بنا کر بات آگے نہیں بڑھ سکی کوئی اتنی مذہبی لڑکی کو پسند ہی نہیں کرتا اس کے باوجود بھی کہ وہ بہت خوبصورت ہے پڑھی لکھی ہے۔ کیسے کہہ دوں میں اس سے کہ خود کو بدل لے کیسے؟ جبکہ میں نے خود ہی اس کی اس انداز میں پرورش کی تھی۔ ارے کوئی پوچھے ان ظالم لوگوں سے کیا سر پر دوپٹہ اوڑھنا جرم ہے؟ یا چادر سے خود کو ڈھانپ کر باہر نکلنا، بال نہ کٹوانا اور دیگر فیشن نہ اپنانا کیا اتنا ہی جرم ہے کہ لوگ اسے مولون اور ملانی کہہ کر ٹھکرا کر چلے جائیں۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا ایسے لوگوں کو یہاں نہ لایا کرو''

وہ رشتہ کرانے والی ماسی کے آگے پھٹ پڑی تھیں۔ پوری بات کیا تھی یہ تو دیا بھی نہیں جانتی تھی البتہ مزید کچھ سنے بغیر وہیں سے پلٹ کر کچن میں آ گئی۔ اس کے اندر عجیب سا سناٹا اتر آیا تھا۔ عجیب سی ویرانی، کیا وہ وقت نزدیک تھا جب محض اس کی قسمت بدلنے کی خاطر دادو اسے خود کو بدلنے کا مشورہ دے دیتیں؟

اس نے سوچا اور جیسے اندر سے لرز گئی۔

کیا دادو کے ایمان کی آزمائش ہونے والی ہے اور پھر میرے بھی؟''

خدایا ایسے کٹھن وقت سے بچالینا۔

''دیا...... دیا!!''

روبی دیوار کے پار سے مسلسل اسے پکار رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور گہرا سانس بھر کے کچن سے نکلی۔

''تیار ہو جاؤ۔ ذرا میرے ساتھ بازار چلنا''

روبی نے اسے دیکھتے ہی اپنا مقصد بیان کیا تھا۔

''مگر دادو......''

وہ تذبذب سی بولی۔

''پوچھ لو یار ان سے ورنہ میں خود لے لیتی ہوں اجازت''

روبی نے کہا تھا پھر اس کی سنے بغیر غائب ہو گئی۔ دیا وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اتنی دکھی ہو رہی تھی کہ فی الفور وہاں سے کہیں بھاگ جانے کی متمنی تھی۔ وہ زندگی میں بہت کم اپنی قسمت اور حالات پہ شاکی ہوا کرتی تھی مگر اس پل اس کے اندر بلا کی مزاحمت اور کرب مچل اٹھا تھا۔ روبی پندرہ منٹ بعد آئی تو اسے یونہی کھڑے پا کر حیران رہ گئی تھی۔

''کیا ہو گیا یار، طبیعت ٹھیک ہے؟''

وہ چونکی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں خود کو سنبھال لیا۔ اپنا درد کسی پہ عیاں نہ کرنا اس کا ہمیشہ سے اصول تھا۔ سوائے رب کے کسی اور کے آگے عیاں ہونے کی وہ کبھی قائل نہیں رہی تھی۔

''تم دادو سے پوچھو میں تیار ہو جاؤں''

وہ اپنے کمرے کی جانب چلی گئی چادر میں خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ کر باہر آئی تو ماسی غالباً جا چکی تھیں اب دادو صحن میں روبی کے ساتھ کھڑی باتیں کرتی یقیناً اسی کی منتظر تھیں۔

''اجازت کی کیا ضرورت بیٹا! چلی جاؤ۔ اپنے لیے بھی کچھ لے آنا، موسم کے مطابق کپڑے جوتے''

انہوں نے اس کی مٹھی میں ہزار ہزار کے دو نوٹ تھما دیئے۔

''اس سے نگاہیں چار کیے بنا وہ آہستگی سے بولیں۔ دیا جانتی تھی وہ اس سے نگاہیں کیوں چرا رہی ہیں۔ اس سے قبل ماسی کی جتنی بار بھی آمد ہوتی تھی ان کے نظریں چرانے کا سبب وہ کبھی نہیں جان پائی تھی مگر اب...... اس کے اندر انوکھی تھکن بسیرا کرنے لگی۔

''آج سردی کتنی ہے نا؟ واپسی پر رکشے میں چلیں گے۔ میں آئسکریم کھانے کو الگ سے پیسے لائی تھی مگر لگتا ہے اپنی ہی قلفی جم جائے گی''

روبی کڑھائی کے لیے دھاگے، موتی اور جانے کیا الم غلم خریدتے ہوئے مسلسل بولے

جا رہی تھی اور وہ اسی قدر خاموش، لب بستہ اور گم صم تھی۔

"تمہیں کچھ نہیں لینا کیا؟"

آڈیو کیسٹ کی بڑی سی دوکان کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گھستے ہوئے روبی کو اس کا بھی خیال آ ہی گیا تھا۔

"مجھے بک شاپ جانا ہے"

معاً اسے اخبار کا خیال آ گیا۔ محب عبدالقدوس اور سکندر حیات کے آرٹیکل اور کالمز اسے ہمیشہ بہت پسند آتے تھے اور اگلے پچھلے سارے اخبار ایک بار ہی خرید کر پڑھا کرتی تھی۔

"ہاں بھئی تم ٹھہریں ایجوکیٹڈ لڑکی! ہماری طرح تھوڑی ہو دو چار گانے سن کر خوش ہو جاؤ"

روبی نے مسکرا کر اسے چھیڑا تھا مگر وہ اس وقت گویا وہاں موجود ہو کر بھی موجود نہیں تھی۔ بغیر کوئی تاثر دیئے اسے کیسٹ پسند کرتے دیکھتی رہی۔

"مائی گاڈ! حسین شاہ! فضا یہ دیکھو یہ شاہ حسین کا کس قدر چارمنگ پوز ہے۔ ہو بہو ہالی وڈ کے ہیرو کی طرح"

بھرپور، جوشیلا لہجہ خوشی کے احساس سمیت بھینچا ہوا تھا۔ روبی بے اختیار پلٹی۔ آدھے بال کیچر میں اونچی پونی ٹیل کی صورت جکڑے تھے تو آدھے لٹوں کی صورت چہرے و گردن کے گرد بکھرے ہوئے، کندنی دمکتے حسین مکھڑے کو کچھ اور بھی حسین بنا کر دکھا رہے تھے۔ سنہرے براؤن بال اور سنہری ہی آنکھیں و نفاست سے کیا گیا میک اپ، سلیولیس ٹاپ اور تنگ جینز جس کے پائنچوں پر فرل لگی ہوئی تھی وہ ہر لحاظ سے جیتی جاگتی ایک قیامت تھی تو انداز انتہائی بے باکی لیے ہوئے۔ روبی نے اسے دیوانہ وار حسین شاہ کی کیسٹ کے کور پر تصویر کو چومتے دیکھا تو مسکراہٹ دباتے ہوئے کہنی مار کر دیا کی توجہ بھی اس سمت مبذول کرائی تھی۔

"بس ایک بار یہ بندہ مل جائے مجھے، رئیلی پتا نہیں کیا کر ڈالوں میں اس کے ساتھ"

وہ اب کیسٹ کو خوب چومنے کے بعد سینے سے لگا کر فرط مسرت سے کھلکھلاتی ہوئی بولی تھی۔ دیا کی تو آنکھیں صحیح معنوں میں پھٹی رہ گئیں وہ ساکن منجمد کھڑی رہ گئی تھی۔ روبی کے ٹہوکے نے ہی اس کا یہ سکتہ توڑا تھا۔ دیا کی نگاہ روبی کے متبسم شوخ چہرے پہ اٹھی تو جلتے ہوئے چہرے کے ساتھ نگاہ کا زاویہ فی الفور بدل ڈالا۔

"چھی چھی! مانا بھئی شاہ حسین گڈ لکنگ ہے، ہینڈسم ہے، چارمنگ بھی ہے اور اس کے ساتھ ہمیں بہت پسند بھی مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز بھی نہیں کہ اس کے فوٹو کے ساتھ اتنی نازیبا

حرکتیں کی جائیں"

روبی مسکراہٹ دبائے گویا اسے کچھ بولنے پر اکسا رہی تھی مگر وہ یونہی لب بستہ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس سے ملتے جلتے مظاہرے پہلے دیکھ چکی تھی۔

"تم کچھ بولو گی نہیں؟"

روبی کو اس کی خاموشی پر خفقان ہونے لگا تھا۔

"بابا فصیحت کو میں کیا بولوں؟"

دیا نے اس کے ہاتھ میں موجود کیسٹ پر زہر خند نگاہ ڈال کر تاسف سے جواب دیا تو روبی نے جھلس کر اسے دیکھا تھا پھر ہاتھ میں پکڑی شاہ حسین کی تصویر والی کیسٹ کو۔

"تم مجھے اس لڑکی سے ملا رہی ہو؟ حالانکہ خدا گواہ ہے میں نے ایک بھی نازیبا حرکت نہیں کی ہینڈسم اینڈ کیوٹ شاہ حسین کی تصویر کے ساتھ"

اس کا لہجہ ابھی بھی پوری طرح سے سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سدھرنے والی کہاں تھی۔ دیا ٹھنڈا سانس بھر کے آگے بڑھ گئی۔ اب اس کا رخ بک شاپ کی سمت تھا۔

باب 2

الجھا رہی ہے مجھ کو یہی کشمکش مسلسل
وہ آ بسا ہے مجھ میں کہ میں اس میں کھو گیا ہوں

کنٹین میں بیٹھا وہ سامنے منگولیا کے درخت پر کھلے سرخ پھولوں کو دیکھتا ہوا کافی کے سپ لے رہا تھا جب ضحیٰ نے عین اس کے برابر آ کر چیئر سنبھالی۔ ابنِ زید اپنے کسی خیال سے چونک کر متوجہ ہوا اور اسے روبرو پا کے گہرا ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

''کل میرا برتھ ڈے ہے تم ضرور آ رہے ہو ابن زید''

اس نے ایک چمکتا ہوا سرخ کارڈ اس کے سامنے رکھا جس پر سونے جیسے حروف جگمگاتے تھے۔ اس کے لہجے میں جو دھونس تھی وہی ابنِ زید کو سخت ناپسند تھی۔

''میں برتھ ڈے سیلیبریشن کے سخت خلاف ہوں اور......''

''اگر تم نہ آئے ابنِ زید تو میں کیک نہیں کاٹوں گی اور تم جانتے ہو کہ میں کتنی ضدی ہوں''

ضحیٰ نے پہلے چائے آرڈر کی تھی پھر دھمکانے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

ابن زید نے کافی کے مگ کی سطح پہ تیرتی کریم کی تہہ کو دیکھا پھر اس کے چہرے پر سرسری نگاہ ڈال کر کاندھے اچکا دیئے تھے۔

''تو نہ کاٹنا یہ تمہاری مرضی ہے''

ضحیٰ کا چہرہ یکایک پھیکا پڑ گیا۔ اس نے دھندلی آنکھوں میں نمی بھر کے اسے دیکھا تھا۔ اس مغرور لڑکے کو جس کی چال ڈھال میں اور بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک ٹھہراؤ سا تھا اس کی پروقار شخصیت میں ایک تمکنت اور غرور کا رنگ چھلکتا تھا جو سامنے والے کو خود بخود ہی اس سے مرعوب کر جاتا۔ وہ دیکھنے میں کسی ریاست کا شہزادہ نظر آتا تھا۔ جس پر بے نیازی جچتی تھی وہ جو خود اتنی امیر، اتنی طرحدار تھی مگر اس کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ گھٹنے ٹیکے محبت کی بھیک مانگنے پر مجبور۔

''ابن زید میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہاری یہ بے نیازی اور لاتعلقی میری جان لے لے گی'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ابن زید کے سامنے اس کا یہ جانے کتنی مرتبہ کا دہرایا گیا فقرہ

تھا وہ بھلا کیا پگھلتا۔ الٹا وہ کچھ اور بھی بے زار نظر آنے لگا۔

''پلیز ضحیٰ میرے ساتھ اس قسم کی باتیں نہ کیا کرو۔ یو نو مجھے ایسی باتیں اور وہ بھی لڑکیوں کے منہ سے ہرگز بھی اچھی نہیں لگتیں۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے تمہیں لازماً بتانا چاہوں گا کہ کسی عورت کا اس حد تک جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو جانا باعث فخر نہیں باعث ندامت ہے۔ عورت اپنے جذبوں میں بے بس ہی اچھی لگتی ہے بے باک نہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے ''حیا کا حسن خوبصورتی سے زیادہ ہے'' حیا کو عورت کا زیور بھی کہا گیا ہے میں سمجھتا ہوں یہ ایسا زیور ہے جس کے بغیر عورت ادھوری اور نامکمل ہو جاتی ہے سو بی کیئرفل نیکسٹ ٹائم او کے؟''

وہ اب کے کسی قدر رسانیت سے بولا تھا مگر ضحیٰ پر اس کی بات کا اثر دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

''تم جیسا چاہو گے میں اس رنگ میں ڈھل جاؤں گی ابنِ زید! پلیز مجھے ایک بار قبولیت کی سند تو بخشو''

ابنِ زید کی بے حد اٹریکٹیو پرسنالٹی پر بہت سی لڑکیاں فریفتہ ہوئی تھیں جن میں کرسچن لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی مگر ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اس کی لاتعلقی اور بے نیازی کے مظاہرے سہتے ہوئے آس مندانہ نظروں سے اسے تکتیں اپنا وقت برباد کرتیں رہتی سو ایک ایک کر کے سب پیچھے ہٹ گئی تھیں ہاں ضحیٰ کی مستقل مزاجی اپنی جگہ قائم تھی۔ وہ پچھلے دو سالوں سے مسلسل ابن زید کا دل جیتنے کی کوشش میں ہلکان تھی۔

''میرے پیرنٹس نے مجھے یہاں پڑھنے بھیجا ہے''

ابن زید نے جھلا کر جتلایا۔

''آئی نو میں بھی پڑھنے کے ارادے سے ہی آئی تھی ابن زید مگر...... تمہیں دیکھ کر ہر مقصد بھول بیٹھی ہوں'' اس کے لہجے و انداز میں ایک عجیب سی لاچاری در آئی تھی۔ ابنِ زید کا دل پہلی بار ذرا سا پگھلا اسے اپنے رویئے کی سختی کا احساس ہوا تھا۔

''او کے فائن! میں آ جاؤں گا''

ضحیٰ ایک دم سے کھل اٹھی۔ ابنِ زید کی ذرا سی گنجائش بھی اس کے لیے بہت تھی۔

''تحفہ کیا دو گے؟''

وہ فوراً ہی پھیلنے لگی۔

''جو تم کہو دے دوں گا''

ابن زید نے رسانیت سے کہہ کر گویا اس کا دل رکھنا چاہا

"میں کہوں اپنا آپ میرے نام کردو تو تم کردو گے"

ہونٹوں پر معنی خیز مسکان سجا کر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ابن زید جھلس کر رہ گیا تھا۔

"دل یو شٹ اپ ضحیٰ! مجھے بے باک لڑکیاں ہرگز پسند نہیں ہیں"

کاٹ دار لہجے میں جتلا کر کہتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ ضحیٰ بوکھلا کر اس کے پیچھے بھاگی اور اس کا راستہ روک کر منت سماجت کے ساتھ وضاحتوں پر وضاحتیں دیتے حلق سوکھانے لگی۔ ابن زید کے چٹخے ہوئے اعصاب پھر بھی یونہی کشیدگی کا شکار رہے تھے۔ ضحیٰ پر اچٹتی ہوئی ناخوش گوار نگاہ ڈالی اور ایک طویل سانس کھینچا!

"او کے فائن! اب راستے سے ہٹو میری کلاس نکل جائے گی ورنہ"

انداز صاف جان چھڑانے والا تھا پھر وہ رکا نہیں تھا۔ بے نیاز، خود اعتماد چال چلتا آگے بڑھ گیا۔ ضحیٰ نے جانے کب کا سینے میں اٹکا سانس آزاد کیا اور مسکرا دی۔ ابن زید کا یہ طنطنہ اس کی پرسنالٹی کو کچھ اور بھی اٹریکٹیو غیر معمولی اور پرکشش سحر عطا کرتا تھا اور ضحیٰ کو یقین تھا ایک دن وہ لازماً اسے پورے کا پورا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی جبھی اگلے دن تاخیر سے سہی مگر وہ ابن زید کے تقریب میں شامل ہونے پر پھولے نہیں سمائی تھی اور اس نے سب کے بیچ بیٹھ کر اپنے دل کا حال ایک سرمستی کی کیفیت میں اس کی نذر کیا تھا۔

مست آنکھوں کی حراست میں چلے آئے ہیں
بے اماں لوگ حفاظت میں چلے آئے ہیں
یوں لگا ہم کو تیرے دل میں اتر کر جیسے
بادشاہ اپنی ریاست میں چلے آئے ہیں
تختۂ دار پر پہنچے ہیں تو اب سوچتے ہیں
ہم کہاں آپ کی چاہت میں چلے آئے ہیں
ہم کو اس جنگ کے اسباب نہیں معلوم
ہم تو بس شوقِ شہادت میں چلے آئے ہیں

اور جس کو سنانے کی غرض سے اس نے ڈھیروں کتابیں رٹ کر پھر یہ انتخاب حاصل کیا تھا وہ اس کی بجائے باقی ہر کسی کی سمت متوجہ رہا تھا مگر ضحیٰ فی الحال اس بات کو خود پر مسلط کر کے اپنی خوشی کو خاک میں ملانا نہیں چاہتی تھی۔

"کیسے ہو ابن زید؟ مجھے ضحیٰ نے بتایا آپ کا تعلق عراق سے ہے۔ وہاں کے حالات تو

آج کل بہت خراب ہیں نا؟"

ضحیٰ کی مما جو بہت نفیس سی ساڑھی میں ملبوس تھیں اور بے حد شاندار خاتون تھیں ابن زید کے سلام کے جواب میں بولیں تو ابن زید کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔

"ج ج جی نہیں تو...... ابھی چند دن قبل ام جان کا فون آیا اور وہ بتا رہی تھیں......"

"ارے بیٹا! آپ کہاں رہتے ہو؟ ٹی وی نہیں دیکھتے کیا؟ امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا ہے اور......"

ابن زید کو ان کے اگلے کسی بھی فقرے کی سمجھ نہیں آسکی تھی۔ وہ کھڑے سے ایک دم بیٹھ گیا۔ اسے لگا تھا یکلخت اس کی تمام حسیات ساکت ہو گئی ہوں۔ اسے خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ ضحیٰ نے جلدی سے اسے جوس پلانا چاہا تھا مگر اس نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہاتھ سے گلاس پیچھے ہٹا دیا۔ وہاں ہر سو یہی موضوع چھڑ گیا تھا۔

"سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ لندن سے چھپنے والا اخبار الحیاۃ کو پڑھو تب تمہیں پتا چلے گا کہ عراقیوں کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا عذاب شروع ہو چکا ہے۔ بغداد، موصل وسلمانیہ سب جگہوں پر خون ریزی اور درندگی شروع ہو چکی ہے"

ضحیٰ کی مما جو ضحیٰ سے یکسر مختلف تھیں مزاج اور عادات میں یہ سب بتاتے ہوئے ان کی آواز پر نمی نے اپنا غلبہ پانا شروع کر دیا تھا۔

"حنیفہ کے متعلق بھی اچھی خبریں نہیں آ رہی ہیں"

کسی اور نے بھی کہا تھا۔ ابن زید کا رنگ سفید پڑ گیا یوں جیسے کسی نے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔ اس کا گھر حنیفہ میں ہی تو واقع تھا۔ اسے لگا کسی نے اسے زمین اور آسمان کے درمیان معلق کر دیا ہو۔ یہ اس کا فائنل ایئر تھا۔ پندرہ روز قبل جب اس کی آخری بار اپنے گھر بات ہوئی تھی تو صرف بابا جان نے ہی بات کی تھی۔ انہوں نے اسے اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کی بار بار تاکید کی تھی۔ اس نے جتنی بار بھی عراق کے حالیہ حالات کا پوچھا انہوں نے تسلی ہی سے نوازا تھا اور فکر نہ کرنے کی ہدایت کی تھی اور کتنا احمق تھا وہ کہ بے فکر ہو گیا تھا۔ اس کی پڑھائی کتنی بھی اہم اور ضروری تھی اس کے وطن سے بڑھ کر تو اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ کیسے بھول گیا؟ کیسے سب فراموش کر گیا۔ اس کے اندر جیسے آندھی کے بگولے اٹھنے لگے۔ اسے نہیں پتا وہ وہاں سے کیسے واپس ہاسٹل پہنچا تھا۔ اس کا دماغ گیلے کسیلے دھوئیں سے بھرتا جا رہا تھا تو آنکھیں آنسو روکنے کی کوشش میں دہک کر انگارہ ہو گئیں۔ عراق رابطہ کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ کی انگلیاں شل ہوتی رہی تھیں۔

''وہاں ہر قسم کا رابطہ آج کل منقطع کر دیا گیا ہے ابن زید! تمہیں بہت صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرنا ہوگا''

ابو حذیفہ نے پیچھے سے آ کر اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے تو اس کا مشکل سے سنبھالا ضبط چھلک گیا تھا۔

''کہاں سے لاؤں وہ صبر؟ میری ام جان، بابا جان، میرا چھوٹا بھائی سب وہاں ہیں جہاں پر ہر سو آگ لگا دی گئی ہے اور مجھے خبر تک نہ ہو سکی۔ میرا وطن تباہ کیا جا رہا ہے۔ لوٹ مار جاری ہے۔ ہم اجڑ رہے ہیں ابو حذیفہ اور تم کہتے ہو صبر کروں''

وہ اس کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا تو ابو حذیفہ کی آنکھوں سے بھی نمی چھلک گئی تھی۔

''خود کو سنبھالو ابن زید! ابھی تم بہت ڈپریشن کا شکار ہو''

''یہ ڈپریشن اب بڑھنا ہی ہے۔ ہر ذی شعور مسلمان جو سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے وہ کیسے خود کو ان حالات سے باہر سمجھ سکتا ہے، کشمیر، صومالیہ، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا و افغانستان اور اب عراق...... کیا ہر جگہ مسلمانوں کو تباہ و برباد نہیں کیا جا رہا؟ اگر ان حالات میں بھی کوئی ڈپریشن کا شکار نہیں ہے تو وہ بے حس ہے''

احمد عبداللہ متحدہ عرب امارات سے تعلق رکھتا تھا تاسف سے بولا وہ سب ابنِ زید کی ڈھارس بندھانے کو ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ابنِ زید کی آنکھیں کچھ اور شدت سے برس پڑیں کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی نے اس کے اندر اضطراب بھر دیا تھا۔

''مجھے عراق جانا ہے احمد عبداللہ کچھ کرو۔ وہاں میری ضرورت ہے''

''میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ ابھی وہاں ہر قسم کے رابطے کی راہ مسدود ہے۔ ابھی وہاں کسی کا جانا ناممکن ہے وہاں تو فون پر بھی رابطہ ممکن نہیں ہے۔ صرف ریڈیو اور ٹی وی پر وہاں کی خبریں نشر ہو رہی ہیں۔ وہ بھی عراق کے مواصلاتی نظام کے ذریعے نہیں بلکہ انگلینڈ اور امریکن نظام کے تحت اور تم سمجھ سکتے ہو کہ حالات کس حد تک گھمبیر ہو چکے ہوں گے''

احمد عبداللہ کی اس اطلاع نے ابنِ زید کے رہے سہے حواس بھی سلب کر لیے۔ مزید کچھ بھی سنے بغیر وہ انگاروں کی مانند دہکتی آنکھیں لیے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رات گئے لوٹا تو اس کا بدن بخار کی حدتوں سے تپ رہا تھا۔ اگلے دو دن تک اسے مکمل طور پر اپنا ہوش نہیں رہا تھا ابو حذیفہ اور عبداللہ کے سوا ان کے باقی مسلم دوست بھی اس کی عیادت کے ساتھ ساتھ دل جوئی میں

مصروف رہے تھے مگر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''مجھے نہیں کھانی یہ دوا! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو بلکہ مر جانے دو مجھے''

ضحیٰ جو اس کی حالت پر روہانسی ہو رہی تھی زبردستی دوا کھلانے لگی تو ابن زید نے اشتعال میں آ کر بپھرتے ہوئے اسے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر خود تو سنبھل گئی مگر دوا اور پانی کا گلاس زمین بوس ہو گیا تھا۔ ابو حذیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے ضحیٰ کو منع کیا تو وہ آنسو صاف کرتی پلٹ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ضحیٰ کو اس کی سب سے زیادہ فکر تھی اپنی مما کے ساتھ وہ ابن زید کو دیکھنے آئی تھی اس کی حالت پیش نظر ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا تھا وہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد وہ اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ ضحیٰ کی مما کا خیال تھا کہ ابن زیاد کی یہاں بہتر تیمارداری ہو سکتی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا احمد عبداللہ کے ساتھ ابو حذیفہ بھی ابن زید کی خبر گیری کو آئے ہوئے تھے۔ ضحیٰ نے ہی یقیناً اب اپنی مما کو بھیجا تھا جب وہ کسی کی نہیں مانتا تھا تب ضحیٰ کی مما اسے پیار محبت سے قابو کیا کرتی تھیں۔ اسے وہ اپنی ام جان کی طرح نرم گفتار مہربان لگا کرتی تھیں۔ ان چند دنوں میں وہ ان سے ہی مانوس ہو پایا تھا۔ ان کی گود میں منہ چھپا کر اس نے کتنی بار آنسو بہائے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے ہی بہلا پھسلا کر پہلے اسے بریڈ کے ساتھ دودھ پلایا پھر دوا کھلائی تھی۔

''بی بریو ابن زید! ہمارے گروپ میں تم ہمیشہ سب سے زیادہ اسٹرانگ رہے ہو''

احمد عبداللہ سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی تو اس کا کندھا تھپک کر نرمی سے بولا تھا۔

ابن زید نے آنسوؤں سے نم سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تم یہ سب اتنی آسانی سے اس لیے کہہ رہے ہو احمد عبداللہ کہ تم خود ایک آزاد ملک کے باشندے ہو۔ میرے اندر اس اتنے بڑے جبر اتنی سنگین زیادتی پر اتنی آگ، اتنا غصہ بھر گیا ہے کہ میں لمحہ لمحہ بھڑک کر ختم ہو رہا ہوں۔ شاید میں اس سسٹم سے بہت ناراض ہو گیا ہوں۔ مجھے سب لوگوں سے بہت سی شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں اگر دیگر مسلمان ملک ہمارا ساتھ دیتے تو ہمارے ساتھ یہ زیادتی نہ ہوتی۔ اگر وہ ساتھ نہیں بھی دے سکتے تھے تو ہماری پشت میں خنجر بھی نہ کھونپتے۔ تمہیں پتا ہے سعودی حکومت نے عراق پر حملہ کرنے کے لیے امریکہ کو اپنے ہوائی اڈے دیئے۔ آج ہمارا عراق جو لٹ کر برباد ہو رہا ہے۔ ہم جو وہاں بے گناہ مر رہے ہیں نہ مرتے۔ اس وقت مجھے تم میں سے کسی کی بھی ہمدردی اچھی نہیں لگ رہی۔ مجھے بتاؤ کیسی ہے یہ ہمدردی؟ کیا یہ زخموں پر نمک چھڑکنے والی بات نہیں؟۔''

اپنی بات مکمل کرتے اس کی آواز پر بھراہٹ چھا گئی۔ اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ کر

خود پر کتنی دیر میں قابو پالیا۔ پھر دل گیر دیگر آواز میں دوبارہ گویا ہوا تھا۔

''آگاہی بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی تم آج کل ٹی وی دیکھتے ہو؟''

اس نے کاٹ دار تمسخر نظروں سے باری باری سب کو دیکھا۔ پھر اپنے سرہانے لگا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کیا تھا۔

''یقیناً تم آج کل نیوز نہیں دیکھتے ہو گے۔ ہے نا؟ آج سنو۔ دیکھو وہاں کیا قیامتیں برپا کی جا چکی ہیں''

وہ سب گم صم تھے۔ لب بستہ، خاموش، ٹی وی اسکرین پر سی این این نشریات چل رہی تھیں جو دہشت اور پریشانی کو دوچند کر دینے والے مناظر دکھا رہی تھیں۔ بغداد شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کچھ مقامی لوگ برسرعام دندناتے اور لوٹ مار کرتے پھر رہے تھے۔ یہ لوگ سرکاری عمارتوں کے تالے توڑ کر اندر گھستے اور وہاں کی ہر قابل ذکر شے اٹھا کر بھاگ رہے تھے۔ ان سب کی ساکن آنکھوں نے وہ دل خراش منظر بھی دیکھا جب بغداد کے میوزیم میں لوٹ مار جاری تھی اور وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر بکتر بند گاڑیوں میں بیٹھے امریکی فوجی اس منظر سے محفوظ ہو رہے تھے۔ وہ لٹیروں کو روکنے کی بجائے ان مردوں اور عورتوں کا تمسخر اڑا رہے تھے جو ان سے ہاتھ باندھ کر التجا کر رہے تھے کہ ان لٹیروں سے ان کی جان و مال بچائیں اور وہ کندھے اُچکا کر کہتے تھے یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

اگلا منظر ان سب کی آنکھوں میں خراشیں ڈال گیا تھا جب موقع پر موجود نمائندے کو یہ کہتے سنا کہ ایک نوجوان لڑکی جو بمشکل ان وحشیوں سے جان بچا کر کسی نہ کسی طرح سے ایک ٹینک کے گرد جمع امریکیوں فوجیوں تک پہنچ گئی تھی۔ امریکیوں نے اس کی مدد کی بجائے قہقہے لگانے شروع کر دیتے تھے اور جیسے ہی انہوں نے اپنا ٹینک وہاں سے ہٹایا لڑکی کی تاک میں لگے لٹیروں نے اسے اٹھا کر اپنی کار میں پھینکا اور فرار ہو گئے۔ ابنِ زید کو احساس تک نہ ہو سکا کب اس کی آنکھیں شدتِ ضبط سے چھلک گئیں۔ اس کے آنسو گالوں پر پھیل رہے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ابوحذیفہ کی برداشت بھی جواب دے گئی۔ اور اس نے آنسو بہاتے ہوئے ابنِ زید کو اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔ احمد عبداللہ نے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

''پلیز پلیز ابن زید کنٹرول یور سیلف!''

ابوحذیفہ اسے تھپک رہا تھا۔ ابن زید نے خود پر قابو پائے بغیر ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کرنا چاہا مگر ابوحذیفہ نے اپنی گرفت اس کے گرد مضبوط کر دی تھی۔

تم سے اتنی سی زیادتی نہیں دیکھی گئی ابوحذیفہ؟ حالانکہ ہماری تو تاریخ ہی یہی ہے۔ بغداد پہلی مرتبہ تھوڑی ہی لٹا ہے۔ 1285ء میں ہلاکو خان نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کرا دیا تھا۔ کتب خانے جلا دیئے تھے۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ 1401ء میں بغداد نے پھر تیمور لنگ کی صورت میں یہ عذاب برداشت کیا تھا اور ایک صدی بعد 1508ء میں مغربی حکمران شاہ اسماعیل نے بغداد پر قابض ہو کر سنی مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس نے امام ابوحنیفہؒ اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات بھی اجاڑ دیئے تھے۔ 1534ء میں عثمانی خلافت یہاں آئی تو مسلمانوں نے کچھ سکھ کا سانس لیا لیکن 1622ء میں پھر ایرانی حکمران شاہ اول نے اپنے پیش رو شاہ اسماعیل کی تاریخ دہرائی اور 1638ء میں خدا خدا کر کے دوبارہ سلطان مراد نے یہاں عثمانی خلافت کی تو لوگوں کو امن نصیب ہوا۔ ہماری بدبختی یہ ہے کہ بغداد کو غیروں سے زیادہ اپنوں نے لوٹا۔ یہ لٹیرے بھی کوئی غیر ملکی نہیں ہیں۔ بغداد کے مضافات سے ہی یہاں لوٹ مار کرنے آتے ہیں۔ شاید ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے یہ، کاش ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے سبق سیکھا ہوتا۔ کاش مسلمان اپنی تاریخ سے ہی سبق سیکھ لیتے۔

ابوحذیفہ کے کاندھے سے اپنی سوجھی ہوئی گیلی آنکھیں رگڑتا وہ رقت آمیز لہجے میں کہے گیا تھا۔ ابوحذیفہ نے اسے نرمی محبت اور پیار سے تھپکا تھا۔

''یہ ہمارے حکمرانوں کی غلطیاں ہیں ابنِ زید جن کے آگے ہم خود بھی بے بس ہیں لیکن خدا گواہ ہے ہمارے دل تمہارے دکھ پر مضطرب ہیں''

''کاش عراقی افواج نے عراقی عوام والا کردار ادا کیا ہوتا''

احمد عبداللہ نے سرد آہ بھر کے خود کلامی کی تو ابنِ زید کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

''پیشہ ور فوجیں ایسا ہی کردار ادا کیا کرتی ہیں۔ یہ کوئی اسلامی فوج نہیں تھی تم تو عراقی نہیں ہو نہیں جانتے ہو گے یقیناً عراقی حکمرانوں کی غلامی کرنے والے سپاہی اس سے زیادہ کیا کردار ادا کرتے آئے ہیں۔ غاصبوں کے خلاف جنگ عوام ہی لڑتے ہیں۔ عام مسلمان لڑتے ہیں۔ حکمرانوں کے اطاعت گزار فوجی تو وقت آنے پر انہیں بھی چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں وہ عوام کا ساتھ کہاں دیتے جو اپنے مالکوں صدام اور اس کے بیٹوں کی حفاظت نہیں کر سکے۔ ہمارے لیے ان کا کردار قطعی غیر متوقع نہیں ہے۔''

ابن زید کا سر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ملک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی شرمسار تھا۔ احمد عبداللہ نے اس کے شانے پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ رکھا تھا۔

''تم ہم سے بدگمان ہو ابن زید مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی تمہاری طرح اپنے حکمرانوں کی بداعمالیوں سے نالاں ہیں۔ ہم سب بھی دنیا کے حالات اور اس کی سازشوں سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں فوجیں کس نظریئے کے تحت جان دیا کرتی ہیں۔ حاکموں کے لیے کوئی نہیں مرتا اور جانتے ہو صدام نے کیا کیا تھا؟ اس نے اپنی فوجوں کو اللہ کی اطاعت کا سبق دینے کی بجائے اپنی اطاعت کا سبق سکھایا اس نے **لا الہ الا اللہ** پر مرنے کی بجائے عظیم عراق پر مر جانے کی تلقین کی۔ اس نے انہیں اسلامی فوج کا سپاہی بنانے کی بجائے سوشلسٹ ری پبلک آف عراق کی دھرتی ماتا کا محافظ بنایا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ جب حملہ آور ان سے زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئے تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ لڑتے ہی کیوں؟ کس کے لیے؟ کس نظریئے کے لیے؟'' لیکن یاد رکھنا ابنِ زید یہ ہار فوج کی ہار ہے۔ عراقی عوام اور اس کے جوان بہت غیرت مند ہیں ''شہنشاہِ بغداد'' حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے بیٹوں کا شہر ہے۔ وہاں امریکیوں کو بڑا ٹف ٹائم ملے گا''

ابن زید بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر رنج و ملال کی جگہ اب حیرت غیر یقینی اور دبی دبی خفت تھی۔ احمد عبداللہ نے اس کی خفت کو محسوس کیا تھا پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگا کر زور سے بھینچا۔

''میں نے جو کچھ بھی کہا ہے ابنِ زید اس کا مطلب ہرگز تمہیں متاثر کرنا یا شرمندگی سے دوچار کرنا نہیں ہے۔ یہ تو بس کچھ دل کی کیفیت خود بخود عیاں ہو گئی ہے تو میں تم سے لازماً یہ سوال کروں گا کیا اب بھی تم خود کو اپنے دکھ میں تنہا سمجھتے ہو؟''

اور ابن زید کے رکے ہوئے آنسو پھر سے رواں ہو گئے تھے اب کی مرتبہ ابنِ زید نے خود اسے زور سے بھینچا تھا۔ اس کا گلا اتنا بھرایا ہوا تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی معذرت کا نہیں بولا جا سکا احمد عبداللہ اسے یوں تھپک رہا تھا جیسے اسے اس ایک لفظ کو سننے کی حاجت بھی نہیں ہو۔

☆☆☆

جا زندگی مدینے سے جھونکے ہوا کے لا
شاید حضور ﷺ ہم سے خفا ہیں منا کے لا
کچھ ہم بھی اپنا چہرۂ باطن سنوار لیں
ابوبکرؓ سے کچھ آئینے عشق و وفا کے لا
دنیا بہت ہی تنگ مسلماں پر ہو گئی
فاروقؓ کے زمانے کے نقشے اٹھا کے لا

محروم کر دیا ہمیں جس نے نگاہ میں
عثمانؓ سے وہ زاویئے شرم و حیا کے لا
مغرب میں مارا مارا نہ پھر اے گدائے علم
دروازۂ علیؓ سے یہ خیرات جا کے لا
باطل سے دب رہی ہے پھر امت رسول ﷺ کی
منظر ذرا حسینؓ سے کچھ کربلا کے لا

اس نے اپنے دل کی ترجمان، روح کی گہرائیوں سے نکلی گزارش پورے خشوع و خضوع سے خدا کے حضور پیش کی اور گہرا سانس بھر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ شمالی وزیرستان میں ہونے والی جھڑپیں شدت پکڑ گئی تھیں کچھ لوگ الجھے ہوئے پریشان تھے۔ حقیقت ہنوز گہرے دبیز پردوں میں ملفوف تھی۔ ابن زید نے اس سے وہاں کی سچائی، چھپی ہوئی سچائی جاننے کو سوالات کیے تھے اور وہ لاعلمی بھری خفت سے سر نہیں اٹھا سکا تھا۔ تب ابن زید نے متاسفانہ سانس کھینچ کر رنجیدگی کے ساتھ ایک اور سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

''کیا ہمارا اتنا بھی فرض نہیں بنتا سکندر بابا کہ ہم ان کے حالات سے باخبر رہیں۔ اپنے ملک کو گھات لگا کر حملہ کرنے اور نقصان پہنچانے والوں کو پہچانیں اور انہیں اس کام سے باز رکھیں؟''

''کیا ہم سب کچھ نہیں جانتے ہیں ابن زید؟''

سکندر نے الٹا اس سے سوال کر دیا تھا۔ جس میں تلخی کی آمیزش گہری تھی۔

''تو پھر لکھتے کیوں نہیں ہو؟ سچ کو عیاں کیوں نہیں کرتے''

''میری حیثیت اتنی مستحکم کہاں ہے ابنِ زید! میں اس ملک کے بے باک صحافیوں کی طرح اگر سچ لکھوں وہ شائع نہیں ہوتا''

اور ابنِ زید نے اس کی بات سن کر سرد آہ بھر لی تھی۔ وہ غلط کب کہہ رہا تھا۔ ابنِ زید کرب کی بے کراں وسعتوں میں گم ہونے لگے۔ انہیں چند دن قبل پڑھی جانے والی نظم از سر نو یاد آ کے اذیت سے دوچار کرنے لگی۔

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا
سنا ہے ہوا کے تیز جھونکے درختوں کو جب ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے

سنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو سارا جنگل جاگ اٹھتا ہے
سنا ہے کوئی پل گر ٹوٹ جائے اور پھر سیلاب آ جائے تو
کسی لکڑی کے ٹکڑے پر گلہری، سانپ و چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خدائے منصف واکبر میرے اس ملک میں
اب جنگلوں کا ہی کوئی قانون نافذ کر

ان کی آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں۔ سکندر نے ان کی اس کیفیت کو سمجھا تھا اور ماحول پر چھا جانے والے جمود کو توڑنے کی غرض سے بولا۔

''آپ بتائیں آپ کی بک کا کام کہاں تک پہنچا؟'' جہاد فی سبیل اللہ'' یہی نام ہے نا کتاب کا اور اس کا انتساب حضرت امام عالی مقام حسینؓ ابنِ علیؓ کے نام ہے۔

''ہاں بالکل!''

ابنِ زید چونکے تھے پھر نم آنکھیں جھکا کر آہستگی سے جواب دیا۔

''آپ کو تو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ مارکیٹ میں آپ کی بک بعد میں آتی ہے اور ہاتھوں ہاتھ پہلے بکتی ہے۔ اس پبلشر کے الگ وارے نیارے ہو جاتے ہیں جس کو آپ اپنا مسودہ دیتے ہیں''

''تم نے بانو قدسیہ کی حاصل گھاٹ پڑھی ہے سکندر بابا!''

ابنِ زید کا دھیان اب اس کی بات کی سمت نہیں تھا وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے تھے۔ سکندر کے سر کو نفی میں جنبش دینے پر انہوں نے ہاتھوں کے اشارے سے ریک کی سمت توجہ کرائی اور بولے تھے۔

''پلیز وہ بک تو اٹھا کر لاؤ میں تمہارے ساتھ اس سے کچھ شیئر کرنا چاہوں گا''

سکندر خاموشی سے اٹھا تھا اور بک ریک سے نکال کر ان کے حوالے کر دی۔ ابنِ زید نے بک کھولی پھر اسے دیکھا اور آہستگی سے گویا ہوئے تھے۔ یہ بک تقریباً آٹھ نو سال قبل شائع ہوئی تھی مگر محترمہ کا فہم تفکر اور سوچ کا زاویہ جس نہج پر تب تھا اس نے آج لوگوں پر یہ منکشف کیا کہ انہوں نے حالات کو کس درجہ باریکی سے دیکھا سمجھا اور سوچا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''بہت غور کرنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ امریکہ کو ڈاکوؤں نے بنایا تھا ڈاکوؤں کی کچھ بنیادی خصوصیات دلیری، بہادری اور زبردستی ہیں۔ وہ جب کسی سے کچھ ہتھیانا چاہتا ہے تو

اپنے آپ کو سینہ زوری پر ابھارنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ کو جب سڑکیں بنانے کی ضرورت تھی تو اس نے جال ڈال کر نیگرو لوگوں کو ہتھیا کر جہازوں میں لادا اور امریکہ کی سرزمین پر سرگرداں پھینک دیا۔ جب امریکی لوگوں کو اس سرزمین پر قابض ہونے کی خواہش نے ستایا تو ریڈ انڈین کو امریکی تارکین نے چن چن کر ختم کیا۔ جب انہیں انگریزی زبان لوٹنے کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی علم یوں اپنایا کہ اس کا لب ولہجہ حروف کے ہجے سپیلنگ کا اضافہ کر کے ایک ایسی زبان ایجاد کی کہ انگریز بھی اس اجنبی زبان پر ششدر رہ گئے۔

امریکی ڈاکو اگر خدا ترس ہو تو رابن ہڈ کہلاتا ہے۔ اگر عام ڈاکو ہو تو اس کو تہس نہس کرنے والا دہشت گرد کہا جا سکتا ہے۔ اسے آپ جرثومہ کہیں یا پرکھوں کے رسم و رواج کی پیروی یا امریکی مزاج کی خوبی لیکن یہ بات واضح ہے کہ کسی خطے کے بسنے والوں کی عام سائیکی ایک سی ہوتی ہے۔

1991ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں صرف ایک ہی سپر پاور رہ گئی تو حالات کچھ اور ہو گئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر بولڈ اور دہشت پسند ہو گیا۔ وہ نیو ورلڈ آرڈر پر دنیا کو دھمکانے ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا۔ امریکہ کے جیالوں نے ہر مسلمان ملک کے لیے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے والا ہے اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن کے لیے اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی وسائل لے کر بیٹھ گیا سوڈان کو دہشت گرد بنا کر خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اس کو تباہ کر دیا۔ الجزائر میں ڈیموکریسی کا پتہ پھینکا اور جب دیکھا فنڈامنلسٹ کامیاب ہو گئے تو یہاں فوجی راج قائم کر دیا امریکیوں کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے پھر ہر مظلوم اس اسلحے کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے اس اسلحے کی برکت سے پھر شہروں میں وارداتیں بھی ہونے لگتی ہیں۔ گروہی اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ ڈاکو، اٹھائی گیرے اسی اسلحے کی بنیاد پر زیادہ جی داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ٹرینوں میں بم پھٹتے ہیں۔ کاریں چرائی جاتی ہیں۔ ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ ان تمام وارداتوں کی تفصیل سپر پاور کے کارندے فتح مندی کے احساس کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ خوف سے ہراساں شہریوں کو دو نظریوں پر پارٹیوں میں تقسیم کرنا مشکل نہیں۔ مسلمان ملکوں کو کسی بھی وقت کوئی بھی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔''

ابنِ زید نے کتاب بند کی پھر ایک گہرا سا سانس کھینچ کر دوبارہ گویا ہوئے تھے۔

''ہماری عوام آج طالبان سے ہراساں ہے۔ طالبان کا امیج غلط بنانے والا کون ہے؟ یہاں کا میڈیا بھی غلط معلومات کے ذریعے ایک کردار ادا کر رہا ہے۔ ہم نے کبھی اس بات پر غور کیوں نہیں کیا سکندر بابا کہ طالبان نے کبھی شراب خانوں و جوئے کے اڈوں یا ڈانس کلب میں دھماکے کیوں نہیں کیے؟

کیا وجہ ہے؟

کیا یہ طالبان کی پسندیدہ جگہیں ہیں؟

طالبان کا نشانہ ہمیشہ مسلمان ہی کیوں بنتے ہیں؟

طالبان ہمیشہ مسجد اور عبادت گاہوں کو ہی کیوں نشانہ بناتے ہیں۔

کیا طالبان کے لیے یہ ساری جگہیں ناپسندیدہ ہیں؟ مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے لوگ آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ طالبان اگر مسلمان ہیں تو پھر وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔

یہ سامنے کی بات انہیں سمجھ کیوں نہیں آتی کہ طالبان کی آڑ میں سب کچھ امریکہ کر رہا ہے''

وہ یوں چپ ہو گئے جیسے بہت تھک گئے ہوں۔ سکندر خاموش تھا۔ ایک انجانے دکھ میں مبتلا۔

''مجھے لگتا ہے آج ستر سال بعد مسلمان قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کو پھر ایک اقبال کی ضرورت ہے۔ محمد بن قاسم جیسے سپہ سالار کی ضرورت ہے۔ حسینؓ ابنِ علیؓ جیسی دلیری اور شجاعت کی ضرورت ہے۔

وہ جھکے سر سے آہستگی سے بولا اور ابنِ زید کے لبوں پر زخم خوردہ مسکان بکھر گئی۔

''مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں استواری کا دلدادہ ہے۔ مشرق میں خواہش دبانے کا عمل تھا اور مغرب میں ابھارنے کا۔ یہاں عقیدہ اہم ہے وہاں قاعدہ۔ دونوں میں فرق اتنا ہے کہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے۔ مغرب نے مشرق والوں کے اندر اپنی برائیوں کو اتارنے کے تمام انتظامات مکمل کر دیے۔ ڈش و کیبل اور رہی سہی کسر ملٹی میڈیا چائنا موبائل فون میں ہر قسم کی فحاشی کا اہتمام کر کے نئی نسل کو تباہ کر ڈالا۔ امریکی جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں مگر ہمیشہ کے لیے جذبات کے تابع نہیں رہ سکتے۔ جہاں عمل میں تواتر آیا یا یکسانیت پیدا ہو گئی امریکی باشندہ بور ہو کر راستہ بدل جاتا ہے۔ اسے یا تو بریک درکار ہوتی ہے یا علیحدگی...... مگر مشرق جہاں مذہبی روحانیت اور دین اہم جزو ہیں ان سے چھٹا تو کہیں کا نہیں رہتا۔ انہوں نے مسلمان سے ان کی طاقت اور ان

کا فخر، ان کا قرآن اور ان کا دین ان سے دور کر دیا۔ تباہی کے دہانے تو پھر نصیب ہونے ہی تھے''

ماحول بے حد افسردہ اور بوجھل ہو رہا تھا جب بہار کے جھونکے کی مانند دروازہ کھول کر اسوہ ٹرالی گھسیٹتی اندر آ گئی۔ اس کے صبیح چہرے پر بہت دلکش مسکان تھی۔ سکندر کو لگا اس کی روح میں جتنے بھی انگارے چٹخے ہیں ان پر اسوہ کی اس دلکش نرم مسکان نے یکلخت ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہے۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' چائے پینے کے بعد باہر چلیں لان میں۔ اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔

اس نے اپنی بات مکمل کر کے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ابن زید خاموش رہے البتہ سکندر نے بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

''مروانا ہے لڑکی! باہر برف پڑ رہی ہے''

''سوواٹ! برف باری کا اپنا الگ مزا ہے۔ کبھی اس موسم میں آئسکریم کھائی ہے تم نے؟''

''میرا ابھی اتنی جلدی مرنے کا ارادہ نہیں ہے''

سکندر مصنوعی خوف سے لرز کر بولا اسے اسوہ سے بے معنی باتیں کر کے بھی ہمیشہ بہت اچھا لگا کرتا تھا۔

''بس یہ تھی تمہاری مردانگی! اتنا لمبا چوڑا گرانڈیل وجود اور دل چڑیا جتنا''

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی اور سکندر محو ہو کر اسے دیکھتا چلا گیا تھا یہ جانے بنا کہ ابنِ زید نے اس کی اس حرکت کو بالخصوص نوٹس کیا ہے اور آہستگی سے مسکرایا ہے۔

''ابنِ زید آپ خالی چائے نہیں لیں۔ یہ پزا اور کیک خاص طور پر آپ کے لیے بنائے ہیں میں نے'' اسوہ نے ابنِ زید کے آگے دونوں پلیٹیں رکھیں سکندر کا دھیان اسی کی سمت تھا بے ساختہ آہ بھری تھی۔

''اسوہ خاتون ایک نظر ادھر بھی۔ ہم بھی تو راہوں میں پڑے ہوئے ہیں''

اسوہ نے کچھ نخوت سے اسے دیکھا پھر ٹرالی اس کی سمت دھکیل دی تھی۔

''جو دل چاہ رہا ہے لے لو۔ منع کس نے کیا ہے''

اف!! اتنی بے لحاظی۔ مہمان ہوں میں تمہارا لڑکی!

وہ احتجاجاً چیخا اسوہ ہنسنے لگی۔

''اونہہ مہمان نہ کہو بلائے جان کہو۔ ہر روز تو ٹپکے ہوتے ہو''

تم سے نہیں ابنِ زید سے اور اپنی نانو سے ملنے آتا ہوں۔

اس نے جیسے بدلہ چکایا تھا۔

"اونہہ میں تو جیسے تم سے ملنے کو مری جاتی ہوں نا" خوش فہمی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے"
اس نے ننھی سی ناک چڑھائی پھر ابنِ زید سے مخاطب ہوئی تھی۔

"آج میں قورمہ اور بریانی بنا رہی ہوں۔ آپ کچھ اور بھی پسند کریں تو مجھے بتا دیں"

"ساتھ میں فروٹ ٹرائفل اور چکن کباب بھی بنا لینا۔ آج کھانا میں یہیں کھا رہا ہوں"

"میں نے تم سے نہیں پوچھا سمجھے!"

اسے سکندر کی بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی تڑخ کر بولی۔ سکندر نے شاکی نظروں سے ابنِ زید کو دیکھا۔

"اسوہ بی ہیو یور سیلف گڑیا! سکندر صرف مہمان نہیں ہے اس گھر کا فرد بھی ہے"
ابن زید کا لہجہ تادیبی نہیں تھا پھر بھی اسوہ فی الفور سنبھلی تھی۔

"سوری! میں اس گھونچو سے مذاق کر رہی تھی۔ بن جائیں گی اس کی پسند کی ڈشیں"
وہ سکندر کو منہ چڑا کر چلی گئی۔ سکندر بعد میں بھی بہت دیر تک مسکراتا رہا۔ پھر جانے اسے کیا سوجھی تھی کہ ابنِ زید کو مخاطب کر لیا تھا۔

"اسوہ اچھی ہے نا ابنِ زید!"

ابن زید چونک کر متوجہ ہوئے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے لاتعداد دیئے جھلملاتے تھے اور ہونٹوں پر الوہی مسکان تھی۔

"ہاں اچھی لڑکی ہے اور تمہارے ساتھ تو اور بھی زیادہ اچھی لگے گی"
اور سکندر کو ان سے ایسی بات کی توقع کہاں تھی۔ جبھی بڑی طرح سے جھینپ گیا تھا۔
ابن زید جانے کتنے عرصے بعد کھل کر مسکرائے تھے۔

☆☆☆

شان لفظوں میں کیوں کر بیاں ہو
ان ﷺ کا رتبہ بڑوں سے بڑا ہے
ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے
صرف اللہ ہی ان ﷺ سے بڑا ہے

"دیا فون ہے تمہارا"

وہ بڑے جذب سے نعت پڑھتے ہوئے اپنے کپڑے الماری میں سیٹ کرنے میں مصروف تھی جب حیا اپنے سیل فون سمیت اس تک پہنچی۔ دیا آج دوپہر کو ہی مستقیم کے ساتھ

واپس ہاسٹل آئی تھی۔

"میرا"

انگشت شہادت سے اپنی طرف اشارہ کر کے اس نے حیرت بھری نظروں سے حیا کو دیکھا۔ اس کے انداز میں تشویش تھی۔ بھلا اتنی جلدی دادو نے اسے کیوں کال کر لی تھی۔ خیریت ہو۔

"ہاں بھئی تمہارا ہی ہے۔ لو بات تو کرو"
حیا نے اس سے نگاہ چار کئے بنا سیل فون بڑھایا۔

"السلام و علیکم دادو! سب خیریت ہے نا؟ ابھی تو آئی ہوں میں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سیل فون کان سے لگاتے ہی وہ بے تابی سے سوال پر سوال کرنے لگی۔ دوسری جانب گہرا سانس بھرنے کی آواز گونجی تھی۔

"رشتہ بھی جوڑا تو اس قدر فضول، میم ہماری جنس تو نہ بدلیں"
بھاری شوخ اور گھمبیر آواز بلا کی شرارت لیے اس کی سماعتوں میں اتری تو دیا اپنی جگہ پر اچھل سی گئی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹتے بچا تھا۔

"کس کا فون ہے؟ کون ہے؟"
اس نے بے حد کڑے تیوروں سے حیا کو گھورا۔ انداز میں غضب کی تلخی اور اشتعال تھا۔

"شاہ حسین!" یار پیچھے پڑا ہوا ہے تب سے میرے۔ ہر صورت تم سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔ میں تو عاجز آ گئی تھی۔ سوچا تم اسے کچھ سخت سست سناؤ گی تو خود باز آ جائے گا"
حیا نے بستر پر بیٹھ کر بے نیازی سے پیر جھلاتے ہوئے جواب دے کر دیا کا گویا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔

"کون حسین؟"
اس کا لہجہ اتنا سرد اتنا سنگین تھا کہ حیا بے اختیار خائف سی ہو گئی۔

"وہی کنسرٹ والا سنگر! تم جانتی ہو اسے"
حیا نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

نہیں، میں تو کسی کو بھی اتنا نہیں جانتی کہ وہ میرے پیچھے مجھے فون کرتا پھرے۔ تم نے اسے اپنا نمبر خود دیا ہوگا نا"
وہ پھٹ پڑی تھی۔ حیا کچھ خجالت آمیز تاثرات سے اسے دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔

"آئی تھینک وہ تمہارے لیے سنسیئر ہے"

''شٹ اپ! آئندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی بات مت کرنا سمجھیں؟''

وہ مٹھیاں بھینچ کر چیخی تھی اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ حیا گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

''امت مسلمہ پر بہت کڑا وقت ہے۔ اگر ہم بوسنیا میں ہیں تو سربیا کی بچھائی بارودی سرنگیں ہمارے چیتھڑے اڑا رہی ہیں۔ فلسطین میں ہیں تو مسلمانوں کو اسرائیل عزائیل کا روپ دھارے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ کشمیر میں بھارت کی نام نہاد جمہوریت مضحکہ اڑاتی اپنی قلعی کھول رہی ہے۔ کبھی انسانی حقوق کا سب سے بڑا علمبردار، دنیا کا ٹھیکیدار امریکہ افغانستان پر حملہ آور ہوتا ہے اور اب پاکستان کو دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔ اس نام نہاد ٹھیکیدار سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ ہر اسلامی ملک میں جو اس کی قائم کردہ خفیہ ایجنسیاں ہیں وہاں کس کی ہدایت اور کس کا حکم چل رہا ہے۔ قیمت کون لگا رہا ہے؟''

''کٹھ پتلیوں کے دھاگے کس کے ہاتھ میں ہیں؟''

''ہر بم دھماکے کو خودکش حملہ قرار دینے والا کون ہے؟''

''کیا ثبوت ہے کہ ہر بم دھماکہ خودکش حملہ ہی ہے''

پھر میں حکومت سے پوچھتا ہوں جو وقت کا آمر بنا بیٹھا ہے اس سے پوچھتا ہوں۔

اپنے ملک کے معماروں کے ہاتھوں سے قلم چھین کر اسلحہ کون تھما رہا ہے یا اگر وہ تھام رہے ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

تعلیم ہے۔ شعور بھی ہے اور ڈگریاں بھی مگر نوکریاں نہیں ہیں۔ تو پھر یہ اضطراب تو ہوگا۔
اضطراب کے ساتھ بھوک بھی ہوگی۔ اور جب بھوک ہے تو پھر جرائم از خود جنم لیں گے جو شر ہے۔

سالہا سال سے یہی صورت حال ہے۔ آخر منظر کب بدلے گا؟
کب نیا سورج طلوع ہوگا؟
فرض کریں جنت کہیں نہیں ہے۔
اگر آپ کوشش کریں تو یہ مشکل کام نہیں
ہمارے پاؤں کے نیچے کوئی دوزخ نہیں
سر کے اوپر آسمان ہے۔
فرض کریں یہ سب لوگ لمحہ موجود میں زندہ رہیں گے

فرض کریں یہاں اچھائی کی حد بندیاں نہیں
یہ کوئی مشکل کام نہیں
کسی کو قتل کرنے کسی کو مارنے کی ضرورت نہیں
فرض کریں سب لوگ امن کی زندگی بسر کرتے ہیں
آپ کہہ سکتے ہیں میں خواب دیکھ رہا ہوں
لیکن میں تنہا نہیں ہوں
مجھے امید ہے کہ کسی روز آپ بھی میرے ہم آواز ہوں گے
اور ہمارا ملک یک جان یک قالب ہوگا۔
فرض کریں ملکیت، کرسی اور جائیداد کا کوئی جھگڑا نہیں۔
آپ یہ کام کر سکتے ہیں۔
طمع اور بھوک کا کوئی خوف نہیں۔
بنی نوع آدم کے درمیان بھائی چارہ ہے
فرض کریں
فرض کریں

اس کا قلم بہت سرعت سے رواں تھا۔ اس انہماک کو توڑنے کا باعث اس کے سیل فون کی بیپ تھی۔ قلم کاغذوں پر لڑھکا کر اس نے جینز کی جیب سے سیل فون نکالا۔ نمبر پر نگاہ پڑتے ہی اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

''ایم، اے، کیو بول رہے ہو؟''

دنیا بھر کا مکروہ اور سرد ترین لہجہ اس کی سماعتوں میں اتر کر زہر بن کر پھیلا تھا۔

''یس اسپکنگ!''

کرسی کی بیک سے تھکی اکڑی ہوئی کمر کو ٹکا کر اس نے لحاتی سکون کو محسوس کرنا چاہا۔

''تمہیں یاد دہانی کروا رہا ہوں یا پھر آخری تنبیہہ سمجھ لو۔ ہمارے خلاف نہ لکھو اور اس خبر کی تردید بھی خود ہی کر دو مگر الٹا تم نے اپنے کچھ لگتے انسپکٹر کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ بہت جوش مارتا ہے اس کا خون بھی اس مٹی کی محبت میں تمہاری طرح یا شاید تم سے بھی زیادہ...... ہاہاہا! بیچارہ اپنے اسی جوش اور محبت کے ہاتھوں بری طرح سے ذلیل ہوا ہے''

قہقہے کی مکروہ آواز اس کے اندر بھونچال سا لے آئی۔ سیل فون اس کے ہاتھ میں لرزا

تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے یکلخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''واٹ! واٹ یو مین؟ کیا ہوا صالح کو؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

محب عبدالقدوس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے گہری تشویش جھلکنے لگی تھی فراغ پیشانی لمحوں میں پسینوں میں نہا گئی۔ اسے سانس اپنے سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''دیکھ جرنلسٹ وہ تیرا دوست انسپکٹر بڑے پر پرزے نکال رہا ہے۔ اگر اسے زندہ سلامت دیکھنے کی تمنا ہے تو اسے اپنی زبان میں سمجھا دینا۔ او کے؟''

محب عبدالقدوس کے چہرے پر یکلخت گہرا سکون چھا گیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے جھلا کر فون بند کر دیا تھا۔ اور پھر سے قلم اٹھا کر اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''اب کیا ہو گا؟''

وہ تینوں گہری سوچ میں غرق تھیں' سرسبز مخملیں گھاس کے فرش پر ان کی کتابیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ جاتے دسمبر کی یہ ایک قدرے خنک شام تھی سورج کی دم توڑتی کرنیں کسی بھی پل رخصت ہونے کو تیار تھیں۔ ہاسٹل کی لڑکیاں گراؤنڈ میں بکھری اپنی دلچسپیوں میں مصروف تھیں۔ دینے کو تو حیا نے شاہ حسین کو اپنا نمبر دے دیا تھا مگر اب جو صورتحال درپیش تھی وہ حقیقتاً انہیں پریشان کر چکی تھی۔ شاہ حسین ہر صورت ان سے رابطہ رکھنا چاہتا تھا اور اسی رابطہ کے ذریعے دیا تک پہنچنے کا متمنی تھا۔

''مجھے تو یہ بندہ سٹھایا ہوا لگتا ہے۔ بھلا پہلی نظر کی محبت پر آج کون یقین رکھتا ہے''

ثانیہ کو اس سارے معاملے سے اب بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔

''یار اگر اسے یہ عشق وشق ہوا بھی ہے تو تھرو پراپر چینل کارروائی کرے اور شادی کرے اس سے، ہمیں کیا معلوم تھا بھلا محترم کو پسند دیا صاحبہ آ گئی تھیں۔''

''واقعی مٹی پاؤ اس قصے پہ اور حیا تم اپنی سم چینج کر لو پہلی فرصت میں، خود ہی یہ چیپٹر کلوز ہو جائے گا''

ثنا نے بھی اپنی رائے دے کر گویا بات ختم کی مگر حیا نے حظ لینے والے انداز میں ان کی توجہ اہم نکتے کی جانب دلائی۔

''مگر یار ان تھوبڑوں کا کیا کریں جنہیں وہ بہت اچھی طرح سے پہچاننے لگا ہے؟''

''مائی گڈنیس!'' ثنا نڈھال سی نظر آئی۔

''وہ کل والے کنسرٹ میں بھی تھا۔ حالانکہ شاہ حسین کا یہ ہمیشہ ریکارڈ رہا ہے کہ اس نے سال میں دو تین سے زیادہ کنسرٹ نہیں کیے وہ جتنا شاندار تھا اس سے کہیں بڑھ کر مغرور یہاں تک کہ وہ کسی کو انٹرویو بھی نہیں دیا کرتا تھا۔ نہ کسی سے سیدھے منہ بات کرتا۔ عام سنگرز کی طرح اس کے البمز بھی دھڑا دھڑ مارکیٹ میں نہیں آ رہے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود بھی اس کی شہرت آسمان کی بلندیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں اس کی ایک جھلک تک دیکھنے کو بھی جتن ہی کیا کرتے تھے۔ کل کنسرٹ میں جاتے ہوئے انہیں گمان تک بھی نہیں تھا کہ شاہ حسین سے ایک بار پھر سامنا ہو جائے گا اور جب انہیں شاہ حسین کی وہاں آمد کی اصل وجہ معلوم ہوئی تو صحیح معنوں میں وہ تینوں بھونچکی بلکہ ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ بلیک ٹو پیس سوٹ میں اس کی غضب کی دراز قامت کچھ اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کی سحر طراز آنکھیں انہیں دیکھ کر کیسے چمک اٹھی تھیں۔ پھر وہ لپکتے ہوئے ان کے پاس آیا تھا مگر ان کے ساتھ دیا کو نہ پا کر ان آنکھوں کی ساری روشنیاں پھر سے بجھ گئی تھیں۔

''آپ کی فرینڈ نہیں آئیں آج آپ کے ساتھ؟''

وہ ان کے پاس آ کر کھڑا ہوا تو آس پاس کتنی نگاہیں رشک وحسد لیے انہیں تکنے لگی تھیں۔ شاہ حسین کی وجہ سے وہ بھی ایک دم اہم اور خاص بن کر رہ گئی تھیں۔

''ہم اٹھا کر تو لانے سے رہے تھے''

ثنا کو سبکی محسوس ہوئی تھی تبھی تڑخ کر جواب دیا تھا۔

''دیکھیں پلیز آپ مجھے ایک بار ان سے ملائیں تو سہی یا پھر مجھے ہی ان کا ایڈریس دے دیں''......

''دیکھیں مسٹر شاہ وہ ایسی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ آپ اپنی توقعات کو......''

''مطلب کیا ہے آپ کا؟''

شاہ حسین کی صبیح پیشانی پر کتنی شکنیں نمودار ہوئی تھیں ایک دم سے ثنا خائف ہو کر رہ گئی؟

''میرا ہرگز بھی کوئی غلط مطلب نہیں ہے''

اس نے اپنی بات کی وضاحت ضروری خیال کی تھی شاید، مگر ثنا اب مزید یہ سلسلہ بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ جبھی بے اعتنائی سے یہی جواب دیا تھا۔

''تو پھر آپ اسے خود ڈھونڈ لیں''

شاہ حسین کا چہرہ اس جواب پر ایک دم دہک کر انگارہ بن گیا۔ ہونٹ بھینچے وہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا۔ اور مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

سنا تھا کہ آئیں گے وہ انجمن میں
سنا تھا کہ ان سے ملاقات ہوگی
ہمیں کیا پتا تھا ہمیں کیا خبر تھی
نہ یہ بات ہوگی نہ وہ بات ہوگی

ثنا نے مزا لے کر شعر پڑھے اور کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

''اف کتنا حسین ہے ظالم!''

''ہاں مگر کسی اور کا عاشق بیچارا''

ثناء کے آہ بھر کے کہنے پر ثانیہ نخوت سے جواب دیا۔ حیا البتہ خاموش رہی تھی۔ اس کا خیال تھا شاہ حسین یہ بی ہیوئیر ڈیز رو نہیں کرتا تھا۔

☆☆☆

اک قلزمِ عالم تھا اور گنگ تھیں زبانیں
سینوں میں ہمارے دم یوں گھٹ گئے تھے یارو
کچھ اور تو اب ہمیں کیا یاد رہ گیا ہے
یہ یاد ہے اس دن ہم لٹ گئے تھے یارو

16 دسمبر 1971ء یومِ وفات مشرقی پاکستان! ہم قوم کو تعزیت پیش کرتے ہیں۔ نفاق نے اس سانحہ کو جنم دیا۔ اتحاد اب زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے بھی کہ ہم مزید کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی جبھی کئی دن پرانا اخبار نکال کر محبت عبدالقدوس کا کالم پڑھ رہی تھی جب فضا ایک دم فائرنگ اور شور و غل سے تھرا اٹھی۔ دیا کا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھی۔ ثانیہ بھی کمرے میں نہیں تھی اس کا خوف کچھ اور بڑھنے لگا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی تھی کہ باہر جا کر صورت حال جانے یا وہیں دبکی رہے۔ ابھی وہ اس شش و پنج میں تھی کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور وہ تینوں ہنستی ہوئی اندر آ گھسیں۔ اس کی پیلی رنگت دیکھ کر ان کی یہ ہنسی قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''دیا تم بھی نا! قسم سے ساری زندگی پینڈو ہی رہنا''

اس کے فائرنگ کے متعلق استفسار پر ثانیہ نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ دیا کا چہرا ہتک کے احساس سے سرخ پڑنے لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے ناگواریت سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی اصل بات کیا ہے۔ فائرنگ اور پٹاخوں کی آواز بدستور آ رہی تھا۔

''یار نیا سال شروع ہوا ہے۔ بڑے شہروں میں اسی طرح لوگ نئے سال کا استقبال کرتے ہیں۔ ہمارے سیل فون کے ان باکس چیک کرو۔ ہیپی نیو ایئر کے میسجز سے فل ہو چکے ہیں''

حیا نے اترا کر کہتے ہوئے وضاحت دی پھر اس کے نزدیک آ کر اس کا گال چٹاخ سے چوما اور اسے نئے سال کی مبارک باد دینے لگی۔ دیا کے چہرے پر موجود ناگواریت میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔

''یہ حال ہے ہمارا مسلمان ہوتے ہوئے بھی۔ اسی لیے ہم اتنی تنزلی کا شکار ہیں۔ صد افسوس نئے سال کی مبارک باد دینے اور خوشی منانے والوں کو یہ حدیث مبارکہ قطعی یاد نہیں ہوگی۔

''جس کسی نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ کل قیامت والے دن انہی میں سے شمار ہوگا''

دیا خاموش ہوئی تھی تو ان کے چہروں کو دیکھا وہاں خجالت بھری تمتماہٹ تھی۔

''آئی ایم ساری! خدا ہمیں نیک ہدایت سے نوازے آمین؟''

ثنا نے آہستگی سے کہا تھا۔ دیا نے اخبار لپیٹ کر اپنی کتابوں کے ساتھ رکھ دیا۔

''میرا خیال ہے اب سو جانا چاہئے اتنی رات گئے تک جاگ کر صبح نماز کو اٹھنا مشکل ہوگا''

دیا نے اپنا بستر جھاڑا تھا اور لحاف کھولنے لگی۔ ثانیہ اور حیا بھی اپنے کمرے میں جانے کو اٹھ گئیں۔

☆☆☆

اے نئے سال بتا تجھ میں نیا کیا ہے
ہر طرف خلق نے کیوں شور مچا رکھا ہے
روشنی دن کی وہی تاروں بھری رات وہی
آج بھی ہم کو نظر آتی ہے ہر بات وہی
آسماں بدلہ ہے نہ بدلی ہے یہ افسردہ زمیں
ایک ہندسے کا بدل جانا کوئی جدت تو نہیں
اگلے برسوں کی طرح ہوں گے قرینے تیرے
کسے معلوم نہیں بارہ مہینے تیرے

بے سبب دیتے ہیں کیوں لوگ مبارک بادیں
سب کیا بھول گئے وقت کی کڑوی یادیں
تو نیا ہے تو دکھا صبح نئی شام نئی
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

جہاں سب نے اپنا انتخاب پیش کیا دیا کی سنائی گئی نظم پر بہت داد وصول ہوئی تھی۔ یہ ان کا فری پریڈ تھا ان چاروں کے علاوہ دیگر کئی لڑکیاں بھی اس وقت ان کے ساتھ تھیں۔ ثناء نے بالخصوص دیا کے خیالات آشکارا کئے تھے۔ جنہیں اگر کسی نے عمل میں لانے کا نہیں بھی سوچا تھا تو اس کی سوچ کو سراہا ضرور تھا۔ دیا کے لیے افسردگی کا باعث یہی بات تھی۔ اس کا مقصد اپنی واہ واہ کرانا تو نہیں تھا مگر شاید یہ وقت بہت نازک تھا یا پھر گمراہی کے راستے ہی اتنے مزین تھے کہ وہاں سے پلٹنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ ملول سی اپنی کورس کی کتاب کھول کر پڑھنے کی بجائے سوچوں میں غلطاں تھی حیا نے اپنے دھیان میں نگاہ اٹھائی تھی اور اگلے پل جیسے اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ شاہ حسین کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ اپنی تمام تر سحر انگیزی اور وجاہتوں کے ہمراہ بڑی دل کش مسکان لبوں کے گوشوں میں سمیٹے ان کے عین مقابل آن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''............آ آپ!''

بوکھلاہٹ کا شکار ہوئی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ایک خائف سی نگاہ دیا پر ڈالی تھی جو حیران اور کچھ الجھن آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ باقی سب پر گویا کوئی سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ شاہ حسین کی نگاہوں کا مرکز البتہ دیا کا چہرا تھا۔

''مس آپ کو یہ تو سوچنا بھی نہیں چاہئے تھا کہ میں آپ کا چیلنج ایکسپٹ نہ کروں گا۔ ان فیکٹ یہ تو میری انسلٹ ہوتی نا''

ثنا کے ہوائیاں اڑاتے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر وہ رسان سے بولا پھر کاندھے جھٹک دیئے تھے۔

''اینی ویز مجھے آپ سے نہیں مس دیا سے بات کرنی ہے''

اس کی گولڈن آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔ سورج کی کرنیں اس کی سنہری جلد سے یوں لپٹی تھیں کہ اس کا وجود جگمگا سا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ روشنی اس کے وجود سے خارج ہو رہی ہو۔

''اس ساری بکواس کا مطلب کیا ہے؟''

دیا کے حواس باقی دیگر لڑکیوں کی طرح سلب نہیں ہوتے تھے البتہ صورتحال کی سنگینی

نے اسے متفکر کرنے کے ساتھ مشتعل بھی کر دیا تھا۔

''بتا دیتے ہیں۔ آپ کہیں آرام سے بیٹھیں تو...... میرا خیال ہے ہم کہیں باہر چلتے ہیں پرنسل صاحبہ کی فکر میں تردد مت کریں میں ان سے بات کر چکا ہوں''

الفاظ تھے یا بارود کے گولے، دیا کو لگا تھا اس کے وجود کے پرخچے اڑا دیئے گئے ہوں۔ اس نے سرعت سے چھلک جانے کو بے قرار آنکھوں سے لمحہ بھر کو ماحول کا جائزہ لیا اور صحیح معنوں میں زمین میں گڑھ کر رہ گئی ان کے اطراف گویا پوری جامعہ کی طالبات اُمڈ کر جم غفیر کی صورت جمع ہو گئی تھیں اور گویا اس مفت کے تماشے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ زمین آسمان اس پل گویا اس کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ وہیں سے پلٹی تھی کہ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے غلام حسین نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''دیا پلیز دس از ناٹ فیئر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں......''

''ول یو شٹ اپ اینڈ ڈونٹ کراس لمٹس''

چھلک جانے والی آنکھوں کے ساتھ وہ زور سے دھاڑی تھی تو آواز پر بھی آنسوؤں کی نمی غلبہ پا گئی تھی۔

مگر غلام حسین پر جیسے مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔

''لمٹس تو کراس ہو چکیں میم!''

وہ بہت زعم سے مسکرایا اور لمبے ڈگ بھرتا اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ دیا کے لیے یہ بے حد قابل اعتراض اور پریشان کن مرحلہ تھا وہ جیسے روہانسی ہو گئی تھی پتا نہیں اس کے عزائم کیا تھے۔

''جسٹ شٹ اپ او کے آئی سیڈ اسٹاپ اٹ یور اسکاؤنڈرل تم خود کو سمجھتے کیا ہو'' اگر تم مجھے بھی دیگر ان فضول لڑکیوں میں شمار کر رہے ہو جو ہر پل تمہاری راہ میں پلکیں بچھاتی ہیں تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دو، میں ہرگز ویسی نہیں ہوں۔ سو ڈونٹ ویسٹ مائی ٹائم اینڈ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می اگین، لیٹ می گو''

وہ اتنی بڑی طرح سے جھلائی تھی اتنا غصہ آ رہا تھا اسے کہ وہ اسے سنانے پر آئی تو سناتی چلی گئی شاید اس طرح اسے ذلیل کر کے وہ اس سے جان چھڑانے کی خواہاں تھی مگر اس کے مقابل غلام حسین تھا۔ جیسے اپنی وجاہت اور خوبروئی پر ہی نہیں اپنے نام اور شہرت پر بھی بہت زعم تھے۔ یقیناً اس زعم میں مبتلا اس نے وہ جسارت کی تھی کہ سائیڈ سے کترا کر نکلتی دیا کی کلائی ہاتھ بڑھا کر اپنے مضبوط فولادی ہاتھ میں جکڑ کر اسے اپنے مقابل کر لیا تھا۔

"اگر میں کہوں مس دیا کہ میں آپ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے محبت کرتا ہوں تو لازماً پھر آپ کا یہ غصہ ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور عزت سے آپ کو اپنانا چاہتا ہوں سو پلیز!" دیا پہ جیسے بجلیاں سی آن گریں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا اور منہ پر ہاتھ رکھے پاگلوں کی طرح سے دوڑتی چلی گئی تھی۔ غلام حسین لب بھینچے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سطح کے سنہرے پن کو کوئی پریشان کن سوچ سرخی میں ڈھال رہی تھی۔

☆☆☆

ہر گھڑی درد کی شدت سے سسکتی آنکھیں
اور اوپر سے تیرے وصل کے خوابوں کے عذاب
روز آنگن میں کھڑے پیڑ سے گرتے پتے
اور سرِ شام پرندوں پر گزرتی آفات
نفس اور دل کی بغاوت سے تڑپتی ہے حیات
اس بڑے شہر میں بڑھتا ہوا لوگوں کا ہجوم
روز ہوتی ہے میرے ساتھ دیواروں کی جھڑپ
روز اک سانس کو پھانسی کی سزا ملتی ہے
اب تو آجا اے میری جان کے پیارے دشمن
اب تو آجا کہ تیرے ہجر کے قیدی کو یہاں
روز اس شہر میں مرنے کی دعا ملتی ہے

یہ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر شفق کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی اور زمین پر درختوں سے سوکھ کر گرے پتوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ شہر کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر وہ بے خیالی میں اکیلا چل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف پیپل کے گھنے درخت ایستادہ تھے درختوں سے ٹوٹنے والے پتے اس پر گرتے اور اس کے قدموں تلے آکر چرمراتے۔ وہ کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر نکل آیا تھا۔ دل کی وحشت پھر عروج پر تھی۔ اس کی کیفیت سے صرف وہی آگاہ ہو سکتا تھا جو اس اذیت سے گزر چکا ہو۔ اپنے پیاروں اپنے عزیزوں کا موت کے جاری رقص کی وادی میں لاپتہ ہو جانا اور کسی سراغ کا ہاتھ نہ آنا اسے پاگل بنا رہا تھا۔ ان گزرے ہوئے دنوں میں اس نے متعدد بار عراق جانے کی کوشش بھی کی تھی مگر سوائے ناکامی اور بے بسی کے کچھ حاصل نہ ہو سکا تھا ایسے میں جب ضحیٰ نے اس کی ڈھارس بندھانا چاہی تھی تو وہ اسی پر الٹ پڑا تھا۔

"مجھے مت بہلاؤ۔ تنہا چھوڑ دو مجھے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے ایک دن میں خود ہی سنبھل جاؤں گا۔ لیکن پلیز مجھے اس طرح سے گھسیٹ گھسیٹ کر زندگی کی طرف مت دھکیلو۔ فی الحال زندگی میرے لیے مر چکی ہے۔ میری آنکھیں بے نور ہو گئی ہیں۔ میرا دل خالی ہے میرا دل کہیں نہیں لگتا۔ میری بے بسی تو دیکھو۔ وہاں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرا وطن برباد ہو رہا ہے میرے لوگ بے بسی کی موت مر رہے ہیں اور میں یہاں عیش سے بیٹھا ہوا ہوں۔ اس سے بڑھ کے بھی بے بسی کا کوئی مقام ہوگا؟ کتنے لوگ ہیں یہاں مگر کسی کا چہرہ میرے بابا کا چہرہ نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی میرے بھائی جیسا نہیں ہے۔ کوئی عورت میری ام جان کی طرح نہیں ہے۔"

خود پر باندھے ضبط کے سارے بندھن توڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا چلا گیا تھا۔ درد تھا۔ بے کسی ولاچاری اور اضطراب تھا ایسا...... جس کا کوئی انت نہیں تھا۔

وہ چلتے ہوئے تھک گیا تو چوک میں بنے فوارے کے پاس رک گیا۔ جس کے درمیان ایک بڑے سے لوہے کے بنے شیر کے منہ سے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ جو شدید سردی کے باعث جم کر ساکن ہو چکی تھیں۔ اپنے گھر والوں کی شکلیں اس کے تصور میں لہرائیں تو جلتی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ ضحیٰ کی مما کی رقت آمیز آواز کی بازگشت اس کی سماعتوں میں اترنے لگی۔

مجھے ایک دل کی تلاش ہے
جس میں میرے لوگوں کے سکھ سانس لے سکیں
جنگجوؤں کے دل نہیں ہوتے
میرے لوگ امن اور آزادی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں
زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں
ہم نے اپنے حق میں بولنا چاہا
ہماری آوازیں ہمارے حلقوم سے چپک گئیں
ہم وہ لوگ ہیں حکمران جن سے جمع تفریق کا کھیل کھیلتے ہیں
کانچ کی آنکھ میں بصارت نہیں اگتی
میرے پاس آواز ہے گیت نہیں
تمہارے پاس گیت ہے آواز نہیں
آؤ اس گیت کو مل کر گائیں
کیونکہ پرندے گانا بھول چکے ہیں

میں انہیں امن کا گیت سنانا چاہتا ہوں
اور مجھے داد میں نفرت ملتی ہے
شاید میرے لوگ موت سے سمجھوتہ کر چکے ہیں
آؤ ہم بھی موت کے پروانے پر دستخط کریں
شاید ہم اس سے اپنے لوگوں کے لیے آزادی خرید سکیں

وہ تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے ضحیٰ کی مما کے آنسو دیکھے تھے۔ ان کا دکھ اس کے دکھ سے مختلف تو نہیں تھا۔ پتا نہیں ہر جگہ مسلمان ہی کیوں یہ جبر سہہ رہے تھے۔ اسے ہر سو رنج اور الم کے ساتھ خون بکھرا نظر آنے لگا۔ شام اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا چھا گیا اسٹریٹ لائٹس آن ہو چکی تھیں مگر وہ وہیں بیٹھا اپنے دکھ پر ماتم کناں رہا تھا۔ اچانک ہوا میں تیزی پیدا ہوئی تھی اور برف باری شروع ہو گئی۔ برف کے بڑے بڑے گالے اس کے سر پر چاندی سی بکھیرنے لگے۔ اب اسے سردی محسوس ہونے لگی تھی مگر وہ خود اذیتی کا شکار ہوتا وہیں ساکن بیٹھا رہا۔ برف اس کے بالوں اور چہرے کو چھو چھو کر نیچے گرتی رہی۔ سڑک سنسان اور رات گہری تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑے ایور گرین کے درخت رات کی تاریکی کا حصہ بنتے خوفناک تاثر پیش کرنے لگے۔ گو کہ اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں پھر بھی ایک پراسراریت ماحول کا حصہ بنتی جا رہی تھیں۔ رات کے سناٹے میں گرتی برف کا منظر اور لطف وہی جان سکتے ہیں جو کبھی رات کی تنہائی میں کسی ویرانے میں گرتی برف دیکھ چکے ہوں۔ آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت گویا نور کی برسات جاری تھی۔ گرتی ہوئی برف کی اپنی ایک دودھیا سفید روشنی ہوتی ہے۔ جیسے بیک وقت بہت سے جگنو مل کر راستہ دکھا رہے ہوں۔

''ابنِ زید یہ بھلا کیا حماقت ہے یارا! اس طرح پریشان کرتے ہیں خود سے وابستہ لوگوں کو؟''

وہ خود سے بھی غافل گم صم بیٹھا تھا جب احمد عبداللہ ابو حذیفہ کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہوئے پریشان حال اس تک پہنچے تھے۔ ابنِ زید نے سر اٹھا کر آنے والوں کو ایک نظر دیکھا تھا۔ ابو حذیفہ اس کی لہو رنگ آنکھوں میں پہچان کا کوئی رنگ نہ پا کر لرز اٹھا تھا۔

''جو خود انتہا سے زیادہ پریشان ہو وہ کسی کی پریشانی کا احساس کیونکر کر سکتا ہے''

وہ بوجھل آواز میں بولا اور زہر خند سے مسکرایا۔

''تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟''

ابو حذیفہ نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''تم کبھی نہیں سمجھو گے ابن زید! اٹھو گھر چلیں۔ آنٹی اور ضحیٰ بہت پریشان ہیں تمہاری وجہ سے''

احمد عبداللہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی کھینچ کر اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا اور جب وہ لوگ گھر پہنچے دونوں خواتین نے اسے صحیح سالم دیکھ کر سکھ کا سانس بھرا تھا۔ ضحیٰ کی مما نے اس کے لیے کپڑے نکالے تھے تاکہ وہ گیلے لباس سے نجات حاصل کر لے جبکہ ضحیٰ کافی بنا لائی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟ کیا عراق پر اچانک حملہ صرف ہتھیاروں کی تلاشی اور اسامہ بن لادن کی وجہ سے کیا گیا ہے؟''

ضحیٰ نے کافی کا سپ لے کر سوال کیا تھا اور ابنِ زید کے اندر سرسراتا زہر اس کے ہونٹوں پر آ گیا۔

''احمق لڑکی یہ حملہ اچانک نہیں ہوا۔ اس کی منصوبہ بندی جانے کتنے عرصے پر محیط ہے۔ شاید اس وقت سے جب صدام بعث پارٹی برسر اقتدار آئی اور صدام نے تیل کمپنیاں قومی تحویل میں لے لیں اور برطانوی یہود نژاد کمپنیاں Shell B.P اور Esso وغیرہ ختم کر کے عراقی پٹرولیم I.P.S قائم کی۔ یوں وہ رقم جو پہلے ان کمپنیوں کو جاتی تھی عراق کو خود ملنے لگی۔ اس رقم سے عوام کی تعلیم، ترقی اور خوشحالی کے دروازے کھل گئے۔ تعلیمی شرح کا اتنی جلدی اور زیادہ بڑھنا بہت حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ یو این او کا سب سے بڑا اعزاز صدام کو تعلیم عام کرنے پر دیا گیا۔ قطع نظر اس کے ذاتی کردار کے میں سمجھتا ہوں کہ اگر عراق ایران سے جنگ نہ کرتا تو بہت آگے ہوتا اور صرف عراق ہی نہیں دنیا کے تمام مسلمان''

ابنِ زید نے توقف اختیار کیا تھا تو ضحیٰ کی مما جو بہت دھیان سے اس کی بات سن رہی تھیں تائیدی انداز میں سر ہلانے کے بعد گلا کھنکار کر بولیں۔

''جی بالکل بیٹا بلکہ مجھے یاد ہے میں نے ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ صدام کا منصوبہ ہے کہ وہ تمام دنیا سے مسلمانوں کے ذہین دماغوں کو اکٹھا کر کے انہیں سائنس اور ایسے ہی دوسرے شعبوں میں تعلیم کی ساری سہولتیں مہیا کرے گا تاکہ مسلمان جن باتوں میں پیچھے رہ گئے ہیں ان میں آگے نکل سکیں اور شاید اس منصوبے پر کام بھی شروع ہو چکا تھا اور بے شمار عراقی سائنس اور میڈیکل کی تعلیم مختلف ممالک میں حاصل کر رہے تھے۔ اب پتا نہیں غلطی کہاں ہوئی اور سازشوں

کے تانے بانے کہاں بنے گئے۔شاید ایران اور عراق کی جنگ بھی ایسی ہی سازش کا نتیجہ تھی“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی! کہیں نہ کہیں بہت کچھ غلط ہوا ہے مگر ہمیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔زوال پذیر قوموں پر ہمیشہ زوال قوم کی بداعمالی یا پھر حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے آتا ہے مگر عراقی غیرت مند قوم ہیں۔میری اطلاع کے مطابق وہاں کے عوام نے امریکی فوجیوں سے اپنے اپنے طور پر مزاحمتی جنگ شروع کردی ہے۔امریکی اتنی آسانی سے اپنے خواب کی تعبیر نہیں پاسکتے۔ جو وہاں کی صورت حال ہے اس کے مطابق مجھے کبھی کی پڑھی ہوئی ایک کتاب ”دی وار آف بی“ یعنی شہد کی مکھی کی جنگ یاد آرہی ہے۔ یہ کتاب مصنف نے ویت نامی جنگ کے لیے لکھی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ مکھی جب کتے سے انتقام پر اترتی ہے تو کبھی اس کی ناک پر کاٹتی ہے کبھی ٹانگ پر، کبھی منہ پر کبھی دم پر، حتیٰ کہ تنگ آکر کتے کو بھاگنا پڑتا ہے۔ عراق کی اس مزاحمتی جنگ میں امریکہ کا حال بھی اس کتے جیسا ہونے والا ہے“

ابن زید کو ایک بار پھر احمد عبداللہ کے الفاظ نے بے حد ڈھارس دی تھی۔اس نے دل ہی دل میں تمام تر صدق دل کے ساتھ آمین کہا اور ٹھنڈی ہو جانے والی کافی کا مگ بسم اللہ کہہ کر ہونٹوں سے لگا لیا اور رغبت سے گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔جبکہ احمد عبداللہ اپنی پرسوز آواز سے ماحول میں رنگ بھرنے لگا۔

اے مرگ زرد کا خوف کیا
جو کفن بدوش رہا سدا
سو میرے غنیم نہ بھول تو
کہ ستم کی شب کو زوال ہے
تیرا ظلم و جبر بلا سہی
میرا حوصلہ بھی کمال ہے
مجھے ناز زخم بدن پر ہے

☆☆☆

وہ اتنا پریشان ہوئی اتنا گھبرائی تھی کہ مستقیم کو بلوایا اور گھر چلی آئی۔اپنی عزت کو وہ کسی اسکینڈل کی ندر کرنے کے حق میں نہیں تھی۔شاہ حسین کی اس درجہ بڑھی ہوئی جرأت نے اسے اندر سے اتنا ہی خائف کردیا تھا کہ پڑھائی ادھوری چھوڑنے کا بھی ملال باقی نہ رہا۔اس نے اپنے اس فیصلے سے کسی کو بھی آگاہ نہیں کیا تھا ثنا حیا وغیرہ کو بھی نہیں۔شاہ حسینکی باتیں، اس کی نظروں کا انداز

اور سب سے بڑھ کر اس کے لمس کا احساس۔اسے لگتا وہ دہکتے الاؤ میں جل جل کر پگھل رہی ہے۔ سارے رستے وہ مستقیم کی جھڑکیوں اور خفگی کو خاموشی سے سنتی آئی تھی۔ جو اس کے چند دنوں بعد واپس بھاگ آنے پر اسے سخت سست سنا تا رہا تھا۔اس کے خیال میں یہ سراسر حماقت تھی کہ وہ ایگزیم کے سر پر آجانے کے باوجود پڑھائی کے معاملے میں اس درجہ لاپرواہی برت رہی تھی کالونی میں داخل ہوتے ہی اس کا مضطرب دل ذرا سا سنبھلا تھا گھر کی بیرونی دیوار سے لپٹی بوگن ویلیا کی بیل اور گھر کے آنگن میں کھڑا سکھ چین کا پیڑ کتنا سکون اور اپنائیت کے ساتھ تحفظ کا احساس رگ و پے ہیں اتارنے لگا تھا۔ مستقیم کے چلے جانے کے بعد اس نے خود کو گھر کے کاموں میں مگن کرلیا۔دادو کو فی الحال تو اس نے دل اداس ہے کا بہانا بنا کر ٹال دیا تھا مگر جب وجہ پوچھتیں تو اس نے ان سے کچھ نہ چھپانے کا فیصلہ کر کے رکھا ہوا تھا۔اور یہ مرحلہ بھی جلد آگیا تھا۔دیا نے بغیر کسی حیل وحجت کے ساری بات ان کے سامنے کھول دی تو کتنی دیر دادو کچھ بولنے کے قابل نہیں ہوسکی تھیں۔

”میں نے ٹھیک کیا نا دادو؟“

اس نے ان کے جھریوں بھرے پریشان کن ہزار خدشات کی آماجگاہ بنے چہرے کو دیکھ کر سوال کیا تب وہ بے طرح چونکی تھیں۔

”ہاں بالکل ٹھیک کیا۔مگر مجھے ڈر ہے اگر وہ کلموہا یہاں تک آگیا تو......؟“ بچی میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں کہ حالات کا مقابلہ کرسکوں۔کوئی اچھا رشتہ بھی نہیں کہ تجھے عزت سے رخصت کر کے خود ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں“

کچھ نہ سوجھا انہیں تو رونے بیٹھ گئیں۔دیا کوفت کے ساتھ بے بسی کا بھی شکار ہوئی تھی۔

”افوہ دادو حد ہے خوف کی بھی۔وہ بھلا یہاں کیوں آئے گا۔میں نے اس لیے تھوڑی آپ کو بتایا کہ آپ پریشان ہونا شروع کردیں۔اللہ سے بہتری کی امید رکھیں۔“

وہ رسانیت سے کہتے اٹھ گئی مگر اسے یہ نہیں پتا چل سکا تھا کہ دادو نے کیا کارنامہ انجام دیا وہ تو جب دادو کالونی میں کسی سے ملنے گئی تھیں اور وہ خود صفائی میں مصروف تھی تب روبی نے اسے دیوار پر سے آواز دی تھی۔

”ہاں بولو؟“

وہ چونکہ کام میں مصروف تھی جبھی کچن سے نکلے بغیر وہیں سے چیخی۔

”تمہارے ابا کا کوئی خط پتر یا ٹیلی فون نہیں آیا؟“

روبی نے بات کا آغاز ہی ایسے انداز میں کیا کہ وہ بے مائیگی اور سبکی کے احساس

سمیت کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی۔

"تمہیں کیا دلچسپی ہے اس بات میں؟"

اس کے سوال دہرانے پر دیا کو شدید غصہ آیا تھا۔ برہمی سے کہہ کر جھاڑو اٹھائی اور فرش دھونے لگی۔

"دادو نے مجھ سے خط لکھوایا تھا نا۔ اب تو پوسٹ کئے بھی اتنے دن ہو گئے"

روبی کے جواب پر وہ بھونچکی رہ گئی۔

"تم سے؟"

استعجاب آمیز انداز میں کہہ کر اس نے آنکھیں پھیلائیں تو روبی کو ہنسی آ گئی تھی۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ پہلی مرتبہ تھوڑی ہی لکھوایا۔ بیچاری تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔ سنو کیا کالج میں واقعی کوئی لفنگا تمہارے پیچھے لگ گیا تھا اور وہ گانے بھی گاتا ہے؟ ہائے کہیں وہ چارمنگ بوائے شاہ حسین تو نہیں؟"

روبی جتنی متجسس تھی اور جس قدر شوخی سے کھنک دار آواز میں بول رہی تھی۔ دیا کو اسی قدر گہرے صدمے نے آن لیا۔ اس کا مطلب تھا دادو نے روبی سے ہر بات کر دی تھی۔ سبکی کا احساس اتنا گہرا تھا کہ وہ جھاڑو وہیں پھینک کر اندر کمرے میں جا گھسی اور بہت دیر تک سسکتی رہی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ اس وقت ششدر رہ گئی تھی جب دادو نے بتایا کل اس کے بابا پاکستان پہنچ رہے ہیں۔

"تو بہت خوش بخت ہے میری بچی کہ تیرا باپ اتنے عرصے بعد تیری خاطر واپس آ رہا ہے"

دادو نے خوشی سے نہال ہوتے اسے لپٹا کر پیشانی چومی تھی مگر اس کے اندر کوئی جذبہ سر نہیں اٹھا سکا تھا اسے بچپن سے اپنے باپ سے بہت شکایتیں تھیں۔ یہ وہی شخص تھا جو بیوی کی موت پر اتنا بد دل ہوا تھا کہ محض چند دن کی دیا اور چھ سالہ مستقیم کو بوڑھی ماں کے حوالے کر کے خود اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود اس ان دیکھے شخص کے لیے کوئی حساس دل میں نہیں جگا سکی تھی مگر جب اگلے دن وہ آئے تب دیا نے اس بے حد گریس فل پرسنالٹی کے مالک شخص کو سرسری انداز میں دادو کے کہنے پر سلام کیا تھا مگر انہوں نے اس کے لیے اپنے بازو وا کر دیئے تھے وہ جھجکی تھی تب انہوں نے خود آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگایا اور اتنی محبت سے پیشانی بار بار چومی تھی کہ دیا ان کے والہانہ پن اور آنکھوں سے بکھرتے شفاف موتیوں کو دیکھتی گم صم رہ گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں میری بیٹی مجھ سے شاکی اور خفا ہے۔ میں گنہگار ہوں آپ کا سویٹ ہارٹ مگر اب معافی کا خواہش گار۔ جانے کیوں اپنے دکھ میں اتنا ڈوبا کہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہی بھلا بیٹھا! مجھے شاید معافی بھی نہیں ملنی چاہئے"

وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے تب دیا کے احساسات پر جمی برف جیسے تیز آنچ سے پگھل گئی تھی اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے چھوئے تھے پھر اپنے نرم ہاتھوں کی پوروں پر ان کے آنسو چن لیے تھے۔

"پلیز بابا جان! ایسے مت سوچیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے"

اور وہ اتنے خوش ہوئے تھے کہ اسے پھر خود سے لگا کر پیار کرنے لگے تھے۔ مستقیم جو ایئر پورٹ سے انہیں لے کر آیا تھا اور یقیناً ان سے یہ سارے جذباتی سین کر چکا تھا اب دیوار کے ساتھ لگا کھڑا مسکرا کر انہیں دیکھتے ہوئے گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

"اماں آپ نے بھائی جان اور آپا کو میرے آنے کا نہیں بتایا؟"

خاصی دیر بعد وہ اس جذباتی کیفیت سے نکلے تو دادو کو حیرانی سے مخاطب کیا تھا۔ جواب کھانا لگانے کی تیاری میں تھیں اس سوال پر گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔

"زہرہ تو آتی رہتی ہے کبھی کبھار مجھ سے ملنے وقت کہاں ہوتا ہے اس کے پاس، گھر کی، شوہر اور بچوں کی ذمہ داریاں ہی بہت ہیں۔ البتہ تمہارے بھائیوں کے پاس تمہاری طرح ہمارے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ارے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ہراساں ہو کر تمہیں خط لکھواتی۔ وہ تو چلو پھر دور کے تھے تم اور مستقیم تو اپنے تھے نا اس کے تمہیں پرواہ نہیں رہی تو پھر......"

وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ دیا کچھ خائف سی ہو گئی تھی مستقیم کو چونکتے دیکھ کر، اب کم از کم وہ مستقیم پر یہ فضول بات نہیں کھلتے دیکھ سکتی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کون سی پریشانی تھی آپ کو؟"

مستقیم نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ دیا کی توقع کے عین مطابق وہ پوری طرح الرٹ ہو چکا تھا۔

"کچھ نہیں ہے بھائی! آپ پلیز میرے ساتھ چلیں اندر"

دیا اتنی بے چین اور ہراساں ہوئی تھی کہ دادو کو تو آنکھوں میں خاموش رہنے کی التجا کی سو کی مستقیم کے پاس آ کر بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ مستقیم نے کچھ الجھ کر کچھ حیرانی سے اسے دیکھا اور جیسے فی الحال اس نے سر جھٹک کر پھر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بابا جان البتہ اپنا میل فون

نکالے بھائی بہنوں سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دیا کے گمان تک بھی نہیں تھا کہ بابا جان کے بلاوے پر وہ سب لوگ یوں بھاگے چلے آئیں گے۔ دونوں بڑے چچا۔ چچیاں اور پھپھو بھی، چچاؤں کے سب بچے بے حد مغرور تھے متکبرانہ تاثرات اور حقارت زدہ انداز میں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے، دیا کو وہ فیشن زدہ لوگ کچھ اتنے خاص نہیں بھائے تھے۔ البتہ پھپھو اپنی تمام تر نرم مزاجی اور سادہ لوحی کے باعث اسے اچھی لگی تھیں۔

ان کی صرف چھوٹی بیٹی زینب ہی ان کے ساتھ تھی۔ دیا کچن میں مصروف تھی جب پھپھو اس کے ہمراہ کچن میں آ گئی تھیں۔

''ارے پھپھو! آپ اندر چل کر بیٹھیں نا، چائے تو تیار ہی ہے میں لا رہی ہوں''

وہ انہیں دیکھ کر بوکھلائی تھی۔ پھپھو اپنے مخصوص نرم شفیق انداز میں مسکرا دیں۔

''زینی آپ کی ہیلپ کرا دے گی بیٹے! ماشاء اللہ اتنے لوگوں کے لیے چائے تیار کر رہی ہو آپ پھر کھانا بھی بنے گا مجھے بتاؤ میں سامان دیکھتی ہوں جو نہیں ہو گا منگوا لیتے ہیں مستقیم سے'' ان کے انداز میں اتنی اپنائیت تھی کہ دیا منع کرنے کا حوصلہ کر ہی نہیں سکی۔ پھپھو اور زینی نے وہیں اس کے ساتھ کچن میں چائے پی تھی اور کاموں میں اس کے ساتھ لگی رہی تھی۔

''دیا آپی یہ آپ انہیں دے آئیں کچھ سامان کی لسٹ ہے''

زینب نے ان اشیاء کی لسٹ تیار کی تھی جو کھانا بنانے کے لیے درکار تھا۔ سب مہمان دوپہر کا کھانا یہیں کھا رہے تھے اسی لحاظ سے اہتمام ہو رہا تھا تو ظاہر ہے اشیاء کی ضرورت تھی۔ دیا نے اس سے لسٹ لے لی تھی۔ پھر جب مستقیم چائے کے خالی برتن رکھنے اور اس کے بعد گوشت اور چاول وغیرہ کی تھیلیاں لے کر آیا تب بھی دیا نے بالخصوص ہر مرتبہ زینب کے گلابی چہرے پر شرم آگہیں سرخی کا پھیلاؤ اور حدت محسوس کی تو خوشگوار سے احساس میں گھر گئی تھی۔ کھانے کے دوران اس نے مستقیم کو بھی نوٹس کیا تھا مگر وہ ہمیشہ کی طرح نارمل اور بے نیاز تھا۔ حالانکہ زینب نے ایک دو بار اسے مخاطب کیا تھا مگر اس کا جواب دینے کا انداز وہی عام سا اور سرسری تھا جو اس کے علاوہ دیگر کزنز کے ساتھ اس کا رویہ تھا وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے دادو سے زینب کے متعلق بات کرنے کا ضرور سوچ لیا تھا۔ مگر دادو سے پہلے اسے مستقیم سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ کھانے کے ڈھیر سارے برتن دھونے میں مصروف تھی شام ڈھل رہی تھی اور مہمانوں میں سب سے پہلے واپس جانے والی پھپھو ہی تھیں۔ اندر مہمانوں کی محفل ہنوز جمی ہوئی تھی

اور چائے کا ایک اور دور چل رہا تھا جب کچھ دیر بعد مستقیم دھونے والے برتنوں کی ٹرے اٹھائے چلا آیا۔

''رہنے دیں بھائی میں کر لوں گی''

اسے پلیٹوں سے بچی کھچی چیزیں سمیٹ کر ایک لفافے میں ڈالتے دیکھا تو دیا نے ٹوکا تھا۔

''کیا کیا کرو گی تم اکیلی! آج تو ویسے بھی بہت تھک گئی ہو گی۔ بابا جان کو پتا نہیں کیا سوجھی لے کر پھر سے ساری پبلک کو جمع کر کے بیٹھ گئے''

وہ پتا نہیں کیوں اتنا کلس رہا تھا۔ دیا کو ہنسی آ گئی۔

''اپنی خیر منائیں، عین ممکن ہے پاپا نے آپ کے لیے کوئی لڑکی پسند کرنی ہو''

دیا نے اسے چھیڑا تھا مگر وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''کیوں اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں میں کوئی ایک تو اچھی ہو گی نا؟''

دیا نے اسے گھیرنا چاہا۔

''کوئی ایک بھی نہیں، مجھے معاف رکھو۔ ایسی فیشن زدہ چڑیلوں سے میں سات کوس دور بھاگتا ہوں۔''

''مگر پھپھو کی زینی تو ہرگز بھی ایسی نہیں ہے بھائی! وہ تو اتنی پیاری لگی مجھے''

''میں بھی ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے ڈیئر سسٹر کہ پھپھو جا چکی ہیں''

''میں جانتی ہوں مل کے گئی ہیں مجھ سے، یہ بتائیں زینب آپ کو بھی پسند ہے نا۔ دادو سے بات کروں؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا! میں نے یہ بات کب کہی؟''

وہ بے حد خفا نظر آنے لگا تو دیا ہرٹ ہو کر رہ گئی۔

''آپ کا مطلب ہے زینی آپ کو پسند نہیں؟''

''میں نے یہ بھی نہیں کہا۔ مگر اس لحاظ سے نہیں جیسے تم چاہتی ہو''

مستقیم زچ ہو کر رہ گیا تھا۔ دیا نے منہ پھلا کر اسے دیکھا۔

''مگر مجھے تو اسی طرح اچھی لگی ہے اور آئی تھینک دادو کو بھی۔ ہم وہیں آپ کی شادی کر دیں گے''

''پاگل ہو گئی ہو دیا؟ عمر دیکھی ہے اس کی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی ہو گی''

''تو کیا ہوا؟ میں بھی بیس سال کی ہوں۔ آپ مجھے بھی تو جلد از جلد سر سے اتار کر

پھینکنے کی خواہش کر رہے ہیں نا''

اس نے غصے سے کہہ کر ریک میں زور سے برتن پٹخے مستقیم نے تھم کر اسے بغور دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مچلتی نمی اس سے مخفی نہیں رہی تھی۔

''دیا کیا ہو گیا ہے گڑیا! کون کر رہا ہے زبردستی تمہارے ساتھ؟ اور پڑھائی بھی تم نے خود چھوڑی بغیر کوئی وجہ بتائے''

مستقیم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا وہ جواب میں کچھ کہے بغیر پلکیں جھپک جھپک کر آنسو اندر اتارتی رہی۔

''افوہ مان بھی جاؤ لڑکیوں کو منانے کا ہرگز بھی طریقہ نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو غصے میں آ کر ایک جھانپڑ لگا دوں''

وہ قطعی غیر سنجیدہ تھا۔ دیا نے پلکیں اٹھا کر اسے سنجیدگی سے دیکھا پھر خفگی سے بولی تھی۔

''اس طرح اپنی بیوی کو منائیے گا مجھے منانے کی ضرورت نہیں''

''اف پھر بیوی! آخر یہ کہاں سے اچانک ٹپک پڑی!''

وہ جھنجلایا اور دیا ہنسنے لگی تھی۔

''اتنی پیاری تو ہے وہ، آپ کو بھلا اعتراض کیوں ہے؟''

''دیا ہم اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟ وہ یکا یک بے حد سنجیدہ ہو گیا۔

''اگر میں کہوں نہیں تو؟''

دیا کو بھی غصہ چڑھ گیا تھا۔ نروٹھے پن سے بولی تھی مستقیم کے سپاٹ چہرے پر یکلخت سرد پن چھا گیا۔

''تو پھر میری بجائے ان دیواروں سے کرو یہ باتیں۔ میرے پاس فرصت نہیں ہے''

وہ اپنے ازلی نخوت زدہ بیگانے انداز میں کہتا پلٹ کر کچن سے نکل گیا۔ دیا ساکن کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ آج چاند کہاں سے نکل آیا۔ فرصت مل گئی جناب کو؟''

غلام حسین کو دیکھ کر نیہاں کو خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی تھی جبھی چہک کر بولی۔

''اگر تم طنز کر رہی ہو تو بے کار ہے''

غلام حسین چڑانے والے انداز میں کہتا صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

''آئی نو تم چکنے گھڑے ہو۔ بائی دا وے یہ اعزاز کس سلسلے میں بخشا ہے آج تم نے؟''

نیہاں نے اس کی شاندار پرسنالٹی پر توصیفی نگاہ ڈالی تھی۔

''ظہیر ماموں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے زینب نے بتایا تھا سو چلا آؤں۔ ادھر ہی جا رہا تھا کہ یہاں سے گزرتے سوچا آج فرصت ہے تم لوگوں سے بھی ہیلو ہائے کر لوں''

ریشمی بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے گراتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص لاپرواہ انداز میں کہا تھا۔ نیہاں کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ دیا کا دلکش اور غیر معمولی حسین چہرا لمحہ بھر کو اس کے تصور کے پردے پر لہرا کر اسے ڈسٹرب کر گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اب جبکہ دیا گھر پر موجود ہے غلام حسین وہاں جائے۔ اسے خدشہ تھا دیا کا بے تحاشا حسن غلام حسین کو اپنا اسیر نہ کر لے۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی ایسے خدشات اس کی جان کو ہر لمحہ چمٹے رہتے تھے۔ اپنی ہر کوشش کر کے بھی وہ غلام حسین کو اپنی طرف مائل کرنے میں بری طرح سے ناکام رہی تھی اس کے باوجود اس نے نئے سرے سے غلام حسین کو اپنے پاس روکنے اور مختلف حیلوں بہانوں سے وہاں جانے سے منع کیا مگر وہ اٹھ کر چلا گیا تو نیہاں پیچھے اپنے خدشات سمیت جلنے کڑھنے کو تنہا رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''کون آیا ہے بھائی؟''

مستقیم اسے چائے کا کہنے آیا تو دیا نے سوال کیا تھا۔

''زہرہ پھپھو کا بیٹا ہے غلام حسین! بابا جان سے ملنے آیا ہے مگر وہ تو گھر پر نہیں ہیں''

''تو ایسا کہیں زینی کا بھائی ہے۔ آپ چلیں میں دو منٹ میں چائے لا رہی ہوں''

دیا نے مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں پھر اسے چھیڑا مگر مستقیم اسے اسی سنجیدگی سمیت تادیبی نظروں سے گھورتا پلٹ کر چلا گیا تھا۔ دیا نے کہاں پرواہ کی تھی۔ ایک دم ہی اس کا موڈ خوشگوار ہوا تھا۔ چائے اس نے خوب دل لگا کر بنائی ساتھ اہتمام بھی اچھا خاصا کیا تھا اور ٹرے اٹھائے دادو کے کمرے کی جانب آ گئی۔ اسے پتا تھا مہمان مستقیم کے ساتھ وہیں براجمان ہو گا مگر دادو کا کمرا خالی تھا۔ اسے یاد آیا بابا جان دادو کو چیک اپ کے لیے لے کر گئے تھے۔ کل سے دادو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پلٹی اور بیٹھک کی سمت آ گئی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے ایک ہاتھ میں ٹرے سنبھال کر آہستگی سے دروازہ ناک کیا تھا پھر دروازے سے قدم اندر رکھا اور مسکراتے ہوئے خوشدلی سے سلام کیا۔ مستقیم کمرے میں نہیں تھا اور مہمان صاحب پشت پر ہاتھ باندھے رخ پھیرے دیوار گیر الماری میں بھی مستقیم کی ڈھیروں ڈھیر کتابوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔

برتنوں کی کھنک اور مہین سی سلام کی آواز پر وہ بے ساختہ پلٹا اور جیسے حیرت و غیر یقینی اور خوشی سے ساکن رہ گیا۔ یہ وہ چہرہ تھا جس نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا ڈالی تھی اور اس کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح کہاں کہاں نہیں بھٹکا تھا۔ ہاسٹل اور کالج کی انتظامیہ کے ترلے منتیں کر کے بھی وہ ان سے دیا کا ایڈریس لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ یہ ان کے رولز اینڈ ریگولیشنز کے سخت خلاف تھا اور اسے لگتا تھا جیسے دنیا اس کے لیے اندھیر ہوگئی ہو جب وہ مایوسی کی انتہاؤں کو چھونے جا رہا تھا کہ وہ اچانک غیر متوقع طور پر روبرو آ گئی تھی کس حوالے، کس رشتے کے ساتھ اس بات پر غور کرنے کی فرصت کہاں تھی۔ اس نے ٹرے رکھی اور مسکراتے ہوئے سیدھی ہوئی تھی مگر اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ جیسے پتھرا سی گئی پھر اس کے چہرے پر بلا کا خوف سہم اور وحشت یکبارگی بکھرتی چلی گئی تھی۔

''تت تم!!!''

اس کے ہونٹ کانپے اور رنگت بے تحاشہ سفید پڑ گئی۔ ایک چھناکا ہوا اور سحر ٹوٹ گیا۔ غلام حسین بھی جیسے اس ٹرانس اس تحیر سے نکل آیا تھا بے ساختہ اس کی جانب لپکا تو دیا لرز کر کئی قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''دیا! دیا! آپ!؟'' آئی کانٹ بلیواٹ! میں کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

وہ مسکرایا تھا پھر بے ساختہ ہنسا اس کی خوشی کے اظہار میں بھی عجیب سا پاگل پن چھلکتا تھا وہ اتنا حیران اور بیک وقت خوش تھا کہ اپنی کیفیت کا صحیح اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

''کیسے آئے ہو تم یہاں؟ بولو! کیوں آئے ہو''

دہشت سے پھٹی آنکھیں لیے وہ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں ہیجانی کیفیت میں چلائی۔

''آف کورس اپنے پیروں سے چل کر''

غلام حسین کے حواس اب بحال ہو چکے تھے جبھی اسے شوخی سوجھنے لگی وہ ظہیر ماموں کی بیٹی دیا ہے وہی دیا جس کا ذکر اس سے مما متعدد بار کر چکی ہیں یہ سوچ اسے ایک دم ریلیکس کر گئی تھی۔ جبکہ دیا خوف کے شدید احساس سمیت ہر لحظہ سرد پڑتی جا رہی تھی۔

''چلے جاؤ یہاں سے پلیز۔ ورنہ میں ابھی اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دوں گی جاؤ''

وہ حواس باختہ سی چند قدم آگے بڑھی اور غم و غصے اور ہیجانی کیفیت کے زیر اثر اسے زور سے دھکا دیا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مستقیم اپنے دھیان میں تولیے سے ہاتھ خشک کرتا اندر داخل ہوا تھا انہیں یوں ایک دوسرے کے مقابل دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ دیا کے تیور اور تاثرات نے

اسے سراپا سوال کر دیا تھا۔

''خیریت دیا! کیا ہوا؟''

تولیہ پھینک کر وہ لپک کر نزدیک آیا تھا۔ جبکہ دیا تو یوں مستقیم کو روبرو پا کر ہی جیسے اپنی روح پرواز کرتی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی ٹانگوں نے اس کے وجود کا بوجھ سہارنے سے انکار کیا تو وہیں ڈھے سی گئی۔ یعنی وہی ہو چکا تھا جس کا خدشہ اسے ہراساں کرتا رہا تھا۔ مستقیم سے یہ بات چھپانے کی اصل وجہ ہی یہی تھی۔ وہ اس کی اپنے معاملے میں جذباتیت سے آگاہ تھی۔ پھر اس کا غصہ کتنا تباہ کن تھا۔ اگر وہ بھڑ جاتا تو صورتحال کی سنگینی اور گھمبیرتا کا اندازہ کرنا محال تھا۔

''دیا گڑیا! کیا ہوا؟ آر یو او کے؟''

اسے یوں گرتے دیکھ کر مستقیم لپک کر اس کے نزدیک آیا اور اسے کاندھوں سے تھام لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ تشویش تھی۔ دیا کا دل خوف سے بند ہونے لگا۔ اس نے خائف سی نگاہ غلام حسین پر ڈالی جو ذرا فاصلے پر کھڑا اسی کی سمت متوجہ تھا۔

''آئی تھینک یہ مجھے پہچان نہیں پائی ہیں۔ یار مستقیم بتانا مجھے بالکل سچ کیا میری شکل کسی ڈاکو یا دہشت گرد سے ملتی ہے۔ جو مجھے دیکھتے ہی یہ اتنی خوفزدہ ہو گئیں''

اس کے برعکس وہ بے حد مطمئن اور ریلیکس نظر آ رہا تھا۔ مستقیم جو دیا کو سہارا دے کر کرسی پر بیٹھا رہا تھا اس بات پر محظوظ ہو کر ہنس پڑا پھر یونہی ہنستے ہوئے جواباً بولا تھا۔

''یہ بات تم مجھ سے نہیں آئینے سے پوچھنا۔ اچھا موقع ہے ابھی سے غور کر لو حقیقت پر''

''یار اس بات کو چھوڑو۔ ان سے میرا انٹروڈکشن تو کراؤ پلیز!''

غلام حسین جو دیا کی گاہے بگاہے خود پر اٹھتی سہمی ہوئی نظروں کو محسوس کر چکا تھا مسکرا کر شوخی سے بولا تھا جبکہ دیا تو اسے مستقیم کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بات چیت کرتے دیکھ کر ہی گنگ ہونے لگی تھی۔

''ارے ہاں مجھے خیال ہی نہ رہا کہ دیا تم سے متعارف نہیں ہے۔ ایکچوئلی یہ شروع سے ہاسٹل میں رہتی آئی ہے نا تو بہت کم جانتی ہے رشتہ داروں کو، دیا یہ غلام حسین ہے زہرہ پھپھو کا بیٹا اور تمہاری بے حد فیورٹ ڈیئر زینی کا بڑا بھائی!'' اب مجھے بتاؤ تمہیں اچانک ہوا کیا؟''

تعارف کے آخری مرحلے میں مستقیم کسی قدر شرارتی ہو گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو لازماً وہ اس شرارت بھری شوخی سے سو مطلب اخذ کر کے اس پر گرفت کرتی مگر ابھی تو وہ انکشافات کی زد پر حیران اور ششدر بیٹھی تھی۔ پھپھو اور زینب جیسی سادہ اور مذہبی گھرانے کی خواتین سے ملنے کے

بعد اس کے سان وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ غلام حسین یعنی سنگر حسین شاہ کا تعلق اسی صوم و صلواۃ کے پابند گھرانے سے ہوسکتا ہے۔ دادو سے چند ایک مرتبہ اس نے سنا بھی تھا کہ زہرہ کا بڑا بیٹا گانے بجانے والے کاموں کی طرف نکل گیا ہے مگر یہ بات تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ یہ حسین شاہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کی آنکھیں پتا نہیں کس کس احساس کے تحت بھیگتی چلی گئی تھیں۔

''بھائی مجھے اندر چھوڑ آئیں پلیز!''

تمام تر ہمتیں مجتمع کرنے کے باوجود جب وہ اٹھنے سے قاصر رہی تو مستقیم کو مخاطب کیا تھا کہ مستقیم کی موجودگی میں اسے غلام حسین کی بے باک نظروں کا سامنا از حد دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

''دیا! کیا ہوگیا ہے بیٹا! کیا بہت زیادہ طبیعت خراب ہے؟''

مستقیم اس کی سمت متوجہ ہوا تو اس کی سرسوں کی مانند پیلی پڑ جانے والی رنگت کو دیکھ کر بے طرح پریشان ہوا تھا۔

''اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں''

اب کے غلام حسین کے چہرے پر آن ٹھہرنے والی مستقل مسکان بھی سمٹی تھی اور وہ چائے کا مگ سائیڈ پر رکھ کر ان کی سمت متفکرانہ نظروں سے تکنے لگا۔

''بھائی مجھے کمرے میں جانا ہے بس''

دیا سختی سے بولی تھی اور پھر اپنی ہمتیں اکٹھی کر کے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مستقیم اسے سہارا دے کر اندر لایا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ خوفزدہ اور متفکر جبکہ کچھ دیر پہلے تو بالکل ٹھیک تھیں''، مستقیم نے اسے اس کے بستر پر بٹھانے کے بعد لحاف اس کے اوپر پھیلاتے ہوئے ایک بار پھر الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ دیا نے جھکے سر کو کچھ اور جھکا کر اپنے تاثرات اس سے چھپانے کی سعی کی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بھائی رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ آرام کروں گی تو ٹھیک ہوجائے گا سب، ڈونٹ وری!''

اسی قسم کی کچھ اور باتوں سے مستقیم کی تسلی کرانے کے بعد وہ مستقیم کے کمرے سے چلے جانے کے بعد کچھ دیر ساکن بیٹھی رہ گئی تھی۔ غلام حسین کا یہ حوالہ صحیح معنوں میں اسے بے جان کر گیا تھا۔ اس رشتہ داری کی بنا پر بار بار ہونے والے سامنے کی وہ خود کو متحمل نہیں پاتی تھی جبکہ وہ اسے دل سے ناپسند بھی کرتی تھی۔ اس کا دل عجیب سے خدشات کے سنگ جانے کیوں سہما جا رہا

تھا۔ غلام حسین کی آنکھوں کی جنوں خیزی اسے خائف کر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں انجانے وسوسوں کے ہمراہ بھیگتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

لکھا گیا ہے جو کچھ پڑھا ہے
وہ کس کے لیے تھا کہاں سے پوچھوں!
مجھے عقیدوں کے خواب دے کر کہا گیا ان میں روشنی ہے
چمکتی قدروں کی چھب دکھا کر مجھے بتایا یہ زندگی ہے
سکھائے مجھ کو کمال ایسے
یقین نہ لائیں سکھانے والے اگر انہی کو میں جا سناؤں
میں کہنہ آنکھوں کی دسترس میں نئے مناظر کہاں سے لاؤں؟
کہاں میں جنسِ کمال رکھوں
خیال تازہ کہاں سجاؤں؟
زمین پیروں تلے نہیں ہے تو کیسے تاروں کی سمت جاؤں
پرانی قدریں جو محترم ہیں
انہیں سنبھالوں یا آنے والے نئے عقیدوں کا بھید پاؤں
وہ سب عقیدے، تمام قدریں، خیال سارے
جو مجھ کو سکے بنا کر بخشے گئے
میرے حواسِ خمسہ سے معتبر تھے
جب ان کو رہبر بنا کے نکلا
تو میں نے دیکھا
میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
میں ایسے بازار میں کھڑا ہوں
جہاں کرنسی بدل چکی ہے

ہنستے بستے گھر اجاڑنے والوں اور تتلی کے پر نوچ کر خوش ہونے والے انسان سے میرا سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔

باب 3

اسے شدتوں سے ابن زید کی وہ بات یاد آئی تھی جو وہ اکثر حالات سے دلبرداشتہ ہو کر کہا کرتے تھے اس کی نم آنکھیں کچھ اور بھی بھیگیں اور نگاہوں میں پھر وہ منظر گھومنے لگا۔ ناتواں سا وجود اپنی جان سے کہیں بڑھ کر ستم سہتا ہوا۔ کسی ماں کا لختِ جگر تھا تو کسی بہن کا راج دلارا بھائی! کس بے کسی کی موت رینجرز کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اپنے ہی ملک کے محافظوں کے ہاتھوں۔ صد افسوس

مٹی پر تڑپتا رہا غریب کا لاشہ
اور محوِ تماشا کھڑی رینجرز رہی ساری
لگتا ہے کہ وہ مجمعٔ اسلام نہیں تھا
مجمعٔ میں کھڑا کوئی مسلمان نہیں تھا
مجرم ہی سہی صاحبِ ایمان تھا آخر
کافر بھی ہو پھر بھی وہ انسان تھا آخر
عرشِ بریں لرزا ہے کوئی شور بپا ہے
مولا کی عدالت میں کسی ماں کی صدا ہے
رو رو کر فلک کہتا رہا اہلِ زمیں کو
یہ ظلم گوارا نہیں مدینے کے امیں ﷺ کو

اس نے آہستگی سے اخبار اکٹھا کر کے رکھ دیا۔ اور سر تکیئے پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

وہ بہت دیر سے گھر لوٹا تھا تو بہت تھکا ہوا تھا یہ تھکن جسمانی نہیں روحانی تھی۔ اماں اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھیں تو وہ اسی یاسیت کے حصار میں تھا۔ انہوں نے ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے انرجی سیور کی روشنی میں اسے بغور دیکھا۔

''کھانا کھا لو سکندر''

ان کی آواز پر وہ چونکا تھا پھر آہستگی سے سیدھا ہو بیٹھا! بھوک نہ ہونے کے باوجود اس

نے نوالہ توڑ لیا تھا۔ اماں سے اس کی بے دلی مخفی نہیں رہ سکی۔

''کیوں پریشان ہو؟''

گو کہ ان کے لیے اس کی یاسیت اور بے دلی نئی بات نہ تھی مگر ماں تھیں ہر بار سوال کرنے سے خود کو روک نہیں پاتی تھیں۔

''کچھ نہیں اماں بس ایسے ہی''

وہ جانتا تھا اماں نیوز نہیں سنتیں اس لیے وہ سرفراز کے واقعہ سے لاعلم ہوں گی اور تفصیل میں جانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ پھر انہوں نے سن کر متاسف ہونے کے سوا کرنا بھی کیا تھا۔ پتا نہیں پاکستانی عوام کب تک غفلت اور بے حسی کے لبادے کو اتار کر نہیں پھینکیں گے حالانکہ پانی تو سر سے اوپر ہوا ہی چاہتا تھا۔ وہ حسبِ عادت پھر سے کڑھنے کا آغاز کر چکا تھا۔

''گئے تھے تم خالہ بی کی طرف؟ کیسی ہیں وہ اور اسوہ؟''

انہیں اٹھتے اٹھتے یاد آیا تو رک کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

''میں ہر روز تھوڑی جاتا ہوں اماں! وہ تو جب ابنِ زید سے ملنا ہو یا پھر کوئی ضروری ڈسکشن ہو تو چلا جاتا ہوں''

اس نے پتا نہیں کیوں وضاحت دی۔ اماں مسکرا دی تھیں۔ اتنی ہی رازداری سے جتنی اس نے برتی تھی۔ بھلا کیا وہ نہیں جانتی تھیں اس کے بھاگ بھاگ کر وہاں جانے کا مقصد...... ان کے اندر ایک انوکھی سی تھکن اتر آئی۔

''شاید قسمت کو یہ ملاپ منظور نہیں تھا۔ ان کی اور ان کی خالہ بی کی حیثیت میں بہت فرق تھا۔ اسوہ کے خوابوں کی تعبیر سکندر جیسا معمولی صحافی تھوڑا ہی ہو سکتا تھا۔ وہ دل پر بوجھ لیے کمرے سے گئی تھیں۔ سکندر چند نوالے لینے کے بعد ٹرے سرکا کے پھر لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

''بابا جان آپ کی چائے!''

دیا نے اندر آ کر ٹرے ان کے سامنے کی جس میں بھاپ اڑاتا چائے کا مگ موجود تھا۔

''تھینکس بیٹا جانی!''

وہ صبح کا اخبار دیکھنے میں مصروف تھے۔ اس کے متوجہ کرنے پر مسکرائے اور پر شفقت انداز میں اسے دیکھ کر مگ اٹھا لیا۔

''تم نے جواب نہیں دیا ظہیر!''

دادو نے ان کی بٹی ہوئی توجہ کو پھر اپنی سمت مبذول کرایا۔

''کس بات کا اماں؟''

انہوں نے اخبار بیڈ پر رکھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا۔ دیا نے آگے بڑھ کر اخبار جوان کے پیروں کے برابر آرہا تھا اٹھا کر تکیئے پر رکھ دیا۔ ظہیر کی نگاہوں میں اس کا یہ اقدام آیا تو انہوں نے کچھ حیرانی میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا تھا۔ گویا وجہ دریافت کرنا چاہی ہو اور وہ مسکرا دی تھی۔

''جواب ذرا تفصیلی ہے بابا جان آپ دادو سے بات کرلیں پہلے''

وہ خوش دلی سے کہہ رہی تھی تو اس کی وجہ ان گزرنے والے چند دنوں میں ہی ان کے بے پایاں چاہت اور شفقت تھی۔ انہوں نے گویا گزشتہ بیس سالوں کا ازالہ کرڈالا تھا اتنی محبت اور توجہ سے نواز کر۔

''شیور بیٹے کیوں نہیں''

انہوں نے جواباً اسے تسلی دی پھر دادو کی سمت متوجہ ہو گئے تھے جتنی دیر وہ دادو سے گفتگو میں مصروف رہے تھے دیا انہیں دیکھتی رہی تھی اس کی ماں سے ان کی محبت کی شادی تھی بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے مگر ضدی بالکل نہیں تھے۔ والدین کی محبت کا فائدہ اٹھانے کی انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ حالانکہ ان کی فیملی کے حساب سے زرینہ (اس کی امی) کچھ بھی نہیں تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا ظہیر کو سانولے رنگ کی معمولی نقوش کی حامل زرینہ کی وہ معصومیت اور ساحر آنکھیں کچھ اتنی بھائی تھیں کہ انہیں پانے کو مچل گئے تھے مگر یہ خوبصورت رفاقت زیادہ عرصہ نہیں چل سکی تھی اور دیا کی پیدائش پر کسی اندرونی پیچیدگی کے باعث زرینہ دورانِ ڈیلوری اپنے خالق حقیقی سے جاملی تھیں۔ ظہیر کے لیے یہ صدمہ جانکاہ ثابت ہوا وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ شوہر تو پہلے ہی وفات پاچکے تھے کاروبار سارا بیٹوں کے ہاتھوں میں تھا جن کی بیویوں سے دادو کی بہت کم بنتی تھی۔ دنیا کی دوڑ میں ان کے مقابل چلنے کی چاہ میں مبتلا ان کے خیال میں ان کی ساری اولادیں گمراہی میں مبتلا ہو چکی تھیں سوائے زہرہ کے کہ اس کی شادی ہی ایسے مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی کہ انہوں نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا ورنہ شادی سے قبل زہرہ بھی فیشن کی ماری ہوئی تھیں وہ تو بس انہیں عبدالعلی سے محبت ہی کچھ ایسی طوفانی قسم کی ہوئی تھی کہ ان کی خاطر ہر شے سے دستبردار ہوتی چلی گئی تھیں۔ عبدالعلی بے حد خوبرو تھے اور حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ نعت خواں بھی تھے۔ دور کی رشتہ داری

تھی۔ زہرہ سے ملاقات اتفاقی تھی جو دھواں دھار عشق کی صورت زہرہ سے چمٹ گئی اور زہرہ نے خود منہ سے کہہ کر عبدالعلی سے شادی کرلی تھی۔ دادو کا تو خیال تھا زہرہ کو اس ذریعے ہدایت ملنا تھی بس مگر جب سے زہرہ کے بیٹے غلام حسین کا شوبز میں جانے کا سنا تھا ان کی یہ خوشی پھر سے تاسف میں بدلنے لگی تھی۔ یہ ساری باتیں وقتاً فوقتاً اسے دادو سے پتا چلتی رہی تھیں۔ اس کی طرح خود دادو کی بھی یہی خواہش تھی کہ زینب کو مستقیم سے منسوب کردیا جائے مگر مستقیم ان کے ہتھے ہی نہ چڑھتا تھا اور جب سے دیا کو غلام حسین کے متعلق آگاہی ملی تھی وہ اس معاملے میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ زینب کا مستقیم سے تعلق جڑنے کا مطلب غلام حسین سے بار بار کا سامنا تھا جو اسے ہرگز بھی گوارا نہیں تھا۔ مستقیم کو زینب جیسی اور لڑکیاں بھی مل سکتی تھیں۔

''جی بیٹے کچھ کہنے والی تھیں آپ؟''

بابا جان کی آواز پر وہ اپنی سوچوں سے چونکی تھی اور خود کو سنبھال کر آہستگی سے مسکرا دی۔

''اس بات کا جواب اس واقعہ میں موجود ہوگا بابا جان جو میں آپ کو سنانے جارہی ہوں''

''گویا ہماری جینئس بیٹی اپنے بابا جان کی ذہنی صلاحیت کی آزمائش چاہتی ہے''

ان کی شرارت بھری مسکان پر وہ بری طرح جھینپی۔

''ایسا نہیں ہے بابا جان! آپ سنیں تو''

تب بابا نہ صرف سنجیدہ ہوئے بلکہ ہمہ تن گوش بھی ہو گئے تھے۔

''کسی ملک کا ایک بادشاہ اپنی سخاوت کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دربار میں ایک فقیر آیا بادشاہ کی سخاوت کا حوالہ دے کر کچھ مانگا۔ بادشاہ نے خزانچی کو اسے انعام و اکرام سے نوازنے کا کہا۔ جس وقت فقیر سکے اپنی جیب میں منتقل کر رہا تھا ایک سکہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور پھسلتا ہوا دور جانے لگا۔ فقیر نے سرعت سے لپکتے ہوئے وہ سکہ اٹھایا اور اسے بھی اپنے چغے کی جیب میں رکھ لیا۔ ملکہ نے بھی درباریوں کے ساتھ اس منظر کو دیکھا تھا فقیر کی اس حرکت پر گرفت کرتے ہوئے بادشاہ سے بولی۔

اتنا انعام اکرام لینے کے باوجود فقیر نے اپنی اوقات ایک سکے سے ظاہر کردی (یعنی ایک سکہ بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا)

چونکہ ملکہ کا انداز بھڑکانے والا تھا جبھی بادشاہ مشتعل ہو گیا۔ فقیر نے بادشاہ کے بدلنے والے تاثرات دیکھے تھے اور رسانیت سے جواباً بولا تھا۔

بادشاہ سلامت یہ کمینگی نہیں محبت کا ادنیٰ سا مظاہرہ تھا۔ اس سکے پر آپ کا نام کندہ

ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ آپ کے نام کی اس انداز میں بے حرمتی ہو''

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر گہرا سانس بھر کے بولی تھی۔

ہمیں یہ واقعہ فورتھ کلاس میں ہماری ٹیچر نے سنایا تھا اور مزید کہا تھا کہ اگر وہ فقیر بادشاہ کے نام کی قدر کو پہچان کر عزت دیتا ہے توقیر کرتا ہے اور مزید انعام و اکرام کا حقدار ٹھہرتا ہے تو ہم پر اس مالک حقیقی سچے بادشاہ کے نام کی توقیر لازم و ملزوم نہیں ہو جاتی۔ اس اخبار میں جگہ جگہ اللہ کا نام اور صفاتی نام درج ہیں۔ اخبار میں نے کیوں اٹھایا کیا اب بھی بتانے کی ضرورت ہے؟''

مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے اس نے کسی قدر سنجیدگی سے انہیں دیکھا تھا۔ اور بابا جان جو انہماک اور دلچسپی سے اسے سن رہے تھے بے ساختہ مسکرا دیئے۔

''الحمدللہ'' مجھے فخر ہے بیٹے آپ پر۔ اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری بیٹی کو اتنی اعلیٰ سوچ اور سمجھ عطا فرمائی ہے خالی خولی علم کو حاصل کر لینا اہم نہیں ہوتا۔ علم کو عمل کا ذریعہ بنانا کمال ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے'' وہ اتنے خوش ہوئے تھے کہ اٹھ کر اس کی پیشانی چوم کر باقاعدہ دعاؤں سے نوازتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

رات کو وہ بہت تاخیر سے گھر لوٹا تو خلافِ عادت کسی قدر مسرور تھا۔ خاموش رات کے سینے پر اس کی بائیک کی آواز کا ارتعاش پیدا ہوا تھا اور اس کی منتظر ماں نے آگے بڑھ کر پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا کہ وہ تو اس کی آہٹوں سے بھی اس کی آمد پہچان لیا کرتی تھی۔ سکندر نے بائیک ڈیوڑھی میں کھڑی کی اور ماں کو سلام کرتا ہوا سیڑھیوں کے سامنے لگے واش بیسن کے سامنے آن رکا۔ انرجی سیور کی روشنی میں بیسن کا ہلکا نیلا آئینہ اس کے سانولے چہرے پر ٹھہری دن بھر کی تھکن بہت واضح کر کے دکھانے لگا۔ اس نے بڑھی ہوئی شیو کو بے وجہ کھجایا اور نل کھول کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔

''کیا پکا ہے اماں؟''

صحن میں بندھی رسی سے تولیہ کھینچ کر اتارنے کے بعد چہرہ تھپک کر صاف کرتا وہ ماں کے ساتھ ہی برآمدے میں بچھے تخت پر آن بیٹھا۔ باورچی خانے میں برتنوں کی کھنک سن کر اس نے جان لیا تھا زارا وہیں ہے۔

''کریلے گوشت، کدو کا رائتہ۔ سلاد اور نمکین لسی بنائی ہے''

ماں نے من پسند مینیو بتایا تو اس کی بھوک ایک دم سے چمک اٹھی تھی۔

''آپ کے ہاتھ کے کریلے تو اسوہ کو بھی بہت پسند ہیں اماں! ڈونگے میں الگ سے نکال کر رکھ دینا کل میں اسے جاتے ہوئے دے جاؤں گا''

اسے فی الفور اسوہ کی یاد ستائی تھی اور کچن سے کھانے کی ٹرے سجا کر نکلتی زارا کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے گو کہ اس نے کبھی بھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی وہ جان گئی تھی سکندر کے نزدیک اسوہ کی حیثیت اور اہمیت کیا تھی۔

''کیوں نہیں بیٹا! مجھے یاد تھا بلکہ میں تو پہلے ہی نکال کر رکھ چکی ہوں۔ سوچا تھا کل میں اور زارا جا کر مل بھی آئیں گے خالہ بی سے اور اسوہ کو کریلے بھی دے آئیں گے۔ خیر ہم پھر کسی اور دن چلے جائیں گے اماں نے جواب دیا تھا اور خود عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے اٹھ گئیں۔ زارا کا دل بجھ سا گیا تھا۔ سکندر نے مروتاً بھی انکار نہیں کیا تھا کہ وہ لوگ چلیں جائیں۔ یعنی اتنی بے چینی اور شوق تھا اسے وہاں جانے کا حالانکہ بہانے کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی''

''آپ چائے پئیں گے تو بنا دوں''

وہ کھانا کھانے میں مصروف تھا اسے یکسر نظر انداز کیے۔ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولی تو لہجہ باقاعدہ دلگیر تھا۔ سکندر نے سرسری نگاہ سبز دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کے سلونے چہرے پر ڈالی تھی اور سر کو اثبات میں جنبش دے دی۔

''بہت اسٹرانگ بنانا زارا مجھے رات کو دیر تک جاگ کر کام کرنا ہے''

زارا نے محض سر ہلایا تھا پھر آہستگی سے پلٹ گئی۔ سکندر کی سوچتی نگاہیں اس کی پشت پر لہراتی لانبی موٹی سی چوٹی پر ٹھہر گئیں۔

''اماں یہ زارا کتنی بڑی ہو گئی ہے نا۔ اس کی شادی وادی کا بھی سوچیں اب''

اماں وضو کر کے آئیں تو وہ اسی پر سوچ انداز میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔ اماں نے جائے نماز قبلہ رخ بچھاتے ایک نظر بیٹے کی بے نیازی کو دیکھا تھا اور خاموش رہیں۔

''اس کی شادی کریں اماں تاکہ میں بھی اپنے لیے کچھ سوچوں۔ جس راہ کا مسافر ہے نا آپ کا بیٹا وہاں ہر قدم پر موت بکھری ہوئی ہے۔ کیا پتا کہاں زندگی دغا دے جائے۔ میں چاہتا ہوں میں اگر نہ بھی رہوں تو میری نشانیاں میرے دو چار بچے تو ہوں آپ کو میری یاد......''

گو کہ وہ مذاق کر رہا تھا اس کے باوجود اماں نے بے ساختہ تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں سمیت بے حد خفگی سے اسے دیکھنے لگیں۔

''اگر تو نے دوبارہ زبان سے ایسی بات نکالی نا سکندر تو ماں کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا

یاد رکھنا' وہ بے ساختہ رو پڑی تھیں۔ سکندر کو گویا لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ چھوٹا سا تھا جب اس کا باپ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ مگر اماں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ پھر دیور کا گھر ساتھ تو تھا۔ جس کے گھر کوئی اور نہیں اپنی بہن ہی بیاہ کر آئی تھی۔ خدا نے جینے کا آسرا بنائے رکھا تھا۔ مگر دس سال بعد جب وہ بھی چھ سالہ زارا کو روتا چھوڑ کر ایک حادثے میں دونوں ختم ہو گئے۔ تب صحیح معنوں میں اماں کی دنیا اندھیر ہوئی تھی۔ اگر دونوں بچوں اور خالہ بی کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ خود بھی رو دھو کے کہیں مرکھپ جاتیں مگر خدا اپنے بندوں کا ہمیشہ سب سے بڑا اور مضبوط سہارا بنا رہتا ہے اور کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ سکندر کے لیے خاص طور پر وہ بہت جذباتی تھیں۔ اس کی خواہش اور خوشی کو بے حد اہمیت دیا کرتیں۔ جبھی زارا کے لیے اپنی خواہش اس پر کبھی ظاہر نہیں کر سکی تھیں کہ اس کی فرمانبرداری کو جانتی تھیں وہ ان کی خاطر شادی تو زارا سے کر لیتا مگر وہ دلی خوشی نہیں پا سکتا تھا جو اسوہ کے ملنے پر اسے نصیب ہو سکتی تھی۔ اپنی حیثیت جانتی تھیں پھر بھی وہ خدا سے اپنے بیٹے کی دلی مراد ملنے کی دعا مانگے جاتیں کہ جس دربار سے انہوں نے لو لگائی تھی وہاں ناممکن تو کچھ نہیں تھا۔'

''اماں مجھے ابنِ زید بہت اچھے لگتے ہیں اگر زارا کی شادی ان سے ہو جائے تو کتنا اچھا ہو'

اماں کا دھیان بٹانے کو اس نے ایک انوکھی سوچ ان کے سامنے رکھی تو اماں تو حیران ہوئی ہی تھیں کچن میں چولہے کے آگے کھڑی چائے چھان کر مگ میں نکالتی زارا کا ہاتھ کچھ اس طرح سے بہکا کہ چائے چھلک کر اس کے ہاتھ کو جھلسا گئی۔ ایک کراہ اس کے ہونٹوں سے آزاد ہوئی اور شدتِ ضبط کی کوشش کے باوجود آنکھیں چھلک گئیں۔

''پاگل ہو گیا ہے تو تو سکندر۔ ابنِ زید تو گویا کوئی شہزادہ ہے۔ کہاں ہم غریب لوگ!''

اماں نے ایک آہ بھری تھی۔

''مگر اماں ان کی ایج بھی تو اچھی خاصی ہے۔ پتا نہیں شادی کیوں نہیں کرتے''

''پتر اسے لڑکیوں کی اب بھی کیا کمی ہے بھلا؟ ہم بھلا کیوں اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھیں''

''اُفوہ اماں! ہم بھی تو اسی گھر سے لڑکی لائیں گے نا''

وہ بے طرح جھنجلا گیا۔ جانے کیوں۔

''مگر ابنِ زید اس گھر کا لڑکا نہیں ہے واضح رہے۔''

اماں نے کچھ جتلایا اور جائے نماز پر کھڑی ہو کر نیت باندھ لی تھی۔ جس وقت زارا

چائے لے کر آئی سکندر کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگ اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زارا مضطرب بے چین وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

قسم لے لو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو
کسی کو ہم نے چاہا ہو، کسی کو ہم نے سوچا ہو
کسی کی آرزو کی ہو
کسی کی جستجو کی ہو
کسی کی راہ دیکھی ہو کسی کا قرب مانگا ہو
کسی کو ساتھ رکھا ہو، کسی سے آس رکھی ہو
کوئی امید باندھی ہو
کوئی دل میں اتارا ہو
کوئی تم سے بھی پیارا ہو، کوئی دل میں بسایا ہو
کوئی اپنا بنایا ہو
کوئی روٹھا ہو تو ہم نے اسے رو رو منایا ہو
دسمبر کی حسین رُت میں کسی کا ہجر جھیلا ہو
کسی کی یاد کا موسم میرے آنگن میں کھیلا ہوا
کسی سے بات کرنی ہو، کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کسی کی بے وفائی پر کبھی یہ نین برسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے دکھ میں نہ روئے ہوں
قسم لے لو تمہارے بعد ہم اک پل بھی سوئے ہوں
قسم لے لو کبھی جگنو، کبھی تارہ، کبھی ماہتاب دیکھا ہو
قسم لے لو تمہارے بعد کسی کا خواب دیکھا ہو

اس نے مسکراہٹ دبائے یہ طویل نظم ٹائپ کی نیچے اپنا نام لکھا اور دیا کے نمبر پر سینڈ کر دیا تھا۔ مستقیم کے موبائل سے دیا کا نمبر حاصل کرنا اس کے لیے قطعی مشکل مرحلہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے سیل فون رکھا اور اپنے بستر پر دراز ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔ جب تک زہرہ اندر آئیں وہ ان گنت سگریٹ پھونک چکا تھا۔ کمرے کی فضا سگریٹ کی بو اور دھوئیں سے

بوجھل تھی۔انہوں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر بند کھڑکیاں کھولنے لگیں۔

''خیریت غلام حسین! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

وہ بہت کم گھر پر نظر آیا کرتا تھا اور جب وہ گھر پر ہوتا وہ زیادہ تر اسی کے ارد گرد پھرا کرتی تھیں انہیں اولاد میں بڑے بیٹے سے فطری طور پر بے تحاشا محبت اور لگاؤ تھا۔

''مجھے شادی کرنا ہے مما!''

سگریٹ ایش ٹرے میں اچھال کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اس کا انداز اتنا سرسری تھا جیسے معمول کی کوئی بات کہہ دی جائے۔ وہ ایسا ہی تھا اپنا ہر فیصلہ خود سے کرنے والا اور اپنی من مانی چلانے والا وہ عادی تھیں اس کی فطرت کی مگر اس پل جانے کیوں اس کی بات سن کر خائف سی ہو گئیں۔ جس شعبے میں تھا وہ انہیں اکثر دھڑکا لگا رہتا کسی اداکارہ یا گلوکارہ کو اٹھا کر ان کی بہو نہ بنا دے۔ عبدالعلی کو پھر شاید سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہ رہتا۔

''شادی کرنی ہے۔ کس سے؟''

وہ جتنی خائف نظر آنے لگی تھیں غلام حسین کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ اس نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے پریشان نظر آتی ماں کو لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔

''آپ کے بھائی کی بیٹی دیا ظہیر سے''

دھواں اڑاتے ہوئے وہ پھر سے بے نیاز نظر آنے لگا تھا۔ جبکہ زہرہ اس قدر متحیر سی اسے تکنے لگی تھیں۔

''دیا سے؟ تم نے دیکھا اسے؟ ملے؟''

وہ ایک دم پرجوش ہوئیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

''میری جان یہ تو میری اپنی بھی شدید خواہش تھی قسم سے۔ مگر آپ کی پسند سے آگاہ نہیں تھی جبھی......''

''چلیں اب تو آگاہ ہوگئی ہیں نا۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اسے یہاں لے آئیں''

''اتنی بے چینی ہے؟''

انہوں نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور دانستہ چھیڑا۔

''آپ کی سوچوں سے کہیں بڑھ کر۔ جبھی کہہ رہا ہوں نا جتنی جلدی ممکن ہو سکے''

وہ اب کے آہستگی سے مسکرایا تو زہرہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

☆☆☆

شاہ ہاؤس میں یہ بمباسٹک نیوز بہت شاک اور حیرت و ناگواری کے ملے جلے تاثرات سمیت سنی گئی تھی۔ اصل جگہ پہنچنے سے قبل یہ خبر یہاں پہنچی تھی۔ غلام حسین اس خاندان کا وہ لڑکا تھا جس سے ہر لڑکی شادی کی خواہاں تھی۔ وہ تھا ہی ایسا شاندار اور بے مثال وجاہت و خوبروئی کا مالک اس پر اس کی شہرت سونے پر سہاگہ تھی۔ گلیمرس کے پیچھے بھاگنے والی ہر لڑکی غلام حسین جیسے سیلبریٹی کو پانے کی تمنائی دل و جان سے تھی۔ پورے خاندان میں گویا حسد و رقابت بھری کھلبلی مچ گئی تھی۔ بھلا دیا جیسی لڑکی تو ان طرحدار حسین اور دلکش لڑکیوں کے مقابلے میں کیونکر یہ بازی جیت گئی تھی جس نے دادو کے ساتھ ہمیشہ گھٹے ہوئے ماحول میں سانس لی تھی تمبو نما چادر میں لپٹی اعتماد سے عاری لڑکی جو باپ کے لوٹ کر آنے سے حیثیت میں تو مضبوط پھر بھی ہوگئی تھی مگر شخصیت اور اعتماد کے لحاظ سے غلام حسین کے پاسنگ بھی نہیں تھی اور یہی بات اس خاندان کی ہر جوان لڑکی کی ماں نے سوچی تھی۔ پھر نیہاں تھی جس کا شروع سے ہی رجحان غلام حسین کی طرف تھا۔ طرحدار اور بے حد پر اعتماد وہ اپنے تئیں غلام حسین کو اپنی ملکیت سمجھتی تھی مگر غلام حسین کی پسند سے آگاہ ہونے کے بعد سب سے زیادہ تاؤ بھی اسی کو چڑھا تھا اور وہ دیا کا دماغ ٹھکانے لگانے کے ارادے سے اس کے گھر چلی آئی تھی۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ ظہیر صاحب نے کھولا تھا۔

''اسلام وعلیکم چاچو! دیا ہے؟''

وہ انہیں روبرو پا کر ذرا خائف ہو کر بولی۔ ان کی شخصیت ہی ایسی پروقار تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح ان کے منہ کو نہیں آسکتی تھی۔

''دیا تو گھر پر نہیں ہے بیٹے! ذرا مارکیٹ تک گئی ہے اپنی کچھ کتابیں لینے۔ آپ اندر آجاؤ'' انہوں نے سامنے سے ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا تو نیہاں کچھ سوچتی ہوئی اندر چلی آئی تھی۔ اور آدھا گھنٹہ بیٹھ کر انتظار کرتے وہ سخت اکتا چکی تھی مگر دیا نہیں آئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ آتی غلام حسین وہاں چلا آیا تھا اور نیہاں اپنی جگہ پر سلگ کر رہ گئی۔ غلام حسین کو دیکھ کر اسے دیا کی طبیعت صاف کرنے کا خیال ناکامی کا شکار ہوتا محسوس ہونے لگا۔

''ماموں ہی بہت لکی ہیں نا نانو کہ آپ کو تمام رشتے واپس مل گئے۔ ورنہ تو کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس کالونی کے ایک بے حد عام سے گھر میں کوئی بوڑھی عورت بھی بغیر رشتوں کے جی رہی ہے'' غلام حسین نے نیہاں پر ہی چوٹ کی تھی۔ وہ جو آتے ہی اس کی متلاشی نگاہوں کا بھٹکنا محسوس کر کے سلگ رہی تھی براہ راست خود پر حملہ ہوا تو بھڑک اٹھی۔

''تمہارا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے اگر غور کرو تو؟''

ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کرتے اس نے بلا دریغ اندر کی کھولن اس پر انڈیل دی۔ جواباً غلام حسین ازلی اعتماد سے مسکرایا تھا پھر اسے دیکھ کر معنی خیزیت سے بولا۔

"چلو میری یہاں انٹری تو سمجھ میں آ گئی تمہارے مگر تم اپنے بارے میں وضاحت دینا پسند کرو گی؟" سوال ایسا تھا کہ نیہاں کو جو سلگایا وہ الگ البتہ اس کا اعتماد ضرور زائل ہوا تھا۔ اسے خود کو کمپوز کرنے کو کچھ وقت لگا تھا پھر کاٹ دار طنز سے اس کو مخاطب کیا تو لہجے میں بہت واضح تمسخر تھا۔

"جیسے نظروں سے ڈھونڈ رہے ہو۔ سیدھی طرح پوچھ کیوں نہیں لیتے۔ تم پر کچھ جچتا نہیں ہے یہ انداز"

غلام حسین اس کی بات کے جواب میں مسکرا دیا تھا۔

"ابھی یہاں تک ہی ہے اختیار کی حد، سمجھا کرو لڑکی! اختیارات وسیع ہونے دو پھر ہم نانو تو نانو ماموں سے بھی بڑے دھڑلے سے اپنی اہلیہ کے بارے میں پوچھ لیا کریں گے۔

شوخ و شنگ نظریں اور شرارتی متبسم لہجہ نیہاں کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ اسے منہ لگانا گویا چار چوٹ کی کھانا تھا جبھی نیہاں نے کان سینے اور اپنا سیل فون نکال کر اس پر مصروف ہو گئی تھی مگر توجہ کا سارا ارتکاز اسی دشمن جاں کی سمت رہا تھا۔ تبھی دیا اپنے دھیان میں باہر سے ہی بولتی ہوئی اندر آئی تھی اور نیہاں نے دیکھا تھا جونہی دیا نے اندر قدم رکھا تھا غلام حسین کی لاپرواہی سے ادھر ادھر بھٹکتی نگاہیں یکلخت تمام تر توجہ نرمی اور ارتکاز سمیت دیا کے چہرے کا حصار باندھ گئی تھیں وہ جو خود میں صبح نو کی تمام تازگی اور اجلا پن سمیٹے ہوئے تھی کیا واقعی اس قابل تھی کہ غلام حسین جیسے بے حد خاص اور ہر دلعزیز بندہ سب کچھ فراموش کر کے اس کا ہو کر رہ گیا تھا۔ جہاں نیہاں کے چہرے پر ناگواریت شکنوں کی صورت ابھری وہاں دیا بھی ان دونوں کو غیر متوقع طور پر موجود پا کر ٹھٹک گئی تھی۔ معاً وہ سنبھلی تھی اور سلام کرنے کے بعد دادو سے بابا جان کے متعلق سوال کرتی الٹے قدموں باہر نکل گئی۔ نیہاں تو بس طنزیہ خار کھاتی نظروں سے گھورنے کا ہی فریضہ انجام دیتی رہی تھی البتہ غلام حسین نے ضرور دل و جان سے جواباً اس پر سلامتی بھیجی تھی اس کا ایک دم سے کھل اٹھنے والا چہرا اور موڈ کی تازگی و بشاشت ضرور نیہاں کے اندر بھڑکی آگ کو دہکتے الاؤ میں بدل گئی تھی۔ گو کہ وہ جان گئی تھی دیا محض غلام حسین کی موجودگی کے باعث وہاں ٹھہرے بغیر باہر چلی گئی ہے اس کے باوجود وہ جز بز ہوتی زہر خند ہوتی رہی تھی۔"

"دادو کب سے آئی بیٹھی ہوں۔ چائے ہی پلوا دیں۔ اب تو آپ کی پوتی صاحبہ بھی تشریف لا چکیں"

سیل فون بے زاری و کوفت بھرے انداز میں سائیڈ پر پٹختے ہوئے نیہاں نے کچھ اکتا کر ماحول پر چھائے معنی خیز سناٹے کو توڑا جو اس کی ناتواں جان پر صحیح معنوں میں ستم ڈھا رہا تھا۔

"تم خود کیوں نہیں بنا لیتیں؟ تم بھی پوتی ہی ہو خیر سے"

غلام حسین پتا نہیں تہیہ کر کے بیٹھا تھا کہ آج اسے لازمی زچ کرنا ہے۔ دادو سے گفتگو کا سلسلہ لمحہ بھر کو موقوف کر کے اسے دنداں شکن جواب دیا تو نیہاں توہین کے احساس سے سرخ پڑ گئی تھی۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہی سمجھے! یہاں تو آنا ہی فضول ہے۔ کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا" وہ زور سے پھنکاری تھی اور بیگ جھپٹ کر اٹھاتی تن فن کرتی کمرے سے نکل گئی۔

جبکہ حیران پریشان بیچاری دادو بری طرح سے بوکھلا اٹھیں۔

"ہائیں ہائیں! رکو، اے بچی! ارے نیہاں!"

"رہنے دیں نانو جانے دیں۔ ایسے سیلفش لوگوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے جو خود اپنی ذات کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں"

اس نے بے نیازی سے مداخلت کی وہ اب بھی اتنا ہی پرسکون تھا۔ دادو نے اسے گھورا۔

"تم بھی تو مسلسل اس سے چونچ لڑا رہے تھے نا۔ پتا بھی ہے وہ ذرا غصے کی تیز ہے"

"ذرا؟" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"خیر جانے دیں دفع کریں نا۔ آپ مجھ سے اچھی اچھی باتیں کریں۔ آپ کی ایک یہی تو پوتی نہیں ہے" اس کی بات پر دادو نے اسے خفگی سے دیکھا اور ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

"دیا چائے بنانے ہی تو گئی تھی۔ پھر بھی غصہ کر کے چلی گئی"

"اُفوہ نانو میں ہوں نا چائے پینے کو۔ مگر یہ دیا صاحبہ چائے کو پایوں کی طرح کیوں پکاتی ہیں؟ میں دیکھتا ہوں"

وہ مسکراہٹ دبائے جیسے ہی اٹھا۔ دادو نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ غلام حسین! میری دیا تمہاری دیگر کزنز کی طرح نہیں ہے بیٹے! اس کے ساتھ باقیوں جیسا رویہ نہ رکھو"

دادو جس حد تک ملول تھیں وہ اس قدر آسودگی سے مسکرایا۔

"میں آپ کی اس پوتی سے فلرٹ کرنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا ہوں نانو"

"کیا نہیں کر رہے ہو؟"

دادو نے استفہامی انداز میں اسے دیکھا تو وہ ہنس دیا تھا۔

''نانو میں آپ کی لاڈلی پوتی صاحبہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں مما نے بات نہیں کی آپ سے؟''

''کی ہے مگر......''

''مگر کیا؟'' وہ سخت بے چین ہوا۔

''جواب میں نے ابھی کوئی نہیں دیا۔ تمہارے ماموں اور مستقیم سے بات کروں گی۔ سب سے زیادہ تو خود دیا کی رائے کی اہمیت ہے''

''فکر کیوں کرتی ہیں نانو سب ٹھیک ہوگا آپ کے نواسے کو بھی بھلا کوئی لڑکی انکار کرسکتی ہے''

اس نے مسکرا کر ان کے کاندھے پر بازو دراز کر دیا تھا۔ دادو جواب میں کچھ نہیں بولیں۔ اسی پل دیا چائے کی ٹرے سمیت اندر آئی تھی۔ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے نازک مگر باوقار لڑکی وہ اسے دیکھتا تھا تو خود کو بھولنے لگتا تھا۔

''نیہاں کدھر گئی ہے دادو؟''

ٹرے میز پر رکھتے ہوئے وہ حیران ہو کر بولی تھی۔

''وہ خفا ہو کر چلی گئی ہے۔ کہیں تو خفگی کی وجہ بھی بتاؤں؟''

دیا نے دادو کے بعد اسے چائے کا مگ تھمایا تب غلام حسین بے حد سنجیدگی سے بولا تھا مگر اس کی نگاہیں بے حد شوخ تھیں۔ دیا نے جواب میں اسے ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا جواب دینا تو دور کی بات تھی اور پلٹ کر کمرے سے چلی گئی۔ غلام حسین اس درجہ بیگانگی اور کسی حد تک ہتک کے احساس میں مبتلا تپتے چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔ جیسی اس کی شخصیت تھی وہ ہمیشہ خصوصی اہمیت پاتا رہا تھا۔ خاص طور پر لڑکیاں تو اسے روبرو پاتے ہی اپنا آپ بھولنے لگتی تھیں دیا کا ہر انداز انوکھا تھا۔ اس نے گہرا سانس بھر کے خود کو اس احساس سے بہ مشکل نکالا اور شاکی نظروں سے دادو کو دیکھا تھا۔

''آپ کی پوتی کچھ ضرورت سے زیادہ مغرور نہیں ہے نانو! کسی کو بھی گھاس نہیں ڈالتی''

دادو نے تسبیح ایک سائیڈ پر رکھ کر اسی سنجیدگی کے ساتھ اس کا بڑھایا ہوا مگ تھام لیا۔

''وہ ایسی ہی ہے''

عجیب بے نیاز سا انداز تھا۔ یا غلام حسین کو محسوس ہوا تھا۔

''محترمہ کی ساری بے نیازی آپ کے اس حسین و جمیل نواسے کے آگے دھری رہ

جائے گی انشاءاللہ!''

وہ مسکرایا تھا اور بہت زعم سے بولا۔

''ایک بات یاد رکھنا غلام حسین! میں دیا کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی''

ان کے جواب نے غلام حسین کو ساکن کر دیا تھا۔ معاً اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

''اس کے انکار کی نوبت نہیں آئے گی گرینڈ ما!''

اس کے لہجے کا یقین معنی خیز تھا۔ اب کے دادو کچھ نہیں بولیں۔

☆☆☆

کوئی سورج جاگے دھرتی پر کچھ ایسا ہو یہ رات گئے
کوئی ہاتھ میں تھامے ہاتھ میرا اور لے کر مجھ کو ساتھ چلے
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں اور ہاتھ پر میرے ہاتھ رکھے
اور پونچھ کے آنسو آنکھوں سے وہ دھیرے سے یہ بات کہے
یوں تنہا سفر اب کٹتا نہیں چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں

عراق میں ہونے والی جنگ سرد پڑی یا پھر امریکہ نے اپنا حسب منشا نتیجہ حاصل کرلیا تو مواصلاتی نظام کے ساتھ سرحد بھی کھول دی گئی۔ ضحیٰ کے بابا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور ابنِ زید کے عراق جانے کا انتظام ہو گیا۔ ابنِ زید کے اندر اس اطلاع کے ساتھ جیسے زندگی کی تحریک جاگ اٹھی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ مسلسل اپنے گھر اور آس پڑوس کے نمبرز پر فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر بیشتر نمبر بند تھے جو بحال تھے وہاں بھی وہاں گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں کوئی فون نہیں اٹھاتا تھا۔ وہاں برپا ہونے والی تباہی و بربادی کی یہ بھی ایک واضح علامت تھی جو اس کا دل پھاڑنے کا باعث بنتی رہتی۔ ایسے میں یہ اطلاع اس کے اندر گویا نئی روح پھونک گئی تھی۔ اس نے فی الفور اپنی تیاری باندھ لی۔

''تو تم جا رہے ہو ابنِ زید؟''

سوٹ کیس میں اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر رکھ رہا تھا جب ستا ہوا چہرہ اور متورم آنکھیں لیے ضحیٰ وہاں چلی آئی تھی۔ ابنِ زید نے اس پر ایک سرسری سی نگاہ ہی ڈالی تھی۔

''ہاں جا رہا ہوں۔ دعا کرنا ضحیٰ میں اپنے گھر والوں کو زندہ سلامت دیکھ سکوں''

اس کی آواز میں خدشات لرزتے تھے۔ ضحیٰ نے حسرت زدگی کی کیفیت میں اسے دیکھا۔

آج شام کو ابنِ زید کو چلے جانا تھا۔ ضحیٰ کو لگتا تھا کوئی دھیرے دھیرے اس کی روح کھینچ رہا ہو۔

''تم واپس تو آؤ گے نا ابنِ زید! تمہاری تعلیم ادھوری ہے ابھی''

ضحیٰ کے بے چینی سے کیے گئے سوال پر ابنِ زید کے چہرے پر اضمحلال بکھر گیا۔

''پتا نہیں۔ جو حالات ہیں میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہا ہوں۔ یہاں تو سب کچھ داؤ پر لگا ہے۔ تعلیم کا ادھورا رہ جانا کیا معنی رکھتا ہے''

''میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں ابنِ زید! پلیز میری خاطر لوٹ کے آجانا''

وہ ضبط کھو کر ہچکیوں سے روئی تو ابنِ زید نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''آئی ایم ساری ضحیٰ! تم بہت اچھی ہو مگر میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مس بی ہیو کرتا رہا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا اور مجھے بھول جانا کہ میں نے تمہیں سوائے آنسوؤں اور تکلیف کے کچھ نہیں دیا۔ پلیز ہمارے لیے دعا کرنا۔ میرے ملک کی سلامتی و حفاظت اور بقا کی دعا''

''ابن زید میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے مگر تم مجھ سے بچھڑ رہے ہو۔ میں کیسے جیوں گی تمہارے بغیر''

اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔ اس نے ابن زید کی بات جیسے سنی ہی نہ تھی۔

''اسی کا نام قسمت ہے ضحیٰ! تمہیں خدا بہت اچھا ہمسفر عطا کر دے گا۔ میں جا رہا ہوں تو اب مجھے یاد کر کے آنسو مت بہانا یہ سوچ کر کہ مجھے تمہارے آنسو بہت تکلیف دیں گے اور دعا کرنا کہ خدا میرے ملک کو دشمن کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھے۔ دنیا کی آنکھیں بند ہیں اور اقوامِ متحدہ ہماری بے بسی کا محض تماشا دیکھتی ہے''

''ابن زید!''

وہ پھر سسک اٹھی۔

''میں تمہارے سینے سے لگ کر کچھ دیر رونا چاہتی ہوں میں تمہیں چھو کر محسوس کرنا چاہتی ہوں''

اس نے ایک بار پھر ابنِ زید کی بات نہیں سنی تھی۔ ابنِ زید نے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور جیسے بدک گیا۔

''پلیز ضحیٰ ہوش میں آؤ۔ کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

ضحیٰ اس کی ہراسگی کو محسوس کر کے روتے روتے ہنس پڑی۔

''ڈر کیوں گئے ابن زید! ایک عورت بھلا کسی مرد کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

ابنِ زید نے کچھ غیر یقینی اور بے حد ناگواری میں مبتلا ہو کر اسے دیکھا تھا پھر سر جھٹک

کر بولا۔

''شاید تم پاگل ہو گئی ہو۔ پلیز جاؤ یہاں سے''

اس نے رخ پھیر لیا تھا۔ آج کی اس گفتگو نے اسے ضحیٰ کی طرف سے کچھ اور بھی دلبرداشتہ کر دیا تھا۔

ضحیٰ ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔ ابنِ زید نے سر جھٹک دیا تھا۔ مگر شام کو جب وہ جا رہا تھا تو ضحیٰ نے اس سے معذرت کی تھی۔

''مجھے معاف کر دو ابنِ زید مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ تمہاری جدائی کے خیال نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ میں جانتی ہوں تمہیں بے باک لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ میں بے باک نہیں بے بس ہوئی تھی ابنِ زید!''

ابن زید نے اسے دیکھا تھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''جذبے بے اختیار ہی ہوا کرتے ہیں ضحیٰ مگر خود کو کبھی بے اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پھر عورت کی تو شرم و حیا میں ہی گویا اس کا سارا حسن پوشیدہ ہوتا ہے''

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ اپنے منتظر کھڑے احمد عبداللہ اور ابوحذیفہ سے جا کر گلے ملنے کے بعد گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی ہر لحظہ آگے بڑھتی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اچھی خاصی خاموشی تھی جو مکینوں کی غیر موجودگی میں ہی تخلیق ہو پاتی ہے یا پھر آدھی رات کے خوابیدہ تصور سے ہی منسوب ہوتی ہے۔ اس نے صبح نماز تو پڑھی تھی کلام پاک کوشش کے باوجود نہیں پڑھ سکی۔ ساری رات کی جاگی ہوئی تو تھی ہی ساتھ ٹینشن بھی تھی۔ اب جا کے کسی فیصلے نے طمانیت بخشی تو پلکیں بوجھل ہوئیں باہم ملتی چلی گئی تھیں۔ دعا کے دوران جائے نماز پر ہی وہ نیند کے جھونکوں کے باعث بار بار جھونک کھانے لگی تو دادو نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا وہ اس کی آنکھوں کی سرخی سے ہی اس کے رتجگے کا اندازہ کر پائی تھیں۔ رات ہی ان کی اس سے غلام حسین کے پروپوزل کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔ جسے سن کر اسے حیرت تو خیر کیا ہونا تھی البتہ غلام حسین کی ڈھٹائی پر اسے تاؤ بہت آیا تھا۔

''تمہارے بابا جان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ تمہاری مرضی کو اہمیت دیں گے البتہ مستقیم غلام حسین کا بھرپور حامی ہے وہ اسے بہت پسند کرتا ہے غالباً! ویسے غلام حسین حقیقتاً ہے بھی بہت پیارا بچہ! بیٹا فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا ہے مگر بہتر ہے تم ٹھنڈے دل سے سوچ کر پھر

جواب دینا'' دادو نے اس کے چہرے پر ناگواری اور برہمی کی تمتماہٹ محسوس کر لی تھی جبھی اس کا گال تھپک کر ملائمت سے کہا تھا۔ جواب میں دیا کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ نماز کے بعد سوئی تو اب جا کے آنکھ کھلی تھی تو ہر سو پھیلی خاموشی کے احساس کو محسوس کرتی وہ کچھ دیر یونہی کاہلی سمیت بستر پر لیٹی رہی۔ کمرے میں رات کی کسی بے ترتیبی کے آثار نہیں تھے گویا دادو صفائی کر چکی تھیں وہ بری طرح سے شرمندہ ہوتی تیزی سے اٹھی اور شال اپنے گرد لپیٹتی چپل پہن کر باہر آ گئی پورے گھر کی طرح کچن بھی صاف ستھرا تھا۔ دادو کچن میں ہی پیڑھی پر بیٹھیں سبزی بنانے میں مصروف تھیں اسے دیکھا تو مسکرا دیں۔

''آپ چھوڑیں دادو میں کر لوں گی''

اس نے ان کے ہاتھ سے چھری اور پالک لینا چاہی تو انہوں نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔

''ناشتہ کر لو بیٹے پھر سالن بنا لینا''

دیا گہرا سانس بھر کے کچھ دیر متذبذب سی کھڑی رہی پھر اپنے لیے ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

''آپ چائے پئیں گی؟''

''نہیں ابھی کچھ دیر پہلے تو پی ہے''

''نانو نہ سہی مگر میں پیوں گا۔ میرے لیے ایک کپ بنا لو''

اسی پل غلام حسین نے کچن کی چوکھٹ پر قدم رکھا تھا دیا جو اس کی آواز پر اپنی جگہ اچھل سی پڑی تھی سرد مہر نظروں سے اسے دیکھتی ہونٹ بھینچ کر چہرے کا رخ پھیر گئی۔ غلام حسین نے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرے کو سنجیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور قدم بڑھا کر اس کے نزدیک آ گیا اس سے قبل کہ کچھ کہتا دیا بے حد تپے ہوئے لہجے میں بول پڑی تھی۔

''آپ کچن سے جائیں میں چائے اندر بھجوا دوں گی''

'غلام حسین بیٹے آؤ اندر چلتے ہیں''

دادو نے بغور پوتی کو دیکھا تھا اور اس کے تاثرات نے ہی جیسے ان پر اس کے فیصلے کا ادراک بخش دیا تھا۔ وہ ایک دم کچھ سست سی نظر آنے لگیں۔ اس میں شک نہیں تھا کہ غلام حسین انہیں بہت عزیز تھا۔ وہ ان کا اکلوتا نواسہ تھا انہوں نے اسے ہمیشہ بے حد اہمیت اور محبت سے نوازا تھا۔ مگر دیا کی بھی حق تلفی یا پھر اس کی مرضی کے بغیر وہ اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

''آپ چلیں نانو میں آ رہا ہوں''

غلام حسین نے انہیں سہارا دے کر اٹھایا پھر ان کے کچن سے چلے جانے کے بعد دیا کی سمت متوجہ ہوا تو وہ بے حد کڑے تیوروں سمیت تنے ہوئے چہرے کے ساتھ چیزوں کو اٹھا پٹخ کرنے میں مصروف تھی۔

''آپ کی عدالت میں ہمارا بے حد اہم کیس تھا میم! فیصلے سے آگاہی ہمارا حق بنتا ہے نا؟''

''غلام حسین نے اس کے کتراتے ہوئے درشت مگر درست انداز ملاحظہ کرتے ہوئے رسانیت سے سوال کیا تھا۔ دیا کو اس کی مستقل مزاجی اور جی داری پر تاؤ آنے لگا۔

''جو بھی فیصلہ ہو گا آپ تک پہنچ جائے گا بہر حال! آپ یہاں سے تشریف لے جایئے''

وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی تھی غلام حسین نے اس کے بے اعتنا چہرے کو نظر جما کر دیکھا تھا۔

''اگر میں کہوں مجھے روبرو ابھی آپ کا فیصلہ سننا ہے تو؟''

''خواہ مخواہ فرینک ہونے کی کوشش مت کریں سمجھے ہیں آپ!''

دیا غصیلی نظروں سے اسے گھور کر بولی تو غلام حسین مسکراہٹ دبا کر پرشوق نظروں کو اس پر جما کر بولا تھا۔

''ابھی کہاں ہوا ہوں فرینک، یہ سارے کام تو مستقبل قریب کے ہیں''

''شٹ اپ!'' وہ چیخی مگر غلام حسین کے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔ دیا کو ہی ہار ماننا پڑی تھی۔

''بہت زعم ہے شاید آپ کو خود پر۔ مگر ہر لڑکی کی سوچ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ میں آج دادو کو آپ کے پرپوزل پر انکار کر رہی ہوں۔ سن لیا میرا فیصلہ آپ نے اب جایئے''

وہ بولی نہیں تھی پھنکاری تھی اور غلام حسین کے تو احساس بری طرح ادھڑے تھے اس کا چہرہ واضح طور پر پھیکا پڑ گیا۔ اسے یقیناً دیا سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ حواسوں میں آ کر کچھ کہتا دیا پلٹ کر کچن سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

''دیا!''

مستقیم کے پکارنے کے باوجود وہ سر تک چادر اوڑھے ساکت پڑی رہی تھی۔ مستقیم نے گہرا سانس کھینچا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے عین سامنے براجمان ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سو نہیں رہی ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤ"

اس کی اس ڈھٹائی پر دیا کو اتنا غصہ آیا تھا کہ ایک جھٹکے سے چادر دور پھینک کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات کریں گے آپ مجھ سے؟"

"کیا تم نہیں جانتی ہو؟"

مستقیم نے الٹا اس کی آنکھوں میں جھانک کر سوال داغ دیا تو دیا حلق تک بے زار ہو کر رہ گئی تھی۔

"آپ جانتے ہیں میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی"

دیا نے نروٹھے پن سے جواب دیا تو مستقیم نے جواباً اس کو بہت دھیان سے دیکھا تھا۔

"وائے؟" اس قدر شدید کیوں ہے تمہارا ری ایکشن دیا؟"

"وہ شخص مجھے پسند نہیں ہے۔ کوئی زبردستی تھوڑی ہے بھائی!"

وہ زچ ہو کر بولی تھی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لئے۔

"وہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ بغیر کسی ٹھوس ریزن کے اسے ٹھکرا دیا جائے"

مستقیم کا لہجہ مضبوط تھا اور وہ قائل کرنے کے فن سے بھی آشنا تھا۔ دیا نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"وہ آپ کا دوست ہے بھائی اس لیے؟ میں آپ کی بہن ہوں یہ بھی یاد رکھیں"

"جبھی تو تمہیں اس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں پگلی!"

مستقیم نے زچ ہو کر کہا تھا اور دیا کو گویا بھڑکا کے رکھ دیا۔

"ایسے کون سے لعل لگے ہوئے ہیں اس میں جو مجھے نظر نہیں آتے"

"دیا تم مجھے صرف یہ بتاؤ تمہیں مجھ پر بھی بھروسہ نہیں ہے؟"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے بھائی!" وہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ بات تمہیں شادی کے بعد کبھی نہ کبھی ضرور پتا چل جائے گی کہ وہ کتنا خاص یا اہم ہے اور اس میں کون سے لعل لگے ہوئے ہیں"

اب کے مستقیم کے لہجے میں ہلکی خفگی کے ساتھ معنی خیزیت کا رنگ بھی گہرا تھا۔ جس پر اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔

"میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتی۔ اللہ جانے اس بندے نے آپ پر کیا جادو کر دیا ہے"

وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگی تھی۔

"یہ جادو تم پر بھی ہو جائے گا ڈونٹ وری!"

مستقیم پھر مسکرایا تھا۔ اب کے دیا نے اچھا خاصا برا مانا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے سمجھے آپ! اور میرے ساتھ کوئی فضول بات مت کریں"

"دیا حسین محبت کرتا ہے تم سے۔ وہ عزت دینا جانتا ہے عورت کو"

مستقیم کے الفاظ نے دیا کو تاسف اور شدید ناراضی میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں حیران ہوں بھائی آپ مجھے کیوں فورس کر رہے ہیں۔ آپ جانتے بھی ہیں مجھے اس کی فیلڈ ہرگز پسند نہیں ہے"

"تم اس سے کہنا وہ چھوڑ دے گا یہ فیلڈ!"

"یعنی آپ طے کر چکے ہیں کہ آپ نے مجھے اسی کھونٹے سے باندھنا ہے؟"

وہ جس قدر زچ ہوئی تھی اسی حساب سے تلخ سوال کیا تھا جس کا بالکل بھی برا مانے بغیر مستقیم نے کاندھے اچکا کر مسکراہٹ سے ہاں میں جواب دیا تھا۔ بے اعتنائی کے اس مظاہرے پر دیا کی آنکھیں بے اختیار نم ہوتی چلی گئی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے کریں اپنی مرضی! مجھ سے راضی نامہ لکھوانے کی فارمیلٹی نبھانے کی بھی کیا ضرورت ہے"

مستقیم نے اس کی خفگی کو محسوس کیا، آنکھوں میں مچلتی نمی کو دیکھا پھر گہرا سانس بھر کے نرمی و رسان سے بولا تھا۔

"دیا گڑیا بسا اوقات انسان کسی چیز کو اپنے لیے برا سمجھ رہا ہوتا ہے مگر وہ اس کے لیے بری نہیں ہوتی میں صرف اتنا کہوں گا کہ تمہیں اس معاملے سے مکمل آگاہی نہیں ہے پھر تمہارا نام "دیا" ہے جس کا مطلب ہے "روشنی پھیلانے والی چیز" عین ممکن ہے تم جیسی نیک اعمال بیوی کو پا کر غلام حسین بھی گمراہی کے اندھیروں سے نکل آئے۔ تم سوچو ہو سکتا ہے خدا تمہیں اس کی ہدایت کا ذریعہ بنانا چاہ رہا ہو؟ زہرہ پھپھو کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے چچاؤں کی فیملیز سے مختلف تو نہیں تھیں وہ...... مگر آج پھوپھا عبدالعلی کی وجہ سے ان کی پوری نسل سنوری ہوئی ہے۔ نیک ہمسفر خدا کا بہترین عطیہ ہوتا ہے"

مستقیم نے اس کا سر تھپکا اور کچھ توقف سے مزید گویا ہوا تھا۔

"میری باتوں پر غور ضرور کرنا"

اس کے جانے کے کتنی دیر بعد تک بھی دیا ساکن بیٹھی رہی تھی پھر آہستگی سے اپنے

بھیگے گال خشک کر دیئے تھے اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کرنا از حد مشکل تھا۔

☆☆☆

ہم دشت کے باسی ہیں اپنے شہر کے لوگو
یہ روح پیاسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
دکھ درد سے صدیوں کا تعلق ہے ہمارا
آنکھوں کی اداسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جاں دینا روایت ہے قبیلے کی ہماری
یہ سرخ لباسی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جو بات بھی کہتے ہیں اتر جاتی ہے دل میں
تاثیر جدا سی ہمیں ورثے میں ملی ہے
جو ہاتھ بھی تھاما ہے سدا ساتھ رہا ہے
احباب شناسی ہمیں ورثے میں ملی ہے

اس نے گہرا سانس کھینچا اور بک بند کر کے واپس کارنس پر رکھ دی۔ وہ ہنوز رخ پھیرے کھڑے تھے۔ اسوہ کی آنکھوں میں مچلتا ہوا انتظار بھی جیسے تھکنے لگا۔

''ابنِ زید پلیز ٹیل می!''

''میرے پاس تمہاری اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے اسوہ پلیز مجھ سے کچھ مت پوچھو''

ان کے لہجے میں اگر قطعیت اور برہمی ہوتی تو وہ اپنے مزاج اور عادت کے مطابق ضد پر اتر آتی مگر اس کے برعکس ان کے لہجے کی التجا نے جیسے پہلے ہی مرحلے پر اسے شکست سے دوچار کر دیا تھا۔

''تو آپ نہیں بتائیں گے او کے فائن میں نہیں فورس کرتی آپ کو۔ مگر آپ نانو کی یہ خواہش تو پوری کر سکتے ہیں''

''کون سی خواہش؟''

ابن زید کچھ بے خیال تھے اس پل جبھی پچھلے ایک گھنٹے کی بحث و تکرار کی اصل بنیاد بھلا بیٹھے۔

''یہی کہ اب شادی کر لیں''

''اسوہ اگر میں کہوں دس از مائی پرسنل میٹر تو......؟''

ابنِ زید کے لہجے میں یکا یک جو بے اعتنائی و بیگانگی اور تلخی در آئی تھی اس نے اسوہ کا رنگ پھیکا کر ڈالا۔

''میں جانتی ہوں ہماری تمام تر محبت، اپنائیت اور چاہت کے باوجود آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے یقیناً ہماری محبت میں کھوٹ ہوگا''

تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔ وہ روتی ہوئی پلٹ کر بھاگی۔

ابنِ زید کو اس پل شدت سے اپنے رویئے کی بدصورتی کا احساس جاگا تھا۔ وہ بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکے۔

''اسوہ......اسوہ میری بات!''

سرعت سے دروازے سے نکلتے ہوئے وہ دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے سکندر سے ٹکرا گئے۔ جس کا دھیان ان کی بجائے اندھا دھند سیڑھیاں چڑھتی اسوہ کی جانب تھا۔ ابنِ زید کی خفت کچھ اور بڑھ گئی۔

''یہ......اسوہ......خیریت؟''

اس نے سوالیہ نگاہوں کا رخ ابنِ زید کی جانب موڑا تو ابنِ زید جواب میں اسے دیکھ کر سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔

''ایسا ہے سکندر بابا آپ کچھ دیر بیٹھو میں ابھی آتا ہوں''

''مگر وہ اسوہ!!!''

''آ کے بتاتا ہوں یار! جسٹ اے منٹ!''

ابن زید کے آگے بڑھ کر دروازے سے نکل جانے پر سکندر عجیب سے احساس کا شکار ہوتا اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ ابنِ زید اسوہ کے کمرے تک آئے تو بند دروازے کے پار سے بھی اس کی سسکیاں باآسانی سنی جا سکتی تھیں ان کے دل کا بوجھ کچھ اور بھی گہرا ہونے لگا۔

''اب کیوں آئے ہیں؟ مجھ سے گستاخی ہوگئی تھی کہ آپ کے پرسنل میٹر میں انٹرفیئر کیا''

ابنِ زید نے دستک کے بعد اندر قدم رکھا تو اسوہ جو بیڈ پر گری رونے میں مشغول تھی ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔

''آئی ایم ساری! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا''

ابن زید کے لہجے میں واضح شرمندگی تھی۔ اسوہ نے زور سے سر جھٹک دیا تھا۔

''نہیں آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہر کسی کو اس کے درجے اور مقام پر رکھا جائے تب

ہی ٹھیک رہتا ہے''

''بہت خفا ہو اسوہ''

ابنِ زید نے اس کی بھیگی آنکھوں کے زیریں کناروں کی سرخی کو پل بھر کو غور سے دیکھا۔

''آپ کو میری خفگی کی کیوں پرواہ ہونے لگی؟''

اس نے ہچکی بھرتے ہوئے کہا اور ابنِ زید نے ہونٹ سختی سے باہم بھینچ لیے تھے۔

''اگر پرواہ نہ ہوتی تو اتنی سیڑھیاں چڑھ کر تمہارے پاس نہ آیا ہوتا جبکہ تم جانتی ہو یہ کام میرے لیے کتنا مشکل ہے''

ان کے بھاری لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ اسوہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ بلیک سادہ سے سوٹ میں اپنی بلند قامت اور بے حد وجیہہ چہرے کے ساتھ وہ عام سے حلیئے میں بھی ہمیشہ بہت خاص اور اہم لگا کرتے تھے۔ اسوہ کے چہرے پر جانے کس کس احساس نے تمتماہٹ بکھیر دی۔

''اوہ سوری ابنِ زید مجھے خیال نہیں رہا آپ کو اس طرح اوپر نہیں آنا چاہیئے تھا''

اسوہ یکایک متفکر نظر آنے لگی۔

''میری اتنی اچھی سی دوست مجھ سے خفا ہو گئی تھی۔ بھلا یہ ممکن تھا کہ اسے مناتا نہیں اور سنو شادی نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس اتنی عمر میں جب بال بھی سفید ہونا شروع ہو چکے ہیں بھلا کون مجھے اپنی لڑکی دے گا اوپر سے یہ ٹانگ بھی تو......''

''ابنِ زید آپ کو اپنی وجاہت اور خوبروئی کا اندازہ نہیں ہے شاید ہزاروں لڑکیاں بن دیکھے آپ پر مرتی ہیں اور جو ایک بار دیکھ لیتا ہے نا آپ کو ساری عمر شاید ہی بھلا سکے''

''کسی کو یاد رکھنا اور پھر اس کے ساتھ زندگی گزارنا دو الگ یکسر الگ باتیں ہیں۔ میں کسی کو اس آزمائش میں مبتلا ہی کیوں کروں؟''

ابنِ زید کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا اس کے باوجود اسوہ کے دل میں نیزے کی انی بن کر چبھ گیا۔ تکلیف کا احساس اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھیں پھر سے بھیگتی چلی گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ابنِ زید کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما اور ایک عقیدت بھرا بوسہ ثبت کرنے کے بعد آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

''آپ کو خود اپنی عظمت کا احساس نہیں ہے ابنِ زید! آپ یقین کر لیں ہم سب کے لیے آپ بہت اہم بے حد خاص ہیں اور کوئی نہ کرے آپ سے شادی میں کروں گی''

ابنِ زید کو جیسے بچھو نے ڈنگ مارا تھا۔ انہوں اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اسوہ کے

ہاتھوں سے کھینچ لیا۔

''اسوہ!!!''

وہ زور سے چیخے! ان کے چہرے کے تمام عضلات تن کر رہ گئے تھے۔ اندرونی کرب سرخ رو آنکھوں سے کچھ ایسے چھلکا کہ آنکھیں دہک کر انگارہ ہو گئیں۔ اسوہ سکون و اطمینان سے بنا خائف ہوئے انہیں تکتی رہی ابنِ زید کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے یونہی بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اسے ایک نظر دیکھا پھر سرعت سے پلٹے اور وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے۔ اسوہ نے کچھ دیر سوچا پھر کاندھے اچکا دیئے تھے۔

(خدا کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے ابنِ زید! وہ بات جسے میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے بہت شدت سے محسوس کرتی رہی ہوں مگر کہنے میں ہمیشہ لاج اور حیا مانع تھی آج موقع کی مناسبت سے کہہ دی ہے تو خود کو بہت ریلیکس محسوس کرتی ہوں)

ابنِ زید گو کہ اچھی خاصی تاخیر سے لوٹے تھے اور اس دوران خود کو کمپوزڈ کرتے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے سکندر کمرے میں ان کا منتظر ہوگا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ آج کی اسوہ کی حرکت نے ان کے اعصاب کو شدید تناؤ کا شکار کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں لوٹے تو ان کی چال میں اضمحلال تھا جسے سکندر نے اپنے دھیان میں محسوس نہیں کیا۔ اس کا ویسے بھی سارا دھیان اسوہ کی جانب لگا ہوا۔

''اب کیسی ہے وہ؟''

اس کے سوال نے ابنِ زید کو چونکا دیا۔ انہوں نے دیکھا سکندر کی آنکھوں میں لاتعداد سوال تھے۔ وہ بے ساختہ نظریں چرا گئے۔

''ٹھیک ہے''

ابنِ زید نے رسانیت سے کہا اور گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''ہوا کیا تھا؟''

سکندر کے لہجے میں اضطراب کوئی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ ابنِ زید نے خود کو پل صراط پر محسوس کیا۔

''بے وقوف ہے کہتی ہے شادی کر لوں''

''ہاں تو کر لیں نا! یہ کوئی ایسی فرمائش تھوڑی ہے جسے پورا نہ کیا جا سکے''

سکندر جس کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا اسے بند کر کے رکھتے ہوئے پوری طرح ان کی سمت متوجہ ہو گیا۔

"اگر مجھے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو بہت سال پہلے کر لیتا"

ابنِ زید کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ سکندر نے بغور انہیں دیکھا تھا۔

"مگر ابنِ زید نکاح سنت نبوی ﷺ ہے یو نو؟ آپ کو شادی ضرور کرنی چاہئے آپ کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی"

"ہاں سوچوں گا۔ تم اس وقت کیسے آ گئے آج"

ابنِ زید نے دانستہ موضوع بدل دیا۔ انداز جان چھڑانے والا تھا۔ سکندر کسی خیال کے تحت مسکرایا۔

"میں بھی اسی نیک کام کے سلسلے میں آیا ہوں"

"کس نیک کام کے سلسلے میں؟"

ابنِ زید نے چونکتے ہوئے نافہم نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ابنِ زید آپ جانتے ہیں نا کہ میں اسوہ سے......"

"ہاں جانتا ہوں تو پھر......؟"

ابنِ زید کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔ سکندر کچھ مضطرب اور کچھ تذبذب کا شکار ہو کر کہنے لگا تھا۔

"مگر وہ نہیں جانتی اور سچی بات ہے میں نے کبھی اس کا جھکاؤ اپنی طرف محسوس بھی نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں پہلے خود اس سے اپنے بارے میں رائے لے لوں"

"ہاں تو ٹھیک ہے ضرور لو اور یہ بات خالہ جی سے کہو وہ بڑی ہیں اس کی"

ابنِ زید اب اسے نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی سنہری آنکھوں میں تفکر واضح نظر آتا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ ابھی جو کچھ اسوہ نے ان سے کہا تھا وہ جانے کس موڈ اور رو میں کہہ دیا تھا ان کی تشویش کی اصل وجہ یہی تھی کہ اسوہ سکندر سے بھی کوئی ایسی فضول بات نہ کہہ دے۔ وہ ہرگز بھی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

"ہاں میں انہی سے کہوں گا۔ بس آپ میری فیور کیجئے گا پلیز!"

سکندر نے بے ساختگی میں کہا تو ابنِ زید نے نگاہ بھر کے اسے دھیان سے دیکھا دراز قد اور ڈارک کمپلکشن کا حامل وہ کسرتی وجود کا وجیہہ لڑکا تھا۔ یقیناً اسوہ کے ساتھ بہت جچتا بلکہ وہی جچ سکتا تھا وہ ان کی طرح اوور ایج نہیں ہو رہا تھا وہ آہستگی سے مسکرا دیئے۔

"پہلی بات یہ سکندر بابا کہ تم اتنے اچھے اتنے مکمل ہو کہ تمہیں فیور کی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود اگر اس کی ضرورت پیش آئی تو میں تمہاری دو چار جھوٹی سچی تعریفیں ضرور کر دوں گا"

ابنِ زید کی شرارت پر سکندر نے خوشگوار احساسات میں گھر کر اسے انہیں دیکھا تھا پھر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"آپ کو پتا ہے ابنِ زید آپ مسکراتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ خوش رہنا سیکھیں نا"

اس نے بے ساختگی میں جھک کر ابنِ زید کا ہاتھ تھاما تھا اور اتنی محبت اور عقیدت سے چوما کہ ابنِ زید ساکن رہ گئے تھے۔ انہیں لگا یہ سکندر نہیں اسوہ ہے۔ اسوہ کی خواہش سکندر سے ہر لحاظ سے مختلف تھی۔

"ابنِ زید آج کافی نہیں پلوائیں گے؟ اسوہ کو تو بلائیں"

سکندر کی آواز انہیں سناٹوں کی زد سے باہر کھینچ کر لائی تھی۔ انہیں لگا تھا ان کے ہاتھ کی پشت پر انگارے دھرے ہوں۔

"اسوہ کا موڈ اچھا نہیں ہے سکندر بابا! میں ملازمہ سے کافی کا کہتا ہوں اور سنو آج اسوہ سے کوئی بات مت کرنا او کے؟" میں نہیں چاہتا وہ موڈ کی خرابی کے باعث تمہیں ڈس ہارٹ کرے"

"میں سمجھ سکتا ہوں سر! آپ فکر نہ کریں۔ محترمہ کے موڈ کی بہتری کا انتظار کر لوں گا"

سکندر کھلکھلایا تھا۔ اس کا موڈ بے حد فریش ہو چکا تھا۔ کافی پیتے حالاتِ حاضرہ پر جی بھر کے تبصرہ کرنے کے بعد جب وہ وہاں سے اٹھا تو ابنِ زید کی تشویش اور تفکر مین کچھ اور بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن بہت خاموشی سے گزر گئے تھے۔ وہ مستقیم سے خفا تھی مگر مستقیم پرواہ نہیں کر رہا تھا۔ دادو نے اس معاملے میں مکمل چپ سادھے رکھی تھی۔ بابا جان تک اس کی ناپسندیدگی پہنچ چکی تھی انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ دیا کی مرضی کے بغیر وہ ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ پھپھو دل مسوس کر رہ گئی تھیں۔ ان کا وہ سارا جوش وخروش جیسے جھاگ بن کر بیٹھ چکا تھا۔ غلام حسین اکثر دادو سے ملنے کے بہانے چکر لگاتا تھا مگر اتنی دیر بالخصوص دیا خود کو کمرے تک محدود کر لیا کرتی وہ ہر طرح سے اسے مایوس کر دینا چاہتی تھی اور اس کی خاموشی پر وہ سمجھتی تھی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو رہی ہے۔

"ظہیر یہاں اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہ رہے تھے اسی سلسلے میں مصروف رہتے، ساتھ ہی کسی اچھے علاقے میں انہیں گھر کی بھی تلاش تھی۔ مستقیم کی وہی مصروفیات تھیں۔ گھر سے غائب رہتا کبھی کبھار اس کی شکل نظر آیا کرتی۔ وہ اکثر جھنجلا جاتی۔

''بابا جان آپ بھائی سے کہیں نا وہ ہمارے ساتھ رہا کریں''

جواب میں ظہیر مسکرا دیتے۔

''کر لینے دو عیش۔ پھر شادی کر دیں گے تو گھر پر ہی نظر آیا کرے گا''

ان کے پاس تسلی کا ایک ہی انداز تھا جو دیا کو بہلا بھی دیتا۔

''بابا جان کوئی لڑکی پسند کریں بھائی کے لیے؟''

''کیوں نہیں بیٹے! اگر آپ کے بھائی خود یہ کام نہ کرنا چاہیں تو ظاہر ہے آپ کو ہی کرنا پڑے گا''

بابا جان کبھی کسی فائل میں تو کبھی اخبار میں گم رہ کر جواب دیتے اور وہ پر جوش ہو جایا کرتی۔

''یہ اپنی روبی بھی تو ہے۔ اتنی اچھی ہے۔ کیا خیال ہے دادو اسے نہ بھائی کی دلہن بنا دیں.....''

مستقیم غیر متوقع طور پر آیا تھا اس کی بات پر بے حد سنجیدگی سے بولا تو دیا نے اس سے بھی کہیں بڑھ کر سنجیدگی کا مظاہرہ ضروری سمجھا تھا۔

''تمہیں تو اس حوالے سے کوئی اور پسند تھی نا''

''آپ کو زینب بھی کہاں پسند تھی۔ اب کیا فرق پڑتا ہے کہیں بھی شادی ہو جائے''

''فرق تو پڑتا ہے۔ اگر پسند نہیں تھی تو ناپسند بھی تو نہیں تھی۔ ویسے بھی پسند بدلنے میں دیر کہاں لگتی ہے''

وہ غیر سنجیدہ ہوتا تو دیا اس کی بات پر دھیان ہرگز نہ دیتی اب اس کا چونکنا فطری تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ ٹھٹکی تھی۔

''میں زینب سے شادی پر تیار ہوں دیا!''

اس کے جواب پر دیا کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس نے ہونٹ بھینچے تھے اور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

''ٹھیک ہے کر لیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے''

''میں یہ شادی تمہاری پسند کی گئی لڑکی سے کروں گا تو یہ تم پر بھی لازم ہے کہ میرے پسند کیے ہوئے لڑکے کو قبول کر لو''

''مستقیم کی بات پر وہ بھک سے اڑ گئی تھی۔ اس نے متاسفانہ نظروں سے مستقیم کو دیکھا تھا۔''

''آپ مجھے فورس کیوں کر رہے ہیں بھائی! جب کہ آپ جانتے ہیں میں اسے پسند

نہیں کرتی''

وہ بے ساختہ چیخ گئی تھی۔ مستقیم کچھ دیر تک اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔

''تم محب عبدالقدوس کو تو پسند کرتی ہو نا؟ کیا خیال ہے اگر اس کا پروپوزل آئے اور تم.....''

''السلام وعلیکم!''

اسی پل غلام حسین زور سے کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور زوردار طریقے سے سلام کیا اس کی نگاہیں مستقیم پر جمی تھیں جن میں خفگی کا رنگ بے حد گہرا تھا۔ مستقیم نے سرخ چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچے اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔ دیا جو خجالت اور کسی حد تک تلخی کا شکار تھی غلام حسین کے سامنے کے ساتھ ہی ناگواری کے احساس سمیت اٹھ کر باہر جا رہی تھی کہ وہ بے اختیار اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دیا کے تو جیسے سر پر لگی تھی۔ جبھی وہ برہمی و درشتی سمیت اسے گھورتی پھنکار زدہ لہجے میں بولی تھی۔

''راستے سے ہٹو''

''اگر میں کہوں آپ کے سارے راستے میری طرف آتے ہیں تو.....؟''

''بکواس بند کرو۔ سمجھے تم؟ اور اپنی حد میں رہنا سیکھو''

اس کی بڑھتی ہوئی جسارتیں دیا کا دماغ خراب کرنے کو کافی تھیں۔

''میں اپنی حدود کا دائرہ ہی تو وسیع کرنا چاہتا ہوں دیا! مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ اگر تمہارے پاس کسی چیز کا ذخیرہ موجود ہو اور کوئی سوالی بن کر تمہارے در پر آئے تو تم اسے خالی لوٹا دو گی''

وہ واقعی سوالی بنا کھڑا تھا۔ دیا نے متنفرانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''ہر سوال پورا کر دیئے جانے کے قابل بھی نہیں ہوتا''

وہ زہرخند سے بولی تھی۔ غلام حسین کے چہرے پر اضمحلال بکھر گیا۔

''اور اگر وہ خدا کا واسطہ دے کر اپنا سوال دہرائے تو پھر بھی خالی لوٹا دو گی؟''

دیا نے بے طرح سے چونک کر اسے دیکھا تھا پھر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

غلام حسین نے دیکھا اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے اور رنگ بے تحاشا سرخ تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی ساکن کھڑی رہی تھی پھر پلٹ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ غلام حسین نے سرد آہ بھری تھی اور پیشانی کے بال مٹھی میں جکڑ کر سر جھکا لیا۔

☆☆☆

غرور و ناز و نخوت چھوڑ کر انسان ہونا ہے
بہت دشوار ہوں اب تک مجھے آسان ہونا ہے
یہ دانائی تو گمراہی کی جانب کھینچ لیتی ہے
اس سے دست کش ہو کر مجھے نادان ہونا ہے
جو الجھی سوچ رکھتا ہو الجھنا اس سے بے معنی
مجھے سلجھی ہوئی تحریر کا عنوان ہونا ہے
یہ کیسے فاصلے کردار و شخصیت میں ملتے ہیں
بکھر کر مر رہا ہوں اب مجھے یکجان ہونا ہے
یہ انسانوں نے اخلاقی بلندی سے ہی سیکھا ہے
نہیں احسان کرنا سرتاپا احسان ہونا ہے

اس کے روم روم میں اذیت کا سمندر موجزن تھا تو دل و دماغ میں نفرت و بے بسی اور لاچاری کے احساس نے کانٹے اگا دیئے تھے۔ کتنی آزمائشوں سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ اپنے ملک، اپنے شہر۔ مگر یہاں آ کر کیا ملا تھا اسے۔ سوائے تکلیف اور اذیت کے سلگتے احساس کے۔ سرحد سے لے کر شہروں دیہاتوں میں ہر جگہ امریکی فوج نے ناکے لگا رکھے تھے۔ گھنٹوں کے حساب سے پڑتال کے لیے وہاں انتظار میں رکنا اور ان کے بے تکے سوالات کے جواب دیتے اس کا خون کھولتا رہا تھا۔ حکمرانوں کی غلطیوں کا نتیجہ بھگتنے کو وہ رہ گئے تھے۔ جن کا کیا دھرا تھا وہ غیر ملکوں میں پناہ حاصل کئے پھر بھی عیش میں تھے۔

ان کے لیے یہی آزمائش کم نہیں تھی کہ بغداد کی سڑکوں پر امریکی فوج کو دندناتے دیکھنا اس کی غیرت ایمانی کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ کر افسردہ ہوتا رہا کہ عراقی ری پبلکس گارڈ جنہیں عراق کی حفاظت کے لیے مرجانے کا عہد دلایا جاتا ہے۔ مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اسے یاد آیا جب احمد عبداللہ نے کہا تھا۔ کاش صدام نے اور اس کے بیٹوں نے عراقی نوجوانوں سے عراق کی حفاظت کی بجائے عالم اسلام اور ملک و ملت کی حفاظت کا حلف لیا ہوتا۔ ان لوگوں نے صدام اور اس کے محلات کی حفاظت کا عہد کیا تھا اور جب جنگ شروع ہونے سے پہلے ان محلات کے مالک اور صدام ہی بھاگ گیا تو وہ اپنی جان کیوں ہلکان کرتے۔ تکریت و موصل کرکوک و دماوی اور فلوجہ میں جو مزاحمت ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ وہاں کے لوگوں کی دینداری اور قبائلی پس منظر تھا۔ یہ لوگ جو رجعت پسند کہلاتے تھے۔ عام عراقیوں سے مختلف تھے

اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ اس کا گھر ویران تھا۔ اس کی ہر قیمتی شے لوٹ لی گئی تھی۔ مرکزی دیوار کو توڑ دیا گیا تھا۔ گھر کے اندر بھی فائرنگ سے ٹوٹی دیواروں نے اس پر آشکار کیا تھا یہاں کبھی کیا تباہی مچی تھی۔ آس پاس کے تمام گھروں کا حال بھی اس کے گھر سے مختلف نہیں تھا۔ تقریباً سبھی گھر ویران تھے کسی ایک میں کوئی ایک آدھ فرد موجود تھا۔ باقی کے لوگ ہجرت کر چکے تھے یا پھر مار دیئے گئے تھے۔ خود اس کی ماں کے متعلق اسے خبر ملی تھی کہ انہیں شہید کر دیا گیا تھا۔

اُم جان! اس کی ام جان کو امریکی فوجی نے کس بے دردی سے مارا تھا کہ ان کا خوبصورت چہرہ اپنے وزنی بوٹ کے نیچے روند ڈالا تھا۔ وہ چہرہ جو اسے دنیا کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین لگتا تھا۔ زخموں سے چور ہوتے کس درجہ کرب کا شکار ہوا ہوگا یہ سوچ اتنے دنوں سے اس کی نیند اڑائے ہوئے تھی اپنے گھر کی ٹوٹی ہوئی دہلیز کے ملبے پر بیٹھا بہت دیر تک وہ روتا اور سسکتا رہا تھا۔ وہاں کسی نے اسے چپ نہیں کرایا۔ وہاں جگہ جگہ اس طرح کے مناظر ہر سو بکھرے ہوئے تھے۔ جو خود روتے اور بالآخر خود ہی چپ بھی کر جاتے تھے۔

اس کے بابا بیمار تھے۔ عراق پر ٹوٹنے والی اس قیامت کو ان کا دل سہار نہیں سکا تھا اور حملے کے پہلے دن اس اطلاع کی خبر پا کر ان کے دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ اس کا چھوٹا بھائی ابو سعد لاپتہ تھا کچھ لوگوں کا خیال تھا وہ امریکی فوج کی تحویل میں ہے۔ جبکہ ساتھ کے پڑوسی حسام احمد نے بتایا تھا شاید وہ موصل چلا گیا ہو اور مزاحمت کی جنگ لڑنے والوں میں شریک ہو گیا ہو۔ ابن زید نے ابو سعد کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر وہ اسے مل نہیں سکا تھا۔ ابن زید تنہا ہی دکھ پر روتا سسکتا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی وہ یہاں کی تباہیاں دیکھے یا واپس لوٹ جائے اس کے بابا کی بہت شدید خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر اچھے مقام پر پہنچے اور اپنے ملک کا نام روشن کرے۔

وہ جمعے کا دن تھا۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا بچے کھچے سامان سے ملنے والا تصویروں کا البم نکال کر پرانی یادیں تازہ کرتا پھر سے آنسو بہا رہا تھا جب قریبی مسجد سے امام صاحب کے خطبے کی آواز اس کی سماعتوں میں اترنے لگی تھی۔ اس نے بوجھل دل کے ساتھ البم رکھا اور نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کی جانب آ گیا۔ مسجد کی حالت بھی ان کے گھروں سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ مسجد کو جگہ جگہ سے نقصان پہنچایا گیا تھا۔ دیوار پر آویزاں قرآنی آیات کی کیلی گرافیز اپنی جگہ پر موجود نہیں تھیں۔ صرف یہی نہیں مہنگے اور گداز کارپٹ بھی غائب تھے۔ اس کا دل پھر سے خون رونے لگا۔

زمین پر آگ تھی تارے لہو میں لتھڑے تھے
ہوا کے ہاتھ میں خنجر تھا اور پھولوں کی

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ایک دہشت تھی
ارادے ٹوٹنے والے تھے اور امیدیں
حصارِ دشت میں بکھری تھیں اس طرح جیسے
نشان بھٹکے ہوئے قافلوں کے کھو جائیں

گھٹنوں میں سر دیئے اس کا سسکتا وجود اس پل تھما تھا جب کسی کا تسلی آمیز انداز میں رکھا ہاتھ اس نے اپنے کاندھے پر محسوس کیا تھا۔ ابنِ زید نے آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سمیت سر اونچا کر کے دیکھا چالیس سے پچاس سال کے درمیان وہ ایک بارعب اونچا لانبا عراقی تھا جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں متانت اور اپنائیت کے رنگ تھے۔

''حوصلہ کرو بیٹے! یوں آنسو بہانے سے بھلا نقصان کہاں پورے ہوا کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا مانگو، اللہ پر بھروسہ کرو۔ آزمائش کا سفر بڑا کٹھن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پل پل رلاتا ہے۔ اگرچہ یہ گھڑیاں طویل دکھائی دیتی ہیں۔ بار بار ٹوٹتی امید ناکامی اور مایوسی کا احساس دلاتی ہے۔ مگر یہی تو امید جینا بھی سکھاتی ہے۔ اس آزمائش کے وقت میں اگر صبر کا دامن ہاتھ میں رہ گیا تو سمجھو ایک دن فتح بھی ضرور حاصل ہوگی۔ اس انعام کی صورت جو آزمائش اور مصیبت کے بعد عطا ہوتا ہے''

''کب تک۔ کب تک انتظار...... کتنا انتظار اور کتنی قربانیاں، سب کچھ تو چھن گیا ہے ہم سے۔ یہ سفر ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ اس کا اختتام کیوں نہیں ہوتا؟ اب یہاں کیا رہ گیا ہے؟ میں یہاں نہیں رہ سکتا''

''یہ وطن اس کی مٹی ہمارے پیاروں کی قبریں یہ سب ہمارا اثاثہ ہیں۔ انہیں چھوڑ کر نہیں جایا جاسکتا بیٹے! ہمیں اس وطن کی خاطر ہر آزمائش کو سہنا ہوگا۔ بھلے ہاتھ اور دامن لہو سے بھر گئے ہیں مگر اپنے وطن سے الگ ہوتے ہی ہماری شناخت کھو جائے گی''

وہ جو ساری عمر حوصلہ مند رہا تھا۔ مرد دلوں میں امید جگایا کرتا تھا اس پل اتنا نڈھال اور پژمردہ تھا۔ وہ خود کو ہارا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

''حوصلہ کرو بیٹے یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ باطل پر حق غالب ضرور آئے گا انشاء اللہ! باطل پر حق غائب آیا ہی کرتا ہے''

ابن زید نے آنسو پونچھ لیے تھے اور خود کو سنبھالتے ہوئے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ دعا میں امام صاحب پر بھی رقت طاری ہوگئی تھی۔ جب انہوں نے حالات کی بہتری کی اللہ سے دعا کی تھی۔ وہ بہت دیر تک رو رو کر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی واپسی کے دعا گو تھے۔ جیسے ہی

انہوں نے آمین کہہ کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ لوگوں نے اٹھتے ہی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر مسجد کے دروازے کی جانب واپس جانا شروع کر دیا۔ تبھی اچانک یکے بعد دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے یہ دھماکے اتنے زوردار تھے کہ مسجد کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ یکا یک چاروں اطراف ایک کہرام مچ گیا تھا۔ اردگرد موجود لوگ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ مسجد کے اندر زخموں سے چور نمازی کراہ رہے تھے۔ کچھ اپنی جان جان آفریں کو سونپ چکے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان شہریوں نے اور بچ جانے والے نمازیوں نے اپنے زخمی ساتھیوں کو باہر نکالا اور وہاں موجود ان کاروں میں جو مقامی شہری انہیں ہسپتال پہنچانے کو لائے تھے ڈال کر ہسپتالوں کا رخ کیا انہی میں ابنِ زید بھی شامل تھا۔ اگلے تین چار منٹ تک وہاں امریکی بکتر بند گاڑیاں بھی پہنچ چکی تھیں اور انہوں نے چاروں طرف سے مسجد کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ لیکن بکتر بند گاڑیوں کے پہلو میں موجود ایم پی ڈبلیو جیپوں میں سے انٹرنیشنل چینل والوں نے ایسے کیمرے فٹ کر دیئے اور براہِ راست دنیا بھر کے ٹی وی اسٹیشنوں پر تباہی و بربادی کے اس منظر کو دکھانے لگے۔ جبکہ صحافی حضرات اندر گھس کر حالات جاننے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ موقع پر موجود ٹی وی چینل کے نمائندے پہلے سے تیار شدہ کہانی بھی دنیا کو سنا رہے تھے۔

''کہانی کے مطابق بغداد میں شیعہ سنی فسادات کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور وہ گزشتہ تین چار روز کے واقعات سنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ موجودہ واقعہ بھی پچھلے واقعات کا شدید ردعمل ہے اور اب یہ سلسلہ رکتا ہوا نظر نہیں آتا''

انہیں یہ معلومات کہاں سے ملی تھیں؟ کس نے دی تھیں، ان معلومات کا پس منظر کیا تھا؟ اس میں سچائی کس حد تک تھی اور سازش کس حد تک۔ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کا وقت تھا نہ وہ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے آئے تھے۔ وہ اپنے اپنے چینلوں کے ملازم تھے اور انہیں ایک خاص مشن کے ساتھ، ایک خاص منصوبے کے ساتھ یہاں بھیجا گیا تھا اور وہ اس مشن میں تمام تر توانائیوں کے ساتھ عمل پیرا تھے۔

☆☆☆

پھر اسی رات دیا نے دادو کو اپنی رضامندی دے دی تھی۔ دیر تو اس کے انکار کی وجہ سے تھی، ہاں ہوئی تو ہر سو خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ اور جب ان کی منگنی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں عین انہی دنوں بابا جان کو ڈیفنس میں اپنی پسند کا گھر بھی مل گیا۔ شفٹنگ کا مرحلہ ہرگز اتنا دشوار ثابت نہیں ہوا یہاں جو سامان تھا اس میں سے اہم اور خاص چیزیں ہی بابا

جان نے دادو کو اٹھانے کا کہا تھا۔ نیا گھر فل ڈیکوریٹڈ تھا تمام آسائشوں سے آراستہ پراستہ۔ جانے اس کے دل پر ہی کوئی بوجھ تھا اپنا گھر چھوڑتے رونے کا بہانہ مل گیا۔ نئے گھر میں اس کا بیڈ روم بہت شاندار تھا۔ مگر اسے پرانے گھر کی یاد ستاتی تھی۔ اداسی دل میں گھر کر گئی تھی۔ غلام حسین نے بالخصوص اس کا شکریہ ادا کیا تھا تو اس پل اس کی آنکھوں کے رنگ کتنے دلکش ہوئے تھے۔ دیا اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ جیسے جیسے منگنی کے دن نزدیک آرہے تھے جانے کیوں اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اللہ کی خاطر کیا جانے والا کام خالصتاً دل کو خوشی بخشتا ہے مگر وہ دل سے خوش نہیں تھی۔ مجبوراً کر تو لیا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ اکثر اپنے احساسات سے خوفزدہ ہو جایا کرتی مگر یہ بھی حقیقت تھی وہ دل سے خوش نہیں تھی۔ کبھی کبھار تو عجیب سی وحشت اسے گھیر لیتی تھی تو اس کی وجہ اس کے اپنے دل کی کجی تھی۔ وہ خود کو شعوری نہ سہی لاشعوری طور پر غلام حسینسے برتر سمجھنے کی غلطی کر رہی تھی۔ وہ غلام حسین کو اپنے قابل نہیں گردان رہی تھی۔ اس کے باوجود کہ نیتوں اور دلوں کے حال سے اللہ ہی بس آگاہ ہوتا ہے اور کون اس کے نزدیک کس سے اہم ہے یہ بھی وہی جاننے والا ہے۔ مگر وہ اپنی خودی کے زعم میں مبتلا اس اہم نقطے کو فراموش کر گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ انہیں احساسات کے ساتھ دل تنگ پڑتا محسوس کرتے اپنے کمرے سے نکل کر لان میں آگئی تھی۔

سفیدے کے درختوں کے درمیان گھری روش پر بے خیالی میں چلتے اس نے دھیان نہیں دیا سیاہ مارگلہ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور فرنٹ سیٹ پر براجمان غلام حسین کے چہرے پر اسے روبرو پاتے ہی گہری مسکان بھرتی چلی گئی تھی۔

”ہائے ینگ پریٹی گرل!“

وہ اس کے نزدیک پہنچ کر آہستگی سے کہہ کر ہنسا۔ بھاری آواز کی کھنک اور بشاشت اس کی بے پایاں خوشی اور طمانیت کی غماز تھی۔ دیا جو اپنے دھیان میں تھی اور اس کی آمد سے یکسر غافل تھی اچھل سی گئی اور اسے دیکھ کر نگاہ کا زاویہ بدلتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

”کیسی ہو دیا؟“

اس کی مسکراہٹ بہت دل آویز اور کھلی کھلی تھی۔

”دادو اندر ہیں اور بھائی گھر پر نہیں“

دیا نے جیسے اس سے جان چھڑانے کا طریقہ نکالا تھا۔

”مگر بندہ آپ سے ملنے آیا ہے جناب!“

وہ اپنی بات کہہ کر شریر نظروں سے اس کا سرتاپا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ ہلکے

فیروزی سوٹ میں دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے وہ کھلتے ہوئے گلاب جیسی مہکی مہکی شاداب نظر آتی تھی اور اس کی روح میں جیسے تازگی بھر رہی تھی۔ دیا نے خود پر ضبط کے بند باندھے اور ہونٹ بھینچتے ہوئے قدموں کا رخ موڑ لیا۔ بہرحال وہ اس کے ساتھ تنہائی میں کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔

”تم خوش ہو نا دیا؟“

غلام حسین اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ چکا تھا۔ بے حد عجیب انداز میں بولا۔ دیا اس کا جواب دینے کو رکی نہیں تھی۔ غلام حسین وہیں ساکن کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے ہر طرح سے اپنی تسلی کرالی تھی مگر حاصل وصول کچھ بھی نہیں تھا صالح ایک ہفتے سے لاپتہ تھا محبّ عبدالقدوس خود بھی اس کے گھر والوں سے جا کر ملا تھا اور یہ جان کر صالح کسی کیس کے سلسلے میں مصروف ہے۔ اس نے گھر والوں کو یقیناً یہی بتا کر بے فکر کیا ہوگا محبّ عبدالقدوس کا رہا سہا اطمینان بھی رخصت ہو گیا تھا اور دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ ایس ایچ او احد کے ذریعے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ احد صالح کہاں تھا۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بھی کسی کو بتائے بنا چلا گیا تھا۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ ان لوگوں کی شرط یہی تھی کہ چرائی گئی ملک کے اہم رازوں کی فائل واپس مل سکتی تھی کہ اگر وہ تنہا ان لوگوں سے ملتا۔

ایک لمحے کو محبّ عبدالقدوس کو صالح کی بچگانہ حرکت جو سراسر حماقت اور جلد بازی پر محمول کی جا سکتی تھی یہ بے تحاشاہ غصہ آیا تھا۔ کتنی آسانی سے وہ ان شاطر اور مکار لوگوں کے پھیلائے جال میں پھنس گیا تھا۔ یہ سمجھ داری تو نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ ہرگز بھی سمجھ داری نہیں تھی کہ یوں موت کے کنویں میں چھلانگ لگائی جاتی وہ بھی اس صورت کہ حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا۔ اتنے کڑے حالات میں جبکہ ملک ہر سمت سے خطرات میں مبتلا تھا۔ اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سنبھالنے والے چند گنے چنے سہارے تھے جن میں ایک صالح کا نام بھی شامل تھا ورنہ جڑوں کو کھوکھلے کرنے والے اور غافل لوگوں کی ہر سو بہتات تھی۔ مخلص، وفادار، پولیس آفیسرز کی تعداد تو انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ محبّ عبدالقدوس کو رہ رہ کر یہ ملال کھاتا تھا۔ کم از کم صالح کو اس سے مشورہ تو کرنا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود بھی کہ صالح اوپر سے ملنے والی دھمکیوں اور آرڈرز پر دل برداشتہ تھا۔

”جب سارا سسٹم ہی خراب ہے تو کہاں تک صبر کا دامن ہاتھ میں تھما رہ سکتا ہے بھلا؟“

جب وہ آخری بار محبّ عبدالقدوس سے ملنے آیا تھا تو کتنا ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔

”یہاں حق پر ثابت رہنا بھی دشوار امر ہے۔ ہماری فیلڈ میں بد دیانتی کرپشن کا ہر سو

طوطی بول رہا ہے وہاں مجھ جیسوں کی دال گلنی بہت مشکل ہے جو صرف عہدے کے لحاظ سے ہی کمتر نہیں ہے حیثیت کے لحاظ سے بھی کمزور ہے۔ پھر میں لڑوں بھی تو کس بیس پر میرے اختیارات بے حد محدود ہیں۔ ہمارے ہاں پولیس کے شعبے کی مثال تو ایسے حمام کی ہے جہاں رہنے والے تمام لوگ ننگے ہیں۔ وہاں اگر کوئی کپڑے پہنے آجائے تو وہاں موجود سب ننگے اسے نوچتے گھسوٹتے اس کے کپڑے پھاڑ کر اسے بھی اپنے جیسا کرنا چاہتے ہیں یا پھر مار کر ختم کر دینا چاہتے ہیں تا کہ وہ سب ایک جیسے ہی نظر آئیں۔"

اس کے لہجے میں دکھ اور یاسیت کی تھکن تھی۔ محبّ عبدالقدوس کے چہرے پر اضمحلال بکھر گیا تھا۔ صرف پولیس ڈیپارٹمنٹ نہیں صالح! ہر ادارہ آج کل ایسی ہی صورت حال کا شکار نظر آتا ہے کرپشن کی لعنت ہر جگہ اپنے پنجے گاڑھ چکی ہے۔ کون سی جگہ بچی ہے؟ مگر ہمیں اس صورت حال کو دیکھ کر صرف دل برداشتہ نہیں ہونا۔ اپنے حصے کی لڑائی لڑنا ہے۔ شعور بیدار کرنا ہے۔ اپنی طاقت کا مثبت استعمال کرو اور حق پر ڈٹے رہو۔ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور خدا کے حکم کی تعمیل بھی۔ اسی میں بقا ہے۔ مذہب کی بھی اور ملک وقوم کی بھی۔ تنہا ہونے سے خائف نہ ہو۔ اکائی کی طاقت کو فراموش نہ کرو۔ خدا ہے نا مددگار! اسی پر بھروسہ رکھو۔ اس کی ڈوبتی ہوئی ہمتوں کو محبّ عبدالقدوس نے اپنے الفاظ سے سہارا دیا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ سیل فون پر مسلسل وائبریشن ہوئی تب وہ چونکا تھا جب رحیم نے اندر آ کر اس کی آنکھوں کے آگے موبائل لہرایا تھا۔

"کہاں گم ہو؟"

رحیم مسکرا کر استفسار کر رہا تھا وہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا۔ سیل فون کی اسکرین پر چمکتا نمبر اسے ایک دم الرٹ کر گیا۔

"ملا اپنے انسپکٹر کا سراغ؟"

بڑا ہی تیکھا کاٹ دار طنز سے بھرپور لہجہ تھا۔ وہ خاموش لب بھینچے بیٹھا رہا۔

"یہ کوئی پوشیدہ خبر تھی یا راز جسے تم ڈھونڈ نکالتے؟"

وہی زہر خند آواز پھر اس کی سماعتوں میں صورِ اسرافیل بن کر اتری۔

"بہت بڑا جگرا ہے تمہارا۔ سنا ہے گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی بڑی دلیری سے تم اپنے فرائض کی انجام دہی کو اہمیت دیتے ہو۔ بلے بلے! لال مسجد والے سانحے میں جب ہر سمت گولیاں برستی تھیں تم نے اسی عمارت کی چھت پر لیٹ کر اندر کی اور بڑی سچی پکی خبریں نکال کر

حقائق کو لوگوں کے سامنے رکھے تھے۔" گویا اس کا تمسخر اڑایا جا رہا تھا۔ محبّ عبدالقدوس ہونٹ بھینچے خاموش رہا حالانکہ اس کے خون میں غصے کا ابال بپھرتے ہوئے تند خیز دریا کی طرح امڈ رہا تھا۔

"تم یقین کرو گے کہ وہ تمہارا یار آج کل ہمارا مہمان بنا ہوا ہے۔ جو کر سکتے ہو کر لو شاباشے!"

ایک طویل اور مکروہ قہقہہ گونجا پھر رابطہ کٹ گیا۔ محبّ عبدالقدوس نے متغیر چہرے کے ساتھ سیل فون کان سے ہٹا کر بے جان سے انداز میں دوبارہ ٹیبل پر ڈال دیا۔ عبدالرحیم نے اس کی سرخ دہکتی رنگت کو دیکھا۔ اس کا سر جھکے ہونے کے باعث اس کے لمبے ریشمی سلکی بال اس کے چہرے کا احاطہ کر گئے تھے۔ اور دہکتی ہوئی آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے کسی جھاڑی کے پیچھے سے خونخوار درندہ جھانک رہا ہو۔ عبدالرحیم نے بنا کچھ کہے بس اس کا کاندھا رسانیت سے تھپکا تھا۔

☆☆☆

صفِ ماتم بچھاؤ
آؤ ان کو یاد کرتے ہیں
جو ہم میں نہیں رہے اب
وہ جو روٹی کمانے کو گھر سے نکلے تھے سویرے کو
انہیں معلوم ہی کب تھا
زباں اک جرم ہوتی ہے
وہ بھی ایک مجرم میں
وہ اس بستی میں رہتے ہیں
جہاں ہر شخص گونگا ہے
جہاں ہر شخص بہرہ ہے
یہاں آواز کے قاتل زباں کو کھینچ لیتے ہیں
صف ماتم بچھاؤ
پر کوئی بھی بات مت کرنا
ہمیں خاموش رہنا ہے
نیا سورج نکلنے تک

اٹھائیس جولائی 2010ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں بدقسمت الفاظ سے لکھا جائے

گا۔ نائن الیون کے بعد دنیا میں ایک رول بنایا گیا کہ پریذیڈنٹ اور پرائم منسٹر کے گھر کے آس پاس نو فلائی زون پر کوئی جہاز اڑتا دکھائی دے تو اسے ایئر کرافٹ گن سے فائر کر دیا جائے اور آج کے دن ایسا ہی کیا گیا تھا۔ جس کو موسم کی مناسبت سے حادثہ بتایا جا رہا ہے جبکہ یہ ایک حادثہ نہیں ہے۔ دو افراد کی جان کی خاطر ایک سو انسٹھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس جہاز کو ایئر کرافٹ گن سے فائر کیا گیا ہے یہ انکشاف جس ٹی وی پروگرام میں کیا گیا اسے بیچ میں ہی کٹ کر دیا گیا۔

اسوہ نے اخبار لپیٹ دیا۔ ابنِ زید کا یہ کالم قریباً آٹھ نو ماہ قبل شائع ہوا تھا تب بھی کسی کے دل پر اثر نہیں ہوا تھا۔ قوم واقعی ہی بے حس ہو گئی ہے؟

''السلام علیکم!''

وہ کروٹ کے بل صوفے پر لیٹی انہی سوچوں میں غلطاں تھی جب سکندر کی آواز سن کر ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔ وہ لاؤنج میں ہی صوفے پر لیٹ گئی تھی۔

''وسلام! ابنِ زید اوپر اپنے کمرے میں ہیں''

اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتے ہوئے اس نے کسی قدر رکھائی سے جواب دیا۔

''ان سے بھی مل لوں گا۔ فی الحال تو تم سے بات کر لوں''

''مجھ سے؟''

وہ حیرانی سے اسے تکنے لگی۔ سکندر کے لبوں کے گوشوں میں مسکراہٹ بے حد گہری تھی۔

''اسوہ میں جو بات تم سے کہنے جا رہا ہوں پلیز اسے دھیان سے سننا اور بہت سوچ کر مجھے اس کا جواب دینا''

''کون سی بات؟''

اسوہ کی الجھن کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

''اماں یہاں آنا چاہ رہی ہیں۔ نانو سے تمہارے لیے بات کرنے۔ مگر میں نے مناسب سمجھا کہ خود پہلے تم سے پوچھ لوں''

''کیا پوچھ لو؟''

اس نے اجنبی کڑے انداز میں اسے دیکھ کر بھنوؤں کو سوالیہ انداز میں جنبش دی۔

''یہی کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں اور زندگی کا باقی ماندہ سفر تمہارے سنگ گزارنے کی خواہش رکھتا ہوں''

اپنی بات کے اختتام پر وہ مسکرایا تھا۔ جبکہ اسوہ کو اس کی اس انوکھی خواہش نے صحیح معنوں

میں آگ لگا دی تھی۔ مگر وہ خاموش لب بستہ کھڑی رہی۔ اس نے دروازے کے باہر سے گزرتے ابنِ زید کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ سکندر کا رخ دوسری جانب تھا اور وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

''بولو نا اسوہ'' مجھے کچھ تو اندازہ تھا کہ یہ تمہارے لیے بہت غیر متوقع ہو گا''

''تم صحیح کہتے ہو سکندر! مجھے سوچنے کو وقت دو''

اس نے گویا سکندر کو نہیں اپنے تئیں ابنِ زید کو سنایا تھا۔ جبکہ سکندر کے چہرے پر یکلخت روشنی سی پھیل گئی تھی۔

''شیور وائے ناٹ! میں انتظار کروں گا''

وہ دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا۔ اسوہ نے جانے کب کا رکا ہوا سانس لیا اور تھکے ماندے انداز میں صوفے پر گر گئی تھی۔ چند دن قبل جب اس نے ابنِ زید سے اپنے سوال کا جواب مانگا تھا تو ابنِ زید کے صاف انکار پر وہ کتنی دیر کو بھونچکی رہ گئی تھی۔

''بھلا اس جیسی لڑکی کو بھی کوئی انکار کر سکتا تھا''

''آپ میری توہین کر رہے ہیں ابنِ زید؟''

وہ حواسوں میں لوٹی تو چیخ پڑی تھی۔ ابنِ زید جواباً سکون سے بولے تھے۔

''تم بھی تو مجھ پر ترس کھا رہی ہو مگر میں نے کوئی شکایت نہیں کی''

''ابنِ زید......''

اپنے جذبات کی تذلیل پر وہ چلا اٹھی۔

''کیا کمی ہے آپ میں؟ کیوں ترس کھاؤں گی میں؟''

اس نے غم و غصے کی زیادتی سے ابنِ زید کو جھنجوڑ دیا تھا۔

''اسی سال بیس کی پوری ہوئی ہو نا تم؟'' میں چالیس سال کا ہوں۔ ایک ٹھکرایا ہوا انسان جو اپاہج بھی ہے۔ ایسے انسان سے ہمدردی تو کی جا سکتی ہے محبت نہیں''

وہ کس درجہ شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار تھے۔ اسوہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''آپ مجھے اتنا گھٹیا سمجھتے ہیں ابنِ زید؟ آپ نے کبھی غور سے آئینہ دیکھا ہے؟ ہر عورت کو ایک پیمانے میں مت تولیں۔ اگر ہر عورت شکل و صورت میں دوسری سے مختلف ہو سکتی ہے تو اس کا کردار اور عمل کیوں مختلف نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو دل سے نکال کیوں نہیں دیتے کہ میں نے آپ پر ترس کھا کر آپ سے اپنی خواہش ظاہر کی ہے نہ ہی نفس کے ہاتھوں اتنی بے بس ہوئی ہوں کہ آپ کو آپ سے مانگ لیا۔ ہوس اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے ابنِ زید''

''ہاں ہوتا ہے فرق۔ اور عورت اپنے جذبوں میں ہمیشہ بے بس اچھی لگتی ہے۔ مجھے عورت کا اپنے جذبوں میں اس حد تک بہک جانا ہرگز پسند نہیں۔ میں ایک بار دھوکہ کھا چکا ہوں۔ دوسری مرتبہ کیسے اتنی آسانی سے پھر سے لٹنے کو تیار ہو جاؤں۔ سوری ٹو سے مجھ میں نہ تو اس کا اسٹیمنا ہے اور نہ اب ظرف' اور اسوہ کو لگا تھا اس کے وجود کے پرخچے ہوا میں اڑنے لگے ہوں۔ وہ فق چہرے اور آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''آ آپ مجھے ضحیٰ سے کمپیئر کر رہے ہیں ابن زید؟''

اس کے حلق سے بہت دیر بعد پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ ابنِ زید نے دانستہ اس پل اس سے نگاہ چار نہیں کی اور کندھے بے نیازی سے جھٹک دیئے تھے۔

''میں صرف محتاط ہوا ہوں اینڈ ڈیٹ سیک!''

اور اسوہ سے وہاں مزید ٹھہرا نہیں جاسکا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی وہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ کتنے دن بیت گئے تھے مگر اس کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ وہ خود میں ابنِ زید کا سامنا کرنے کی ہمت بھی نہیں پاتی تھی۔ خود ابن زید یقیناً گریزاں تھے اور اب یہ سکندر...... جسے وہ عام حالات میں ہرگز بھی مثبت جواب نہ دیتی مگر اب وہ اتنی دل برداشتہ تھی کہ کچھ سوچے سمجھے بنا بی جان کو اپنا فیصلہ سنا آئی تھی۔

''سکندر اچھا لڑکا ہے بیٹے! مگر اس کی فنانشلی پرابلم ہے۔ دیکھ لو تم ایڈجسٹ کر لوگی'' انہیں بھلا اس جیسی اونچے آورش رکھنے والی لڑکی سے ایسی توقع کہاں تھی جبھی دبے لفظوں میں سمجھانا چاہا تھا مگر وہ کہاں اب اس قابل رہی تھی کہ کچھ اور سوچتی۔

''میں نے سوچنے کے بعد ہی فیصلہ کیا ہے بی جان!''

اس کے لہجے میں رسان تھا بی جان کو خاموش ہونا پڑا۔ پھر اسی دن بہت سارے دنوں کے بعد کالج سے واپسی پر اس کا ابنِ زید سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ ابنِ زید بیرونی دروازے کے آگے کھڑے پوسٹ بکس سے اپنی ڈاک نکال رہے تھے جب اسوہ اپنی سوزوکی کار گیراج میں روک کر اس سمت آئی تھی۔

''السلام وعلیکم!''

ابنِ زید اسے دیکھ کر اپنا کام موقوف کر چکے تھے اسے دھیان سے تکتے ہوئے سلام میں پہل کی۔ اسوہ نے لانبی پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا تو جانے کس جذبے کی پامالی پر آنکھوں کی سطح تیزی سے بھیگتی چلی گئی۔

''وعلیکم السلام!'' کیسے ہیں آپ؟''

وہ سنبھل کر بہت کرب سے گزر کر مسکرائی۔ ابن زید چونک سے گئے۔

''الحمدللہ! ناراضی ختم ہو گئی؟''

اسوہ نے دیکھا وہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔

''شاید میں آپ سے خفا نہیں رہ سکتی''

اس نے پوری سچائی سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر اتنے دن مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟''

''آپ سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا''

اسوہ سر جھکائے وضاحت دے رہی تھی۔

''اس سے قبل بھی ہمیشہ تم خود میرے کمرے میں آیا کرتی تھیں''

وہ سمجھ نہیں سکی ابنِ زید شکوہ کر رہے ہیں یا جتلا رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑی تھیں۔

(تب میں کسی خوش فہمی کا شکار تھی اب وہ آپ نے ختم کر دی) ''میں آپ کو تنگ کرنا نہیں چاہتی''

''اچھی بات ہے''

ابن زید نے ہنکارا بھرا پھر کچھ توقف سے اسے دیکھا۔ وائٹ یونیفارم پر بے بی پنک بڑا سا کلف شدہ دوپٹہ میں بیگ کاندھے پر لٹکائے وہ اپنی عمر سے بھی کہیں چھوٹی کسی نازک سی گڑیا جیسی لگتی تھی۔ انہیں یاد آیا انہوں نے کہیں پڑھا تھا۔ بڑی عمر کا مرد اگر خوبرو ہو اور باوقار بھی ہو تو کم عمر لڑکیوں کے لیے بے پناہ اٹریکشن کا باعث ہوتا ہے۔ اسوہ کی پسندیدگی کے جذبے کو وہ وقتی اٹریکشن سمجھ کر نظر انداز نہ بھی کرتے اگر بیچ میں سکندر نہ ہوتا وہ انہیں آس مندانہ نظروں سے دیکھتا تھا ان کی فیور کا خواہش مند تھا۔ اور ان کا فیور یہ تھا کہ انہوں نے اسوہ کو اپنے الفاظ کی تلوار سے زخمی کر دیا تھا۔ اسے مایوس کر کے وہ اگر دوستی کے رشتے کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے تو سودہ اتنا مہنگا نہیں تھا۔ پھر ان کے خیال میں وہ اسوہ جیسی نوعمر لڑکی کے لیے کسی بھی طرح بہترین ہمسفر ثابت نہیں ہو سکتے تھے وہ بھی اس معذوری کے ساتھ جبھی انہوں نے اسے دانستہ چھوٹا غم دے کر بڑے اور عمر بھر کے پچھتاوے سے بچا لیا تھا اور وہ مطمئن تھے۔

''سکندر دوبارہ بھی آیا تھا؟''

بے خیالی میں ان کی نگاہ اسوہ کے چہرے پر جمی تھی۔ وہ دھوپ چھاؤں کے سنگم میں کھڑی تھی۔ اس کے صبیح گالوں پر اس کی دراز پلکوں کا سایہ لرزتا تھا۔

''وہ ہمیشہ آپ سے ملنے آتا رہا ہے۔ آپ کو اس کے آنے جانے کا زیادہ پتا ہونا چاہئے''

سکندر کے ذکر پر وہ بے حد خفا سی بولی۔ ابنِ زید نے بالخصوص اس کے مزاج کے اس رنگ پر دھیان دیا تھا۔

''ڈونٹ وری! آئندہ اس کی زندگی کے ہر معاملے کے حساب کتاب تمہارے ہاتھ میں آنے والے ہیں۔ مجھے بی جان سے علم ہوا ہے تمہاری اس کے متعلق آمادگی کا کانگریچولیٹ!''

اسوہ کا چہرا دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے تڑپ کر ابنِ زید کو دیکھا یوں جیسے ذبح ہونے والا جانور بے بسی سے قصائی کو دیکھتا ہے۔

''کہیں آپ نے تو اسے میرے پاس نہیں بھیجا تھا۔ اس طرح جلدی جان چھڑانا چاہتے ہوں گے نا مجھ سے؟''

اس کی بدگمانی اور شک کا کوئی انت نہیں تھا۔ ابنِ زید جو اندر جانے کو قدم بڑھا چکے تھے گہرا سانس بھر کے رکے۔

''میں کیوں بھیجوں گا بھلا؟ یہ اس کی اپنی خواہش ہے۔ اچھا لڑکا ہے......''

''ابنِ زید آپ ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو جائیں۔ میں کبھی آپ کو دوبارہ مانگنے نہیں آؤں گی ویسے بھی میں محبت اور عزت کے انتخاب کے مرحلے پر محبت کی بجائے عزت کو چنوں گی محبت کے بغیر زندگی گزاری جا سکتی ہے عزت کے بغیر نہیں، سمجھے آپ!''

سرخ چہرہ، آنسو بہاتی آنکھیں و شدت ضبط سے لرزتے ہونٹ، منہ پر ہاتھ رکھے روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ ابنِ زید ساکن کھڑے تھے۔ اور جب یہ سکتہ ٹوٹا تو تھکن اور اضمحلال ان کے وجود کو اپنے نوکیلے پنجوں میں جکڑتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

چلو یہ مان لیتے ہیں
بڑا لمبا سفر ہے یہ
مگر یہ بھی حقیقت ہے
تمہاری ذات کا سورج
بہت سا راستہ چل کر

میری ہستی میں ڈوبے گا

غلام حسین آج بھی آیا ہوا تھا۔ دادو کے کہنے پر جب وہ چائے بنانے کچن میں آئی تو وہ بھی اس کے پیچھے وہیں آ گیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی اور لاتعلقی کو دیکھتے اس نے کتنے جتلاتے ہوئے انداز میں نظم اس کے گوش گزار کی تھی۔ دیا کے تو گویا وجود میں انگارے سے چیخ گئے تھے مگر سوائے دانت بھینچنے کے وہ کچھ نہیں کر سکی تھی۔

''دادو کے پاس چل کر بیٹھیں میں چائے لا رہی ہوں''

''تمہارا کیا خیال ہے میں ہر روز جو اتنا سفر کر کے آتا ہوں تو نانو کی خاطر آتا ہوں؟''

وہ جتنا بدمزا ہوا تھا اسی حساب سے منہ بگاڑ کر بولا۔ دیا کو اس کی یہ بات سراسر بکواس لگی تھی۔

''تو پھر بہتر ہے نہ آیا کریں''

وہ جواباً تڑخ گئی تھی اور غلام حسین اس کی بے رخی کو پا کر بھی ہنسنے لگا تھا۔

''سمجھا کرو نا یار اپنے ہونے والی جورو سے بے تکلفی اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرنا چاہ رہا ہوں''

اس کی شوخی نقطہ عروج پر جا پہنچی تھی۔ دیا اسی لحاظ سے بھڑک گئی۔

''بے کار کوشش ہے۔ مشرق مغرب کا آپس میں کبھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا''

اس نے جتلایا اور ناخوش گوار تاثرات سمیت نگاہ کا زاویہ بدل کر چائے کا مگ اسی کے سامنے پٹخا۔

یہ شانِ بے نیازی یہ بے خودی کا عالم
بے بات ہو گیا ہے ان کا مزاج برہم
اک پل میں ہم نے دیکھے کیا کیا نظارے
کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے

وہ اثر لیے بنا گنگنانے لگا۔ دیا اتنی زچ ہوئی تھی کہ تنتناتی ہوئی اسے وہیں چھوڑ کر خود کچن سے نکل گئی۔ غلام حسین ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ چائے کا مگ اس نے سلیب پر رکھ دیا تھا۔

''نانو مجھے منگنی نہیں نکاح کرنا ہے''

کچن سے نکل کر وہ دادو کے پاس آ کر فیصلہ کن اور سنجیدہ لہجے میں بولا تھا۔

''کیا مطلب؟ یہ ایکا ایکی تمہیں کیا سوجھی؟''

دادو حیران رہ گئیں۔

"منگنی جیسی فضول رسموں میں وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے نانو۔ سیدھے سیدھے شادی ہونی چاہئے۔ ویسے بھی میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ آج مما کو بھیجوں گا وہ شادی کی تاریخ پکی کرنے آئیں گی۔ ماموں سے کہئے گا انکار نہیں کریں پلیز! مستقیم کو میں خود سنبھال لوں گا"

وہ اسی رسانیت سمیت کہہ کر مضبوط قدم اٹھاتا پلٹ کر چلا گیا۔ دیا جو اس کی بات سن چکی تھی ششدر سی کھڑی رہ گئی تھی۔

باب 4

چلو اس کوہ پر ہم بھی چڑھ جائیں
جہاں جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
سنا ہے اک ندائے اجنبی بانہوں کو پھیلائے
جو آئے اس کا استقبال کرتی ہے
اسے تاریکیوں میں لے کے آخر ڈوب جاتی ہے
یہی وہ راستہ ہے جس جگہ سایہ نہیں جاتا
جہاں پر جا کے پھر کوئی کبھی واپس نہیں آتا
جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطر سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو چاہتے آئے
برا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
کہاں تک اپنے بوسیدہ بدن محفوظ رکھیں گے
کسی کے ناخنوں کا ہی مقدر جاگ لینے دو
کہاں تک سانس کی ڈوری سے رشتے جھوٹ کے باندھیں
کسی کے پنجۂ بے دردی سے ٹوٹ جانے دو
پھر اس کے بعد تو اک سکوتِ مستقل ہوگا
نہ کوئی سرخرو ہوگا نہ کوئی منفعل ہوگا

یہ حالات کی دل شکنی ہی تھی کہ جس نے اس پر اس درجہ مایوسی طاری کی تھی کہ ہیجان اور وحشت کے آگے ہار کر اس نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ کر خود کو ان تمام اذیتوں سے بچانے کی ایک سعی کی تھی درد تھا لامتناہی درد۔ جو دل میں اور روح میں چکراتا پھرتا تھا۔ وہ شاید اپنی جان اسی

طرح ہار جاتا۔ اگر جو حسام احمد موقع پر نہ پہنچ جاتے۔ انہوں نے اسے ٹریٹمنٹ دی تھی اور زندگی کی اہمیت و افادیت پہ ایک لمبا چوڑا سا لیکچر بھی۔

”مصیبتوں یا آزمائشوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا بھی گناہ ہے میرے بچے! آپ نے تو پھر حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ فولادی مضبوط وجود جس میں خدا نے بے شمار طاقت رکھی ہے کہ یہ چاہے تو ستاروں پر کمند ڈالے یا دریاؤں کے رخ پلٹ دے۔ اسے یوں بے کار جانے کا حق تو نہیں ہے۔ اسے جائز راستے میں استعمال کرو۔ جہاد ایسے حالات میں ہی فرض ہوتا ہے“

انہوں نے کچھ توقف کیا تھا پھر آہستگی و نرمی سے مزید گویا ہوئے تھے۔

”دیکھو بیٹے میں تمہیں کوئی نئی دعوت نہیں دے رہا ہوں۔ صرف تمہارا بھولا ہوا سبق تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔ ہم عراقی مسلمانوں کے لیے جہاد کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم قابضوں اور غاصبوں کے خلاف ہمیشہ سے لڑتے آرہے ہیں اور لڑتے رہیں گے انشاء اللہ۔ یہ لڑائی ہم حکومت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک ذلت آمیز غلامی سے نجات پانے کے لیے لڑ رہے ہیں“

”مگر آپ اکیلے یا میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟“

ابنِ زید نے تحیر میں مبتلا ہو کر بھی ایک بنیادی سوال کیا تھا۔ حسام احمد اس کی بات سن کر تحمل سے مسکرائے تھے۔

”میں اکیلا نہیں ہوں۔ اللہ کا سپاہی کبھی اکیلا نہیں ہوتا بیٹے! خدا مددگار ہوتا ہے۔ اسی کا فضل ہے کہ ہماری جماعت بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ہمارے ہاں جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ میں یہاں رہ کر کام کرتا ہوں۔ شہدا کے بچوں کے لیے فنڈ اکٹھے کرنا ان کی تعلیم و تربیت کرنا اور جہاد کی اہمیت سے تم جیسے نوجوانوں کو آگاہ کرنا“

انہوں نے چند لمحوں کا توقف کیا اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچا پھر اسی جذب سے بولنے لگے تھے۔

”جبر کا ہاتھ کبھی رکنے میں نہیں آتا۔ ہمارے لیے جہاد کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔ نئی نسل کے محبِ وطن ذہن ایک فیصلہ کر چکے ہیں۔ فدائی حملوں کا۔ تمہیں پتا ہے میرے بچے! عراق مہذب قوانین کی حکمرانی کا نکتۂ آغاز ہے۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل ”حمورابی“ نے دجلہ و فرات کے کنارے دو شہر بابل و نینوا بسا کر تاریخ ساز قانون مرتب کیا۔ جسے بعد میں یورپ کے جدید انداز حکمرانی کی بنیاد بنا تھا۔ حمورابی کے (Commendments) اب فرانس و جرمنی و انگلستان و امریکہ میں چربوں اور اصل شکل میں موجود ہیں۔ امریکہ بہادر اس

تہذیب کے درپے ہے۔ جہاں سے انسانیت کو علم و ہنر اور احترامِ آدمیت کا سبق ملا تھا۔ پیغمبران اور اولیاء کرام کی سرزمین عراق اس کا ایک قدیم دارالخلافہ کوفہ جہاں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین حضرت علیؓ نے اپنے قاتل کو شربت پیش کیا کہ وہ گرفتاری کے بعد بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مقامی حکمرانوں کو خلیفۃ المسلمین کا بھولا ہوا سبق یاد کراتا ہے۔ کیا ہم بیرونی امداد کے انتظار میں ہمیشہ کشکول لیے کھڑے رہیں گے اور اپنوں کے خون کا سودا کرتے رہیں گے؟ امریکی آگ مقدس مقامات تک جا پہنچی ہے۔ تو کیا اب بھی ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں یہی تو وقت ہے جب ہمیں سر پر کفن باندھ کر نعرۂ تکبیر کہنا ہے اور جہاد کا حق ادا کرنا ہے“ حسام احمد کی یہ ایمان افروز تقریر اس قدر ہی دل پذیر تھی کہ اس کا روم روم جیسے جاگ اٹھا اور تب ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس نے خود کو جہاد کے ارادے سمیت اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ حسام احمد نے اسے ”موصل“ اپنی جماعت کے سربراہ تلک پہنچا دیا۔ جہاں دیگر نوجوانوں کے ساتھ اس کی بھی جنگی تربیت ہوئی تھی۔ رات کو عشاء کی نماز کے بعد ”عبدالکریم“ انہیں وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ جس میں اہم موضوع جہاد ہی ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے ذہن میں آنے والا سوال بھی ان سے کر سکتے تھے۔

”حضرت صاحب کیا یہ جو سنی اور شیعہ کی مساجد میں بم دھماکے ہو رہے ہیں۔ یہ واقعی سنی اور شیعہ ہی ایک دوسرے کو ختم کرانا چاہ رہے ہیں؟ وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ اتحاد کی سخت ضرورت ہے“ اس روز ابنِ زید کے ایک ساتھی جس کا نام علی رضا تھا نے یہ سوال کیا تھا۔

”اس بات کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ بغداد میں کبھی سنی شیعہ مناقشت پیدا ہو یا اس حوالے سے لوگ ایک دوسرے پر تشدد کریں اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر بموں اور گولیوں سے حملے کریں۔ یہ ناممکن تھا“

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟ ٹی وی چینلز بھی یہی بتا رہے ہیں“

اس مرتبہ ابنِ زید نے استفسار کیا تھا۔ وہ خود اس بات پر بہت الجھتا تھا۔

”یہ اس خطرناک پلاننگ کا حصہ ہے بیٹے جو بہت عرصے پہلے، سی آئی اے موساد کی فائلوں میں تیار ہو گئی تھی۔ بس اب تو اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں طویل عرصے سے یورپی ممالک میں پالا پوسا جا رہا تھا۔ آج کے دن کے لیے۔ امریکن اور یہودی ان پر اتنا سرمایہ لگا رہے تھے آج وہ اس سرمایہ کاری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان واقعات میں جو گزشتہ کچھ دنوں سے سامنے آئے براہِ راست امریکن ملوث ہیں مگر میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر یہ واقعات اسی پلاننگ کا حصہ ہیں اور یہ پلاننگ

موساد اور سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹروں میں تیار کی گئی ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کسی طرح شیعہ سنی مسلمانوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے۔ جس کے بعد وہ اپنے گھناؤنے مقاصد حاصل کر لیں''

''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس روز جن لوگوں نے مسجد سے نکلنے والے نمازیوں پر فائر کھولا تھا۔ وہ بھی عراقی باشندے ہی تھے؟''

ابنِ زید نے دو روز قبل کی بغداد کی مسجد میں ہونے والی واردات کا حوالہ دیا تو عبدالکریم نے متاسفانہ سانس بھر کے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عراقی باشندے تھے اور عین ممکن ہے مسجد ابوحنیفہ میں دھماکہ کرنے والے بھی عراقی باشندے ہوں لیکن ایسے وطن فروش غدار دنیا کی کس قوم اور کس سرزمین پر نہیں ہوتے؟ ان لوگوں کا اپنے ملک سے صرف یہی تعلق ہوتا ہے کہ انہوں اس سرزمین پر جنم لیا اور بس۔ ان میں ضمیر اور ایمان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ بات اب سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب وہ شیطانی ہاتھ جنہوں نے ان مہروں کو آگے بڑھایا ہے یہ چاہیں گے کہ سب مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں۔ آپ کو پتا ہے۔ بدقسمتی سے یہی ہماری تاریخ ہے۔ جب بھی ہمیں زک پہنچائی اپنوں نے پہنچائی۔ پشت میں چھرا گھونپنے والے غیر نہیں تھے، اپنے تھے۔ کربلا سے بغداد تک یہی کہانی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے کردار آج بھی ہمارے معاشرے میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ یہی تاریخ ہے جو وقت کے سینے پر رقم ہو رہی ہے قوموں کی زندگی میں واقعات اور سانحات ایک دم رونما نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے لیے آہستہ آہستہ زمین ہموار ہوتی ہے۔ آنے والے وقت کا مورخ آج کی تاریخ رقم کرے گا تو لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ آج سقوطِ بغداد کی وجوہات کیا ہیں لیکن شاید تب ہم نہ ہوں گے اور آنے والی نسلیں اسے اسی طرح دیکھیں گی جیسے آج ہم سقوط بغداد کو دیکھتے ہیں۔ جسے ہلاکو خان اور چنگیز خان نے تاراج کیا تھا اور ہم کہتے ہیں کہ سارا قصور مسلمانوں کی عیاشی اور آرام طلبی کا تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی اور پیسے کی فراوانی نے مسلمانوں کو بزدل بنا دیا تھا عین ممکن ہے آنے والے وقت کا مورخ بھی ہمارے متعلق کوئی ایسا ہی فیصلہ کرے''

انہوں نے طویل گہرا سانس کھینچا اور خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی۔

''ہمیں اپنے حصے کی لڑائی خود لڑنا ہے۔ ہم کمزور نہیں ہیں اگر ہم متحد ہو جائیں تو پہاڑوں سے ٹکرا سکتے ہیں۔ ہمارے حوصلے چٹانوں کو پاش پاش کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے بچو!

اس پل دکھ صرف اپنوں کے بچھڑ جانے کا ہی نہیں ہے۔ دکھ اپنی آزادی چھن جانے کا بھی ہے یہ دکھ تنہا میرا نہیں ہے۔ عراق کے سینکڑوں بچوں کا ہے۔ ہزاروں مردوں عورتوں کا دکھ ہے۔ آپ لوگوں نے کبھی بے جان چیزوں کو روتے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے مسجد اقصیٰ کو آنسو بہاتے اور مسجد قرطبہ کے آنسو بھی میرے دل پر گرے ہیں۔ میری عمر ہی جہاد میں گزری ہے۔ خود کو اللہ کے کاموں کے لیے وقف کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے میں آپ سے اسی نیکی کا طلب گار ہوں۔ ہم نے موت کو یونہی گلے نہیں لگایا۔ موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے قبل ہم نے بہت سی اذیتیں سہی ہیں۔''

''ہماری آنکھیں پھوڑ دی گئیں''

ہمارے وجود میں میخیں ٹھونک دی گئیں''

''ہمارے اپنوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا''

''ان کی لاشوں کو بھاری جوتوں تلے روندا گیا''

''اب ہم ان لوگوں میں شامل ہیں کہ موت جنہیں گلے سے لگا کر فخر کرتی ہے۔ فلسطین ابراہیم لاشاری کا وطن نہیں تھا مگر انہوں نے وہاں بھی جہاد کیا۔ افغانستان اسامہ بن لادن کا ملک نہیں ہے مگر وہ وہاں جہاد کر رہے ہیں۔ وہ سینکڑوں عرب، لبنانی، فلسطینی جو کشمیر میں بوسینا اور چیچنیا میں شہید ہو رہے ہیں جو افغانستان میں شہید ہو رہے ہیں۔ جو افغانستان میں شہید ہوئے وہ بھی ان کے اپنے وطن نہیں ہیں اور جہاد کے لیے ملکوں اور سرحدوں کو کوئی قید ہے بھی نہیں۔ جبھی جہاں ضرورت محسوس کرو وہاں جہاد کرو۔ اس لیے کہ یہ حکمِ خداوندی ہے۔''

''اس لیے بھی کہ ہم میں اب عراق کے مقدس مقامات کو روتے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

عبدالکریم خاموش ہو گئے تھے اور ابنِ زید کے لبوں پر کبھی کی پڑھی اس نظم کے مصرعے مچل اٹھے تھے۔

موت سے سمجھوتہ کرنا ہماری مجبوری ہے
ہم نے موت کے پروانوں پر
اس لیے بھی دستخط کئے ہیں
کہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں
ہم چاہتے ہیں ہمارے لوگ ہنسیں
اور ہمارے آنے والے بچوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو

ہمارے آنگنوں میں گلاب کھلیں

* ہمارے گھروں کی ہانڈیوں سے اٹھتی زیتون کی خوشبو
ہمیں مطمئن کرے

اس نے آنکھیں موند کر دیوار سے ٹیک لگالی۔اس کی آنکھوں میں آنے والے وقت کے لیے امن اور خوشحالی کے خوشنما خواب تھے اور دل ان کی شرمندۂ تعبیر کے لیے دعا گو تھا۔

☆☆☆

غلام حسین نے بابا جان کو کس طرح قائل کیا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد ہی نکاح کو مان گئے تھے۔دیا نے سنا تو دل تھام کر رہ گئی۔اتنی جلدی کی تو وہ ہرگز بھی قائل نہیں تھی۔ بلکہ اسے تو ابھی اپنے دل کو سمجھانے کو بہت وقت درکار تھا۔

''ایسی کیا بے اعتباری ہے میں کہیں بھاگی جا رہی ہوں کیا؟''

وہ بے اختیار چیخی تھی۔غصہ تو یوں بھی آج کل ہر وقت اس پر مسلط رہا کرتا تھا۔دادو نے سنا اور جیسے کان نہیں دھرا تھا۔وہ طیش میں کتنی دیر تک بولتی رہی۔اس کی یہ ناگواریت مستقیم تک بھی پہنچ گئی تھی۔

''کیا فضولیات ہے دیا؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ منگنی ہو رہی ہے یا نکاح''

وہ سخت چڑا ہوا محسوس ہوتا تھا

''ہاں آپ تو یہی کہیں گے۔وہ آپ کو سکھا پڑھا کے جو بھیجتا ہے''

اس کی بدگمانی نے مستقیم کو متاسف کر کے رکھ دیا۔

''آپ بھی نکاح کریں گے اسی دن زینی کے ساتھ۔سمجھ لیں میری یہی شرط ہے''

اس نئے شوشے پر مستقیم نے اسے بے دریغ گھورا۔

''پاگل ہوئی ہو۔یہ بھلا کیسی فرمائش ہوئی؟''

''کیوں میرے دل میں اپنے بھائی کے لیے ارمان نہیں ہو سکتے؟''

''بالکل ہو سکتے ہیں۔مگر یہ اتنی آسانی سے نکل نہیں سکیں گے خود تو دلہن بنی بیٹھیں ہو گی تم''

مستقیم نے اس کا سر تھپتھپا کر مسکراتے ہوئے کہا تو پہلی بار دیا بری طرح جھینپی تھی۔

''آپ وعدہ کریں زینی سے ہی شادی کریں گے''

''نند بن رہی ہے وہ تمہاری! یہ محبت اور پسندیدگی یونہی قائم رہی تو پھر بات کرنا''

ہمیشہ کی طرح وہ ایک بار پھر طرح دینے لگا دیا نے اسے گھورا تھا۔

''آپ مکر نہیں سکتے ہیں بھائی!''

وہ چیخ پڑی۔مستقیم نے کاندھے جھٹکے تھے۔

''میں نے وعدہ کب کیا تھا؟''

''بھائی پلیز!'' وہ روہانسی ہونے لگی تو مستقیم ہنس دیا تھا۔

''اوکے فائن! لیکن پہلے زینب سے پوچھ لینا''

''اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں محترمہ آپ کو بہت پسند کرتی ہیں''

وہ ہنسنے لگی تھی اس آخری بات پر شاید مستقیم نے دھیان نہیں دیا تھا یا دانستہ اگنور کر گیا۔

رخصتی کے علاوہ ساری رسمیں ہو رہی تھیں اور دیا اتنی سج دھج کے ساتھ اس کے سامنے آنے کے خیال سے ہی گھبراہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔غلام حسین جتنا پرجوش تھا وہ اسی قدر خائف رہا کرتی۔

پھر وہ دن بھی آیا تھا جب ان کا گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔رسم حنا کے موقع پر پیلے جوڑے میں ہمرنگ کھنکھناتی چوڑیوں اور پھولوں کے زیورات سے سجی غضب کا روپ لیے دیا کو جب زینی پنڈال میں لائی اور غلام حسین کے پہلو میں بٹھایا تو غلام حسین کی توجہ ہر سمت سے ہٹ کر اسی کی سمت مرکوز ہو گئی تھی۔دیا کا شعاعیں بکھیرتا حسین ترین چہرہ اسے خود سے نگاہیں ہٹانے ہی کہاں دے رہا تھا۔حالانکہ وہ خود بلیک شیروانی سفید شلوار آرمی کٹ ہیئر اسٹائل کے ساتھ تمام تر وجاہت اور خوبروئی کے ہمراہ کسی ریاست کے شہزادے کی طرح پورے ماحول پر چھایا ہوا لگ رہا تھا۔

''ہوش میں آ جائیں حسین بھائی آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا''

زینب نے ہنس کر اسے چھیڑا تھا اور وہ شرمندہ ہوئے بغیر ہنس پڑا تھا۔رسم کے دوران بھی وہ مسلسل چھیڑ چھاڑ کرتا چہکتا رہا تھا جب نکاح کی سنت کی ادائیگی ہوئی اور گلاب کی مانند کھلی کھلی دیا کو غلام حسین نے دیکھا تو اس کی دھڑکنیں معمول سے ایک دم بڑھ گئی تھیں۔رسم کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کر بھی جب اس نے دیا کا ہاتھ چھوڑنے کی بجائے اپنے ہاتھ کی پرجوش گرفت میں لے کر دبایا تھا وہ سخت جزبز ہو کر اپنا ہاتھ چھڑانے کو مچل گئی تھی۔

''کیا ہے بیوی! اب تو اس قسم کی جسارتیں گناہ کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہوں گی''

وہ پٹڑی سے اترتا شوخ ہوا جاتا تھا۔اس کے سارے انداز گستاخی کی حد تک بہکے ہوئے تھے۔دیا کی جان پر بننے لگی۔

''اتنی پابندیاں لگواؤ گی تو مشکل ہو گی صاحب!''

اس کی جھک کر ہاتھ پر بوسہ ثبت کرنے کی کوشش کو دیا نے سرعت سے ہاتھ کھینچ کر

نا کام بنایا تو غلام حسین نے کسی قدر تادیبی انداز میں کہا تھا۔ دیا نے محض اسے گھورنے پر اکتفا کیا اور دانستہ سمٹ کر فاصلے پر ہوئی گویا اسے اس کی حد سمجھائی تھی۔

"ابھی تک خفا ہو؟"

غلام حسین نے اپنا کندھا اس کے کندھے سے زور سے ٹکرا کر توجہ حاصل کی اور آنکھوں میں جھانکا دیا نے فی الفور نگاہ جھکالی جواب دینا تو دور کی بات تھی۔

"مسز بات کرلیں مجھ سے ایسا نہ ہو پھر پچھتانا پڑ جائے آپ کو"

"اس سے بڑھ کر کیا پچھتانا؟"

اس کی چپ بالآخر ٹوٹ گئی۔ لہجہ وانداز تلخی ودرشتی لیے تھا۔ جواباً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اطلاعاً عرض ہے ہماری اپروچ بے حد وسیع ہیں محترمہ! ویسے یار یہ زیادتی نہیں کم ازکم آج کے دن تو مسکرا کر دیکھ لو مجھے"

اس کی شوخ آنکھیں ان گنت فسانے کہہ رہی تھیں۔ ایک پل کو دیا کی ناراضی پر حیا غالب آ گئی۔ دھڑکنیں غیر معمولی حد تک بڑھ گئیں۔

"اگر تم جان جاؤ تمہاری اس درجہ ناپسندیدگی اور ناراضی کے باوجود کیوں تمہیں اپنایا ہے تو یقیناً خود اپنے اوپر رشک کرو گی"

وارفتگی بھرے انداز میں اسے دیکھتا وہ بوجھل سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ دیا کو اس پل ادراک ہوا سحر پھونکنا کیسا ہوتا ہے وہ اس پل اس پر سحر ہی پھونک رہا تھا۔ خواب آلود احساسات کو جھنجوڑتا بھاری لہجہ وہ دل کے آس پاس موجود برف کو پگھلتا پا کر گھبرائی۔ اس نے کچھ سہم کر کچھ خائف نظروں سے اسے دیکھا اور غلام حسین وہ تو اس کی آنکھوں کے دل کش ہراس پر فدا ہونے لگا تھا۔

"اتنی حسین کیوں لگ رہی ہو دیا؟" قسم سے دل بے ایمان ہو رہا ہے پتا ہے کیا چاہ رہا ہے؟"

وہ ایک دم اس پر جھک گیا۔ سگریٹ پرفیوم اور آفٹر شیو لوشن کی مہک کے ساتھ اس کے وجود کی مخصوص مہک ایکدم دیا کے حواسوں پر چھا گئی۔

"تمہیں اٹھا کر بھاگنے کو...... بھاگو گی میرے ساتھ...... افق کے اس پار جہاں...... وہ بن پیئے ہی بہک چکا تھا۔ دیا کی ہراسگی یکلخت بڑھ گئی۔ وہ سمٹ کر کچھ اور پرے سرکی۔ لانبی پلکیں حیا سے لرزنے لگیں۔" غلام حسین اس کی کیفیت سے حظ اٹھا کر ہنسنے لگا تھا۔ پھر اس محفل میں جب اس سے گانے کی فرمائش ہوئی تو غلام حسین نے بلا جھجک پوری کر دی تھی۔

تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں کیا ہم کریں
ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں صنم کیا ہم کریں

دیا کا دل سینے کے اندر پھڑپھڑانے لگا۔ اسے یہ سوچ کر رونا آ رہا تھا کہ غلام حسین جیسے شخص کی سنگت میں آ کر کیا وہ گناہ کی دلدل میں اترنے سے خود کو بچا سکے گی۔ کہیں خدا کے نام پر اس سے کچھ زیادہ بڑی قربانی نہیں مانگ لی گئی تھی؟ حالانکہ قربانی تو خدا کے نام پر ہی کی جاتی ہے مگر اس کی سوچ کا اپنا ایک انداز تھا۔ غلام حسین اس کی سوچوں اور خیالات سے بے خبر نغمہ سرا تھا۔

تیری آنکھوں کو دیکھ کر دلبر کتنے نغمے لکھے ہیں چاہت کے
اپنے نازک لبوں سے کہہ دو نا تم ہی الفاظ دو محبت کے
دل کی یہ پیاس کبھی بجھتی نہیں کیا ہم کریں
ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں صنم کیا ہم کریں
تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں کیا ہم کریں

اس کے لہجے کی گھمبیرتا میں گھلتا خمار اس کے جذبوں کی شدتوں کا گواہ تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر وہ سارے عالم کو فراموش کیے اس کو تک رہا تھا اور دیا کا چہرہ ہر لمحہ کچھ غصے، کچھ حیا کی سرخی سے دہکتا جا رہا تھا۔

"کیا کبھی میں اس شخص کو سدھار سکوں گی؟ ناممکن!"

وہ کوئی بھی کوشش کیے بغیر ہی جیسے ہمت ہارنے لگی۔ اس سے بڑھ کر نااہلی کی بات کیا ہو سکتی تھی۔ غلام حسین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بھرپور طریقے سے مسکرا دیا گویا اپنی فتح، اپنی کامیابی پر سرشاری میں ڈوبا ہوا تھا۔

میرا دل بار بار کہتا ہے۔ تم حقیقت ہو میرے خوابوں کی
میں تو تجھ میں ہی کھو گیا اتنا اب تو دن کی خبر نہ راتوں کی
نیند کیا آئے پلک جھپکتی نہیں. کیا ہم کریں
ہم تو دیوانے ہو گئے ہیں صنم کیا ہم کریں
تیرے چہرے سے نظر ہٹتی نہیں کیا ہم کریں

وہ خاموش ہوا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی ریشمی پلکوں پر ستاروں کی مانند چمکتے آنسو اپنی پوروں پر سمیٹ لیے تھے اور انہیں غور سے تکتے ہوئے ایک دم ہی بے حد سنجیدگی کے حصار میں گھر گیا

"تم میری بے حد انمول خوشی ہو دیا غلام حسین! میں اس خوشی میں غم کی آمیزش

برداشت نہیں کرسکتا۔ چاہتوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ مجھے اس استحقاق کے استعمال کی اجازت دو قسم کھاتا ہوں تمہیں اتنی محبت سے نوازوں گا کہ تم اس نفرت اور بے زاری کو بھلانے پر مجبور ہو جاؤ گی''

''میں بہت تھک گئی ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو اپنے کمرے میں جا کر آرام کرلوں؟''

اس کا لہجہ اکتایا ہوا بے زار کن اور کسی قدر طنزیہ تھا۔ غلام حسین تو اس ادا پر بھی مسکرا سکتا تھا مگر وہ بے حس لڑکی اجازت کہاں دیتی تھی۔ جبھی گہرا سانس کھینچ کر کاندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

گر یہی حال رہا ساقی مے خانوں کا
ڈھیر لگ جائے گا ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا
قحط دنیا میں ہے ایسے مسلمانوں کا
زور جو توڑ دیا کرتے ہیں طوفانوں کا
کوئی طارق ہے نہ خالد ہے نہ ابنِ قاسم!
راستہ صاف ہے ان بڑھتے ہوئے شیطانوں کا
جہاں چاہو جس قدر چاہو بہا دو اس کو
خون اس دور میں سستا ہے مسلمانوں کا
جن کے ہوتے ہوئے لٹ جاتے ہیں غریبوں کے مکاں
مرثیہ آؤ پڑھیں ایسے بزدل نگہبانوں کا

اس وقت وہ گہرے دکھ کے حصار میں مقید تھا جسے بہت سے بے حس اور مطلب پرست لوگ خود ساختہ دکھ کہہ کر اس کا مضحکہ بھی اڑایا کرتے تھے مگر یہ ہی دکھ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں کی صورت بستا تھا جو اس کی پوروں پر سلگتا اور دل پر رینگتا تھا جس نے کبھی اسے چین کا سانس لینے ہی نہیں دیا تھا اگر وہ بھی تھوڑا سا بے حس ہوتا تو یہ سوچ کر خود کو ڈھارس دے لیتا کہ اس نے تو زندگی میں اپنے حصے کا ایثار کر دیا اپنے حصے کی قربانی دے لی۔ اپنے نصیب کے دکھ اٹھا لیے وہ تھوڑے کو بہت سمجھنے والوں میں سے ہوتا تو ایسا بھی کرتا مگر اس کے برعکس وہ خود کو ہمیشہ مجرم سمجھتا آیا تھا کہ اس نے زندگی میں اپنا حق ادا ہی نہیں کیا وہ قرض چکایا ہی نہیں جو اس کے سر تھا۔

اس وقت وہ لیپ ٹاپ کے آگے براجمان تھے اور شمالی وزیرستان میں ہونے والی پاکستانی فوج کی دہشت گردوں کے خلاف کارروائیاں دیکھ رہے تھے۔ جہاں اس آپریشن نما

خونریزی میں سینکڑوں جانیں ہر روز ضائع ہو رہی تھیں۔ یہ ایک الگ نوعیت کی سازش تھی افغانستان، ایران، عراق، بوسنیا، چیچنیا کے بعد کیا پاکستان اب ہدف پر تھا؟ یہ سوال اتنا تکلیف دہ تھا کہ ان کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

مسلمانوں کی مسلمانوں کے خلاف لڑائی جہاد تو نہیں کہلاتی۔ اس میں مرنے والا مقتول اور مارنے والا قاتل تو ہو سکتا تھا جن کے متعلق واضح حدیث ہے کہ دونوں جہنمی ہیں۔ تو انہیں شہادت جیسا عظیم درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے تھک کر سر تھام لیا۔

ظلم مقامی لوگوں پر ڈھایا جا رہا تھا۔ جہاں عورتوں کی عزتیں اب غیر محفوظ ہیں اپنے ہی نگہبانوں کے ہاتھوں۔ ایسے بھلا کون سے نادیدہ دہشت گرد تھے جن کے خلاف یہ جنگ جاری تھی۔ بلاشبہ یہ امریکی سورماؤں کا پلان تھا جس کے سامنے پاکستانی حکام کو چوں چرا کی جرأت نہیں تھی۔ حکمرانوں کے حکم پر ہر روز جو فوجی اپنی جانیں لٹا رہے تھے کیا وہ شہید کہلا سکتے تھے ان کا مقام رب کی بارگاہ عالیہ میں کیا تھا؟

وہ سوچتے اور آنکھیں اس انوکھی داستانِ الم پر خون رونے لگتیں۔ ابھی کل ہی انہوں نے نیوز کے دوران ایک لیفٹیننٹ کی ماں کو ٹی وی پر روتے دیکھا تھا۔ وہ عوام الناس اور حکمرانوں سے بیک وقت سوال کر رہی تھی جس کے بیٹے کو ٹریننگ مکمل ہونے پر شمالی وزیرستان ہی پوسٹ کیا گیا تھا اور وہ اس لڑائی میں اپنوں کا ہی گولہ لگنے سے ختم ہو گیا تھا۔

یہ مسلمان کس راہ پر چل نکلے تھے غلامی اگر غیر کی ہو تو وہ ذلت کے اسباب ہی پیدا کیا کرتی ہے خدا کے سوا کسی اور سے مانگنے والا رسوائی اور بربادی کے سوا اور کیا سمیٹ سکتا ہے۔

امریکہ اپنا زرخرید بنانے کے بعد بھلا حکمرانوں کو اپنے حکم سے سرتابی کرنے دے سکتا تھا۔

آہ! یہ لوگوں کے اعمال کا نتیجہ تھا کہ ایسے ظالم و جابر و بے حس و نااہل حکمران ان پر مسلط کر دیئے گئے تھے یا پھر حکمرانوں نے ہی اندھے لالچ میں مبتلا ہو کر اپنے ہاتھ پیر کاٹ کر امریکہ کے آگے ڈال دیا تھا خود کو اور اپاہج لوگ تو خود کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھا کرتے وہ محض بے بسی کی نظروں سے دوسروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ چاہے کوئی ان کی حاجت پوری کرے یا نہ کرے اور بہت سال قبل ایک مرتبہ کسی نے ان سے سوال کیا تھا کہ اگر عرب ممالک یورپین ممالک کا تیل بند کر دیں تو وہ بھی انہیں ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں تب بھی ابنِ زید کے چہرے پر زہرخند پھیل گیا تھا اور انہوں نے کہا تھا۔

''سب بے فائدہ ہے، اب اس مقام پر آ کر عرب اتنے بے بس ہو چکے ہیں کہ کچھ

نہیں کر سکتے۔ پیرس میں شانزے لیزے میں نوے فیصد عمارتیں عربوں کی ملکیت ہیں اور مضافات میں ہزاروں ایکڑز پر ان کے محلات ہیں۔ برطانیہ کے شراب خانوں، کلبوں اور جوا خانوں میں 75 فیصد عربوں کا حصہ ہے اور امریکہ میں ان کی سرمایہ کاری تین لاکھ کھرب ڈالر سے زیادہ ہے پھر بھلا وہ یورپ والوں کا تیل بند کر کے اس دولت سے محروم ہونا چاہیں گے؟"

دراصل سارا جھگڑا ہی تو تیل کا ہے۔ نہ امریکی یہ کیلکولیٹ کرتے کہ عراق وہ واحد ملک ہے جو تیل کی پیداوار میں اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ عراق پر بے جواز حملہ کیا جاتا۔ یہ صدام کی محض ایک بڑک تھی جو وہ ڈھارس دینے کو یا پھر دھوکے میں رکھنے کو عراقی عوام کے سامنے مارتا رہا کہ وہ 45 منٹ میں اسلحے سے تباہی مچا سکتا ہے۔ سب نے جان لیا کہ تباہی کس نے مچائی۔ اس نے اس تھوڑے سے عرصے میں وہ کمال دکھائے تھے کہ وہ بہت جلد اپنے کارناموں کی وجہ سے معتبر سمجھا جانے لگا تھا۔ مگر اس میں اصولوں اور دین کے معاملوں کی درستی نہیں تھی اور یہ کجی ہمیشہ نقصان کا باعث ہی بنا کرتی ہے بلاشبہ۔"

ابنِ زید نے قلم رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر پرسوز آواز میں ہولے ہولے گنگنانے لگے۔

دلوں میں درد بھرتا ہوں، آنکھوں میں گوہر بناتا ہوں
جنہیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
عظیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں
پرانی کشتیاں ہیں میرے ملاحوں کی قسمت میں
میں ان کے بادباں سیتا ہوں اور لنگر بناتا ہوں
یہ دھرتی ماں ہے۔ اس کی عزت مجھ کو پیاری ہے
میں اس کے سر چھپانے کے لیے چادر بناتا ہوں
میرے خوابوں پر جب تیرہ شبی یلغار کرتی ہے
میں کرنیں گوندھتا ہوں چاند سے پیکر بناتا ہوں

وہ خاموش ہوئے تو پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے لگے جبکہ اسوہ جو بہت دنوں بعد کافی بنا کر لائی تھی اس نے دروازے میں رک کر پوری غزل کو سنا تھا اور اندر آئے بغیر بوجھل دل کے ساتھ چوکھٹ سے ہی پلٹ گئی۔ اسے لگا تھا جیسے اس نے دل میں جگہ دی تھی اس کے دل میں سوائے

اس ایک درد ایک محبت کے کوئی درد کوئی محبت نہیں سما سکتی تھی۔ اس کا درد اور محبت تو بالکل نہیں۔

☆☆☆

نکاح تو ہو ہی چکا تھا۔ اس کے باوجود اگلے دن مکمل بناؤ سنگھار کے ساتھ اسے غلام حسین کے پہلو میں بٹھانے والی منطق دیا کو ہرگز سمجھ نہیں آسکی تھی۔ وائٹ پینٹ کوٹ میں ملبوس غلام حسین اپنی غضب کی دراز قامت اور مضبوط شاندار سراپے کے ساتھ ہمیشہ سے بھی کہیں زیادہ جچ رہا تھا مگر جب وائٹ بے حد اسٹائلش قسم کے سلور کام سے مزین لہنگے میں کلیوں کے گہنوں سے سجی دیا کو لا کر اس کے برابر بٹھایا گیا تو گویا قدرت کی کوئی حسین تخلیق مکمل ہو گئی تھی۔ اس کا نہیں خیال تھا کہ کل کی طرح آج پھر وہ اسے دیکھتے ہی سدھ بدھ گنوا بیٹھے گا۔ مگر غلام حسین تو اسے روبرو پا کر مبہوت رہ گیا تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی یار یہاں صرف بھابی نہیں ہیں اکیلی تمہارے ساتھ، بالکل ہونق لگ رہے ہو"

اس کا ساتھی جو ہنڈی کیم سنبھالے انہیں فوکس کر رہا تھا۔ غلام حسین کو جھاڑ پلاتے ہوئے بولا تب غلام حسین کو کچھ کھسیا کر سیدھا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر گہرا سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لو بیوی! تمہاری اس اضافی خوبصورتی کی وجہ سے اور نام نہاد حد بندیوں کی وجہ سے کتنے اہم اہم موقعوں پر لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہوں۔"

اس کے لہجے میں مصنوعی رنج اور خفت تھی۔ دیا البتہ مزید ریزروڈ ہو گئی تھی۔ پھر خلاف توقع وہ مختلف رسموں کے دوران بے حد خاموش اور قدرے گم صم رہا تھا یہاں تک کہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ دیا جو اسی کی موجودگی کے باعث ان ایزی فیل کر رہی تھی۔ سکون بھرا سانس بھر کے قدرے ریلیکس ہوئی مگر اس کی یہ طمانیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ غلام حسین کی خاموشی کا عقدہ کھلا تھا اور وہ اس کی فوری رخصتی کے مطالبے کو جان کر سراسیمہ سی ہو گئی تھی۔ پھر اس کی منت سماجت آنسو اور سسکنا بھی کام نہیں آسکا اور غلام حسین کی ہمیشہ کی طرح جیت ہوئی تھی اور وہ سکتے میں آگئی تھی۔ اسے لگا تھا وہ کوئی بوجھ تھی جسے یوں اتار کر پھینکا گیا ہے۔ وہ دل میں ڈھیروں شکایتیں اور خفگی لیے آنسو بہاتی اپنے گھر سے رخصت ہو کر اس کے بیڈ روم تک پہنچا دی گئی تھی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس کا دل، اس کا دماغ اس اچانک بدل جانے والی صورت حال پر شدید رنج اور کوفت کا شکار تھا۔ اسی اضطراب میں اس نے کمرے میں تنہائی پاتے ہی ایک ایک زیور نوچ کر اتارا تھا تو اس کے آنسو ایک تسلسل سے بہہ رہے تھے اور جس پل وہ غصے سے بپھری

دوپٹے کی پنیں نکال کر پٹخ رہی تھی دروازہ کھول کر غلام حسین نے اندر قدم رکھا تھا۔اسے دیکھ کر بوکھلا کر اس کی سمت لپکا تھا۔مگر وہ اس کے نزدیک آنے سے قبل ہی بدک کر فاصلے پر ہوگئی تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می اوکے؟"

"اف اتنی پابندی!سوری جان من،ہم ماننے سے قاصر رہیں گے"

وہ ہنسا تو دیا کو سراسر اپنی توہین محسوس ہوئی تھی۔

"غلام حسین آ آپ بہت برے ہیں"

ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر وہ بے بسی کے شدید احساس سمیت پھپھک کر رو پڑی۔

جاؤں سو جان سے اس طرزِ تکلم پر نثار
پھر تو فرمایئے کیا آپ نے ارشاد کیا
مجھ کو ہوش نہیں تجھ کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں تم نے مجھے برباد کیا
سوزِ غم دے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا۔

وہ مسکرایا تھا پھر ہنستے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

"آج کی رات ہماری اپنی ہے جانِ من!اتنے ناز اٹھاؤں گا کہ خود پر نازاں ہو جاؤ گی۔رونا تو بند کرو یار" وہ اپنے ہونٹوں سے اس کے آنسوؤں کو چن رہا تھا۔دیا حیا اور اس کی قربتوں کی آنچ سے جل کر خاکستر ہوئی تو اسے دھکیل کر سرعت سے فاصلے بڑھا دیئے۔پھر اسے گھورتے ہوئے برہمی سے چیخی تھی۔جبکہ غلام حسین نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا پھر عاشقانہ آہ بھر کر مستانے انداز میں گنگنایا تھا۔

ہائے ظالم یہی بالکل یہی ادا یہی ناز یہی انداز ہے آپ کا
جو تمہارے عشق تمہاری محبت کا بہانہ بن گیا

دیا الٹے قدموں چلتی وحشت سے پھیلی آنکھیں لیے دیوار کے ساتھ جالگی۔

"آپ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کریں گے"

بنا دوپٹے کے کھل کر بکھر جانے والے گھنیرے بالوں کے درمیان اجلا سفید مگر معصوم نوخیز چہرہ گویا بادلوں کی اوٹ سے چودہویں کا چاند لشکارے مار رہا تھا۔غلام حسین نے بھلا کہاں دیکھے تھے ایسے بے حجاب روپ اس کے بہکانے کو اس کا حسن کافی تھا اور وہ بہک رہا تھا۔

تو میرا کفر بھی ہے تو میرا ایمان بھی
تو نے لوٹا ہے مجھے تو نے بسانا ہے مجھے
میں تجھے یاد بھی کرتا ہوں تو جل اٹھتا ہوں
اب تجھ کو بھی اسی آگ میں جلانا ہے مجھے

اس نے دیا کا ہاتھ پکڑا تھا اور اپنی جانب کھینچ لیا تھا وہ عاشق تھا اور عشق سچا اور خالص ہو تو عبادت میں شمار ہوتا ہے۔وہ بھی عبادت گزار بن چکا تھا۔

☆☆☆

ابھی تازہ ہے میرا فرض
نئے معرکوں پر تلا ہوا
بڑا منتقم ہے میرا لہو
میرے نسب کی یہ سرشت ہے
میں اس قبیلے کا فرد ہوں
جو حریفِ سیل بلا رہا ہے

پھر اگلے دو سالوں تلک وہ جہاد میں مصروف رہا تھا۔یہ مزاحمتی جنگ صرف ان کی ہی جماعت نہیں لڑ رہی تھی۔عراق کے دیگر شہروں میں بھی ایسی بہت سی جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔وہ امریکی فوجیوں کے لیے عتاب بن گئے تھے۔ان کی من مانی کے راستے میں چٹان بن کر کھڑے ہوگئے تھے ان سے ان کے اسلحے ہتھیاتے اور انہی کی نفری پر حملے کیا کرتے۔دو سال تک وہ بہت کامیابی سے اپنے کام میں مصروف رہا۔یہ نہیں تھا کہ وہ صرف دشمن کو ہی زک پہنچا رہے تھے۔اس عرصے کے دوران اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنے جانبازوں کے لاشے بھی اٹھائے تھے۔جنھوں نے بالآخر منزل پالی تھی وہ بھی ایک ایسا ہی معرکہ تھا جس میں ابنِ زید پہلی بار اتنا شدید زخمی ہوگیا تھا۔وہ اپنے ساتھیوں سے بھی بچھڑ گیا تھا۔امریکی فوجیوں کی چلائی گئی گولیوں کے پورا برسٹ نے اس کی داہنی ٹانگ کو ایک طرح سے چھلنی کردیا تھا۔زخموں کی کربناک دکھن کے باوجود ابنِ زید نے کوشش کی تھی دشمن کے علاقے سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پناہ لے سکے مگر شاید وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔اس قدر شدت سے بہتے خون نے بالآخر اس کے حواس سلب کر لئے تھے۔اسے خبر نہیں تھی وہ کتنی طویل بے خبری کے بعد ہوش میں آیا تھا۔وہ کرکوک کا علاقہ تھا اور جس گھر میں اسے پناہ دی گئی تھی وہ مقامی لوگ تھے اور دل

میں مجاہدین کے لیے بے حد محبت وایثار کا جذبہ رکھتے تھے۔ ابنِ زید نے انہیں اپنے بارے میں سچ بتا دیا تھا۔ وہ لوگ خوفزدہ تو تھے کہ امریکی فوج ہر تیسرے دن کسی باغی کی تلاش میں گھروں پر چھاپے مارتی رہتی تھی مگر ان سے جس حد تک ہو سکا تھا انہوں نے ابنِ زید کے ساتھ تعاون کیا تھا اور اس کی تیمارداری کرتے رہے تھے۔ مناسب علاج نہ ہونے کے باعث ابنِ زید کی ٹانگ کا زخم ناسور میں ڈھل گیا تھا اس کے لیے چارپائی سے اتر کر ایک ایک قدم چلنا بھی محال ہو چکا تھا۔ اس کے محسن ابو احمد نے اپنے دور پار کے بھروسہ والے عزیز کو بغداد سے بلوایا تھا جو ڈاکٹر تھا تا کہ ابنِ زید کی ٹانگ کا مناسب علاج ہو سکے کہ ایسی سچوایشن میں ابنِ زید کو کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرانا بالکل بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ابو احمد کا عزیز ڈاکٹر عبدالمالک آیا اور ابنِ زید کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد ٹانگ کاٹ دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ زخم ہڈی کو جا لگا تھا ٹانگ نہ کاٹنے کی صورت میں یہ ناسور پورے وجود میں زہر بن کر پھیل جانا تھا۔ اور جس دن ابنِ زید نے گھٹنے سے نیچے اپنی ٹانگ کو کھویا اس روز زندگی میں دوسری مرتبہ اتنی شدتوں سے رویا تھا اس سوچ کے ساتھ کہ شاید اب وہ جہاد کے قابل نہیں رہا تھا اور اس نقصان کا اسے اتنا ملال ہوا تھا کہ ٹھیک ہونے کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس آ گیا تھا۔ حالانکہ عبدالکریم نے اسے سمجھایا تھا۔

”محاذ پر دشمن کو زیر کرنا ہی تو جہاد نہیں ہے ابنِ زید! تم حسام احمد کی طرح بھی جہاد کر سکتے ہو“

لیکن اس کی پیاس تو سمندر مانگتی تھی۔ وہ ان چند بوندوں سے کیسے بجھ سکتی تھی۔ جبھی اس نے ان کی تجویز رد کر دی۔ دل شکنی کا عالم ہی ایسا تھا۔ مگر بعد میں وہ ساری عمر اپنے اس عمل پر پچھتایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ اس کی ایسی غلطی تھی جس پر معافی نہیں دی جا سکتی تھی اور اس نے خود کو معاف کیا بھی نہیں تھا جبھی اس نے اس ادراک کے بعد زندگی کو اپنے لیے بے آب وگیاہ کر ڈالا تھا۔

☆☆☆

مشکل ہیں اگر حالات تو وہاں دل دے آئیں جاں بیچ آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا؟
گر جیت تو کیا کہنے، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

رات بھر کی گریہ وزاری نے اس کی آنکھوں کو سرخی ہی نہیں سوجن اور غضب کی خوبصورتی بھی عطا کی تھیں۔ غلام حسین کے استحقاق کی حد کا کوئی پیمانہ نہیں رہا تھا۔ اس کی جبری جسارتوں کو یاد کر کے وہ پھر سے سسک اٹھی تھی جب غلام حسین نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ اس کی نازک پشت پر سیاہ بالوں کا مخملیں آبشار بکھرا تھا جن کے سروں سے ٹپکتے پانی کے شفاف قطرے تازہ غسل کے گواہ تھے۔ کہنیوں کے بل اونچے ہوتے ہوئے غلام حسین نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا سگریٹ کیس اور لائٹر اٹھایا۔ سگریٹ ہونٹوں کے درمیان دبا کر لائٹر کا شعلہ دکھایا تھا۔ گہرا کش لے کر اس نے لاپرواہی سے لائٹر سائیڈ پر اچھالتے ہوئے دھواں بکھیرا اور پرسوچ نظروں سے اسے تکنے گیا۔ معاً وہ دیا کو بری طرح کھانستے پا کر چونکا تھا اور کسی قدر خفت زدہ مگر عجلت بھرے انداز میں اٹھ کر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا تھا۔

”آئی ایم ساری! مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اسموکنگ سے الرجی ہوگی“

اس کے خجالت بھرے انداز میں وضاحت پیش کرنے پر دیا کو جیسے آگ لگ گئی تھی۔

”اونہہ بات بھی وہ بندہ کرے جو اپنے نفس پر قابو پانا بھی جانتا ہو۔ باتیں بنانا وہ بھی خالی خولی بہت آسان ہوتا ہے“

وہ زہر خند سے بولی تھی انداز میں اس درجہ حقارت اور تضحیک تھی کہ غلام حسین ٹھٹک کر رہ گیا مگر خود کو سنبھال کر خفیف سا مسکرایا تھا اور نرمی ورسان سمیت ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

”دس از ناٹ فیئر بیوی! کسی کو اچھی طرح جانے اور پرکھے بغیر اتنی بے رحمی سے رائے مسلط نہیں کرتے“

اس نے لمحے بھر کا توقف کیا تھا پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر مزید گویا ہوا تھا۔

”آئی ایم ساری! رات شاید میں تمہیں بہت ہرٹ کر چکا ہوں مگر جانِ حسین تم ہتھے بھی تو ایسے نہ چڑھی تھی پھر میں ویسے بھی کچھ جلدی میں تھا تم بس یہ سمجھ لو کہ میں ایسی کشتی میں سوار ہوں جس کا سفر ایک طوفان میں گھرے ہوئے دریا میں جاری ہے۔ وہ کس وقت الٹ جائے، ڈوب جائے کچھ پتا نہیں تو میں چونکہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں جبھی چاہتا ہوں مرنے سے پہلے ان کا جی بہلانے کو انہیں اپنے بچوں کی چھوٹی سی ٹیم تو لازمی بنا کر دے جاؤں۔ سنو کہیں تم دو بچے خوشحال گھرانے والے مقولے پر عمل کرنے کا تو نہیں سوچتی، اگر ایسا ہے تو ابھی سن لو میں

تمہاری اس سوچ کا قلع قمع کر ڈالوں گا ہاں!"

شوخ آنکھیں! متبسم لہجہ اور بے باکی لیے ہوئے انداز وہ قطعی غیر سنجیدہ تھا۔ وہ اتنا بھنائی کہ تکیہ اٹھا کر اسے کھینچ مارا تھا جسے اس نے بڑے آرام سے کیچ کیا پھر اسے دیکھ کر پیارے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"چھوڑو نا یار بیوی! یہ لڑائی بھڑائی! چار دن ہیں زندگی کے انہیں پیار میں کیوں نہ گزار دیں۔ اور ویسے بھی میں خفا نہیں کرنا چاہتا ہوں تمہیں"

"ہاں تم تو یہ چاہو گے ہی ہر رات اپنی ہوس جو پوری کرنی ہے"

وہ زہر خند سے پھنکاری۔ بات تلخ تھی تو لہجہ اس سے بڑھ کر بدلحاظ اور اہانت آمیز۔ غلام حسین کا چہرا یوں سرخ پڑ گیا جیسے جسم کا پورا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔

"دس از ٹو مچ دیا!"

وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا مگر دیا اس کی بات پوری سنے بغیر ہی ڈریسنگ روم میں گھسی تھی اور ایک دھماکے سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ غلام حسین سختی سے ہونٹ بھینچے ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
وہ شام جیسے سسک رہی تھی
کہ زرد پتوں نے آندھیوں کو
عجیب قصہ سنا دیا تھا
کہ جس کو سن کے تمام پتے
سسک رہے تھے
تڑپ رہے تھے
جانے کس سانحے کے غم میں
شجر جڑوں سے اکھڑ رہے تھے
بہت تلاشا تھا ہم نے تم کو
ہر ایک وادی ہر ایک رستہ
ہر ایک پربت
کہیں سے تیری خبر نہ آئی

تو یہ کہہ کے ہم نے دل کو ٹالا
ہوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے
ہم اس کے رستے کو ڈھونڈ لیں گے
مگر ہماری یہ خوش خیالی
جو ہم کو برباد کر گئی تھی
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
بڑی ہی مدت گزر گئی تھی

رنج تھا، ملال تھا، پچھتاوا تھا جو رگِ جان کو کاٹتا تھا۔ وہ اس گناہِ عظیم پر شرمسار تھا۔ اسے لگتا تھا وہ میدانِ جنگ کا وہ سپاہی ہے جو جان بچا کر بھاگ آیا ہو۔ ایسا مسلمان سپاہی جن کے بارے میں خدا نے قرآن میں وعید سنائی ہے۔ حالانکہ پہلے پہل جب وہ واپس انگلینڈ پہنچا تھا تو اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی بے دلی سے سہی مگر جوڑ لیا تھا اور انگلینڈ کے ماہر سرجن سے کانٹیکٹ کر کے اپنی ٹانگ والا مسئلہ بھی حل کر لیا تھا۔ مصنوعی ٹانگ کے لگ جانے سے اس کی آدھی سے زیادہ معذوری ختم ہو گئی تھی۔ وہ ڈرائیو کر سکتا تھا۔ نارمل انسانوں کی طرح سے چل پھر سکتا تھا۔ یہ کوئی کم بات نہیں تھی تب اسے ضحیٰ کا بھی خیال آیا تھا۔ اور پہلی مرتبہ ابنِ زید نے خود اس کی جانب پیش رفت کی تھی۔ ضحیٰ اسے دیکھ کر گویا خوشی سے دیوانی ہونے لگی تھی۔ کتنی دیر تو اسے یقین ہی نہ آسکا تھا کہ ابنِ زید واپس آ گیا ہے وہ بھی زندہ سلامت اور جب اسے یقین آیا تو اسے اپنی خوش بختی پر شبہ نہیں رہا تھا جس کا اظہار بھی اس نے کھل کر کیا تھا۔

"باقی سب کہاں ہیں ضحیٰ اور کیسے ہیں؟"

وہ ضحیٰ کے پاپا کو اکثر وہاں کی ساری باتیں بتایا کرتا تھا مگر اس شام جب آسمان پر شفق کی سرخی کا رنگ گہرا تھا اور زمین پر خزاں میں جلے سرخ پتوں نے جیسے آگ سی لگا دی تھی وہ دونوں شہر کی جانب جاتی سڑک پر خشک پتوں کو روندتے ہوئے چل رہے تھے ابنِ زید نے رک کر اس سے سوال کیا تھا۔

"کون سب؟"

ضحیٰ نے سڑک کے اطراف پیپل کے گھنے درختوں سے گرتے پتوں سے نگاہ ہٹا کر سوالیہ نظریں اس پر جما دیں۔

"احمد عبداللہ! ابو حذیفہ اور ابراہیم لاشاری! کیا ان کی تعلیم مکمل ہو گئی اور وہ اپنے اپنے

ملک واپس چلے گئے" اس کی بات پر ضحیٰ کے چہرے پر تاسف پھیل گیا تھا اور اس نے سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔

"نہیں واپس کہاں گئے۔ وہ بالکل پاگل تھے۔ ابراہیم لاشاری اور احمد عبداللہ تمہارے عراق جانے کے دو ہفتے بعد فلسطین چلے گئے تھے جبکہ ابوحذیفہ عراق"

"فلسطین اور عراق، مگر وہ کیوں؟"

ابن زید ششدر رہ گیا تھا۔

"جہاد میں شریک ہونے کے لیے۔ احمد عبداللہ نے رملہ سے ہمیں خط لکھا تھا اور کہا تھا اگر میں زندہ نہ رہوں تو ہمارے لیے دعا کرنا۔ اس لیے کہ ہم نے موت کے پروانوں پر دستخط کردیئے ہیں"

"اس نے میرے سمجھانے اور واپس لوٹ آنے پر کہا تھا"

"وہاں جن کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جارہا ہے۔ وہ بھی انسان ہیں اور ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔ میں ان کے لیے زیادہ کچھ تو نہیں کرسکا مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گا۔ چند کافروں کو ہی سہی صفحہ ہستی سے مٹا کر اور کچھ نہیں تو اپنے دل میں لگی آگ تو بجھا ہی لوں گا نا۔ جہاد کا تھوڑا سا ہی حق ادا کردوں گا۔ کیا پتا اللہ کو ہماری یہی نیکی پسند آجائے"

وہ کہہ رہی تھی اور ابن زید پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ جیسے گنگ ہو چلا تھا۔ ابنِ زید کو یاد آیا ایک بار احمد عبداللہ نے اسے کہا تھا۔

"مسلمانوں کے لیے جہاد فرض ہے اور اس کے لیے ملکوں اور سرحدوں کی کوئی قید نہیں ہے۔ میں اگر کشمیر اور افغانستان کے لیے کچھ نہیں کرسکا تو فلسطین کے لیے سہی، عراق یا کشمیر کے لیے سہی"

اور ضحیٰ بتا رہی تھی۔

"ابن زید انہوں نے فدائی حملے کیے تھے۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر وہ لوگ اسلحہ کے ڈپو اور دشمن کی جماعتوں میں گھس گئے تھے۔ جس دن ان کی شہادت کی خبریں ان کے ساتھیوں کے ذریعے ہم تک پہنچی تھیں۔ میں اس روز بہت روئی تھی۔ ابنِ زید مجھے اس خیال سے خوف رہا تھا اگر تم بھی اس طرح کی کوئی حرکت کر چکے ہوگے تو میں کیا کروں گی؟"

وہ اپنی کہتی رہی تھی اور ابن زید گویا پتھر کا ہو گیا تھا

کتنا فرق تھا اس میں اور احمد عبداللہ میں، ابوحذیفہ اور ابراہیم لاشاری میں۔ اسے یاد

تھا اس نے متعدد بار اپنے اضطراب کی کیفیت میں ان تینوں کو لعنت ملامت اور طنز کا نشانہ بنایا تھا اور جواباً ان کا تحمل قابل دید ہوتا تھا۔ شرمندگی کے ساتھ ساتھ بے مائیگی کے احساس نے بھی تب پہلی بار ابنِ زید کو جکڑا تھا اور بے حال کردیا تھا۔ اس شب پوری رات وہ لمحہ بھر کو بھی نہیں سوسکا۔ اگلی صبح اس کی آنکھیں اس جگارتا کی مظہر بنی ہوئی تھیں۔ جبکہ ضحیٰ پر بس ایک دھن سوار تھی وہ اب ہر صورت اسے حاصل کرلینا چاہتی تھی۔ دو سال تک اس نے ابنِ زید کا انتظار کیا تھا اور صبر کیا تھا اور یہ اس کے جذبوں کی سچائی تھی وہ بھی ایسی سچوایشن میں جبکہ ابنِ زید اسے جاتے ہوئے بھی امید کا کوئی جگنو نہیں تھما کر گیا تھا۔ بقول ضحیٰ کے یہ اس کی دعائیں تھیں کہ ابنِ زید زندہ سلامت واپس آیا تھا جن دنوں ابنِ زید نے ضحیٰ کی مما سے شادی کی بات کی وہ اسی اضطراب کا شکار ہو چکا تھا اور لاشعوری طور پر وہ شاید اس اضطراب سے نجات کا خواہاں تھا کہ انکار نہیں کرسکا اور بالآخر ضحیٰ کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔

شادی کی تاریخ طے ہوئی اور پھر دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگی تھیں تب ایک دن ابنِ زید کو اپنی معذوری کا خیال آیا تھا۔ بے دھیانی اور بے خیالی ایسی تھی کہ وہ ضحیٰ پر اس خامی کو آشکار کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے اسی وقت ضحیٰ سے بات کرنے کا سوچا تھا مگر ضحیٰ اس وقت شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی اور یوں ابنِ زید کو موقع نہیں مل سکا اور وہی بات جو ابنِ زید اسے بتانا چاہتا تھا ضحیٰ پر خود بخود کھل گئی تھی۔ وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیا کچھ نہیں تھا تب اس کی آنکھوں میں۔

غیر یقینی، غم و غصہ و نفرت اور شک۔

مگر اس کا ردعمل اس سے کہیں بڑھ کر شدید تھا۔ اس نے ابنِ زید پر الزام لگایا تھا کہ وہ اسے چیٹ کرتا رہا تھا۔

"میں بھی حیران تھی تم جیسا اکڑو، خود پسند اور بے نیاز بندہ بھلا میری محبت کیسے قبول کر گیا؟ تم نے سوچا بھی کیسے ابنِ زید صاحب کہ میں ایک لنگڑے آدمی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالوں گی"

وہ پھنکاری تھی اس کے لہجے کی نفرت نے ابنِ زید جیسے انا پرست، غیرت مند انسان کو زمین میں گاڑھ دیا تھا گویا۔ پھر بنا کسی وضاحت کے وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔ حالانکہ وہ ضحیٰ کے پاپا کو اپنی آمد کے شروع دنوں میں اپنی معذوری کے متعلق بتا چکا تھا۔

☆☆☆

میں اپنی راتوں کی فرصتوں میں
تجھے مناؤں تو مان جانا

اگر کسی دن میں اپنے آنسو جو لے کے آؤں تو مان جانا
تو خوش نہیں ہے میری بقا پر تو صرف اتنا بتا دے مجھ کو
تیری خوشی کے لیے میں سولی پر مسکراؤں تو مان جانا
تو بدگماں ہے میری وفا سے تو اک بار تو آزما لے مجھ کو
جو ہار جاؤں تو لوٹ جانا جو جیت جاؤں تو مان جانا

ولیمہ کی تقریب کے بعد جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ جانے کو تیار ہو رہی تھی۔ غلام حسین اس کے پیچھے کمرے میں آیا تھا اور گویا بالخصوص اسے ہی سنایا تھا۔ دیا ان سنی کئے اپنے کام میں مصروف رہی بیگ اٹھایا اور چادر اوڑھ کر مڑی تو اس سے ٹکراتے بچی تھی غلام حسین اچانک اس کی راہ میں آگیا تھا۔

"اپنا موڈ تو ٹھیک کر و یار"

غلام حسین نے صرف کہا نہیں ہاتھ بڑھا کر اس کی سونے کی چوڑیوں سے بھری کلائی تھام لی۔ جسے اگلے پل دیا نے ایک جھٹکے سے درشت انداز میں چھڑا لیا۔

"آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔ او کے؟"

وہ پھنکاری تھی۔ غلام حسین نے بہت دھیان سے اسے دیکھا پھر نرمی سے مسکرا دیا تھا۔

"سنا ہے زیادہ غصہ کرنے سے جلدی بڑھاپا آجایا کرتا ہے۔ یار تمہیں میرے لیے ابھی بہت عرصہ تک جوان رہنا ہے پھر یہ بھی تو خیال کرو ماموں اور مستقیم کیا سوچیں گے کہ میں نے ان کی لڑکی کا موڈ کیوں خراب کیا ہوا ہے۔ امپریشن کی بھی تو بات ہے نا"

دیا نے غصیلی نظروں سے دیکھا وہ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ وہ جھلس کر رہ گئی۔

"کاش میں تمہارا اصل چہرہ انہیں دکھا سکتی"

غصے کی زیادتی میں وہ آؤٹ ہو گئی تھی۔ غلام حسین کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔

"اف میں نے ماسک کب لگایا ہوا ہے۔ اتنا ہی حسین ہوں یار غور سے دیکھو تو سہی"

غیر سنجیدگی اور شوخی بھرے انداز میں کہتا وہ اپنا چہرہ اس کے بے حد نزدیک لے آیا اس سے پہلے کہ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹتی غلام حسین کو کچھ اور شرارت سوجھی تھی وہ جھکا تھا اور اس کے ہونٹوں کو بے حد نرمی اور جذب بھرے انداز میں چوم لیا تھا۔

"محبت اور ہوس کے مظاہرے میں بہت واضح فرق ہوا کرتا ہے دیا جی! لیکن میں تمہیں عمل سے سمجھانے سے قاصر ہوں میری محبت عبادت ہے میں ہوس کا مظاہرہ کر کے گنہگار کیسے ہو

جاؤں۔ ہاں شاید وقت کبھی تم پر اس فرق کو آشکار کر دے۔ اب جاؤ۔ اور اپنا بہت خیال رکھنا"

وہ کچھ لمحوں قبل جتنا شوخ ہو رہا تھا اب اسی قدر سنجیدگی اور متانت سے بولا تھا۔ دیا گم صم سی کھڑی رہ گئی تھی وہ پلٹ کر باہر چلا گیا مگر اس کی حالت میں فرق نہیں آیا تھا وہ اکثر اسے یونہی حیرن کر دیا کرتا تھا۔

"بھابھی باہر نانو اور ماموں بلا رہے ہیں آپ کو"

اس نے چونک کر دیکھا زینب تھی۔ خوب گھیر دار فراک میں بڑے سے دوپٹے میں الجھی ہوئی۔ دیا اس کے ہمراہ باہر آئی تو غلام حسین کو مستقیم کے ساتھ محوِ گفتگو پایا تھا۔ پھپھو اور عبدالعلی پھپھا مہمانوں کو رخصت کرنے میں مصروف تھے۔ وہ باری باری پھپھو اور زینب کے گلے ملی تو نگاہ غیر شعوری طور پر غلام حسین کی سمت اٹھی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ لو دیتی ہوئی پر شوق نظریں، دیا نے سٹپٹا کر نگاہ جھکا دی۔ غلام حسین مسکرا دیا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تو نیم تاریک کمرے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا اس کا سیل فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھا اور اسکرین پر روشن نمبر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک دم ایکسائٹمنٹ اتر آئی تھی۔

"السلام وعلیکم! ابن زید چاچو"

فرطِ جذبات سے اس کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔ دوسری جانب ابنِ زید یقیناً مسکرائے تھے۔

"وعلیکم السلام! مائی سن شادی بہت مبارک ہو کیسے ہو آپ؟"

"میں آپ سے بات نہیں کر رہا۔ اگر آپ میرے متعلق اتنے اپ ڈیٹ ہیں تو پھر ملتے کیوں نہیں مجھ سے؟" وہ یقیناً ہرٹ ہوا تھا پھر ابنِ زید کی طویل وضاحتیں تھیں وہ اسے بڑی فرصت اور محبت سے منا رہے تھے۔

"یار لنگڑے چاچو کو اتنی تو رعایت ملنی چاہئے کہ وہ اتنی دور کا سفر طے کر کے شادی میں شریک ہونے کی بجائے فون پر مبارکباد دے لے۔ کیا خیال ہے؟"

ان کے بذلہ سنجی کے مظاہرے نے بجائے غلام حسین کا موڈ ٹھیک کرنے کے کچھ اور بھڑکا دیا۔

"خبردار جو آپ نے اپنے آپ کو کچھ اور کہا۔ سمجھے میں آپ!"

اس کی آواز ایک دم بھرا گئی تھی۔ ابنِ زید سنبھلے تھے۔

اچھا اچھا تم میری علی بھائی اور بھابی سے تو بات کراؤ نا اور چچا جان کیسے ہیں؟"

"بہت دیر کردی مہرباں آتے آتے......"

جواباً وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا تو ابن زید بے چین ہو گئے تھے۔

"کیا مطلب؟ سب خیریت ہے نا غلام حسین؟"

"دادا کا انتقال ہو گیا ہے چاچو! وہ آخر دم تک آپ کو یاد کرتے رہے۔ وہ صحیح کہتے تھے آپ صاحب ساحر ہیں اپنے عشق میں ہر کسی کو مبتلا کر کے بے نیازی برتنا آپ کی شان بے نیازی ہو گی مگر......"

انا للہ و انا الیہ راجعون

ابن زید نے دلگیری سے کہا تھا پھر کچھ توقف سے بولے تھے۔

"زینی کیسی ہے مائی ڈول؟"

سب ٹھیک ہیں چاچو! آپ بتائیں آپ کو میرا نمبر کہاں سے مل گیا؟"

"تجھ جیسے بندے کا نمبر تلاش کرنا بھی کوئی مشکل ہے میری جان!"

"ہاں اور وہ بھی آپ جیسے مقبول و معروف رائٹر کے لیے۔ مائی پلیزر سر!"

وہ شوخی سے کارنشش بجالایا۔ تو ابن زید نے اس پر گرفت کر لی تھی۔

"ہاں بالکل اسی طرح میرا نمبر بھی آئی تھنک تمہیں حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں تھا مگر تمہیں شاید خیال نہیں آیا"

وہ ہنس رہے تھے اور غلام حسین اس قدر کھسیاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

"ایسی بات بالکل نہیں ہے چاچو آپ مما سے پوچھ لیں۔ میں اکثر ان سے آپ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکا۔ اب بھی صرف کشمیر کا کوڈ نمبر دیکھ کر مجھے پتا چل گیا تھا کہ کال کرنے والے آپ ہیں۔"

اس کی وضاحتوں پر ابنِ زید کھل کر ہنستے رہے تھے۔

"کبھی آؤ نا مجھ سے ملنے پھر تمہاری اس لفاظی کا یقین کر لوں گا"

"شیور میں ضرور آؤں گا"

"اکیلے نہیں ہماری بہو کو بھی ساتھ لانا"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر مائی لارڈ!"

اب کے غلام حسین بھی ہنسا تھا پھر وہ کتنی دیر تک فون پر ابنِ زید سے پچھلے اٹھارہ سالوں کی ان کہی باتیں کرتا چلا گیا۔ وہ بھی جو اس نے کبھی کسی سے نہیں کہی تھیں اور کہنے کا سوچا

بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت سی بے سبب باتیں فقط تمہید ہوتی تھیں۔
جو اکثر تم سے کہتا تھا
سنو
اور کیسے ہو؟
سنو سردی بہت ہے نا؟
نہیں موسم تو اچھا ہے
چلو اچھا میں چلتا ہوں
دوبارہ فون کر لوں گا
یہ ساری بے سبب باتیں اور اس تمہید میں جاناں؟
گزر جاتے تھے سب لمحے
گزر جاتے ہیں جب لمحے
تو پھر میں سوچتا ہوں کہ
ذرا سی بات ہی تو ہے
تمہیں جلدی سے کہہ دوں گا
مجھے تم سے محبت ہے

سکندر نے اس کی انگلی میں انگوٹھی ڈالتے ہوئے پرشوق اور متبسم نظروں سے تکتے ہوئے نظم اس کے گوش گزار کی اور گویا اپنے دل کا حال لفظوں میں بیان کیا تھا۔ اسوہ نے سادگی سے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا سمندر موجزن دیکھ کر ذرا سی جھینپ گئی تھی۔

"پتا نہیں کیوں اسوہ میں ہمیشہ اس خیال سے ڈرتا رہا کہ تم میری محبت قبول بھی کرو گی یا؟"...... خیر چھوڑو یہ بتاؤ رنگ اچھی ہے؟ کل سارا دن بازار میں خوار ہو کے پھر لایا ہوں۔ مجھے کچھ بھی تمہارے شایانِ شان لگتا ہی نہ تھا"

"اچھی ہے"

اسوہ نے ایک سرسری نگاہ سونے کی عام سی انگوٹھی پر ڈالی اور گہرا سانس بھر کے بے دلی

سے بولی تھی۔

''اور رنگ پہنانے والا؟''

اب کے اس کا لہجہ خفیف سی شرارت لیے ہوئے تھے۔ اسوہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اس صورتحال پر دل سے راضی اور خوش نہ ہونے کے باوجود اس کی رگ ظرافت پھڑکی تھی۔

''بس گزارا ہے۔ خوبصورت تو بالکل نہیں ہو''

سکندر پہلے تو ہونق ہوا تھا پھر اسے شریر انداز میں ہنستے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑا تھا اور بی جان سے کوئی بات کرتے ہوئے ابنِ زیدان کی ہنسی پر ہی چونک کر متوجہ ہوئے تھے اور انہیں یوں ایک ساتھ اکٹھے ہنستے دیکھ کر بے اختیار ہو کر تکتے چلے گئے۔ ان کے چہرے پر آنکھوں میں طمانیت اور آسودگی کا رنگ کتنا گہرا تھا اس پل اسوہ کی نگاہ یونہی ان پر جا پڑی تھی۔ اس کی ہنسی کو فوری طور پر بریک لگ گئی۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے کچھ دیر تیزی سے نمناک ہو جانے والی آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر شکستگی کے احساس میں گھرتے ہوئے سر جھکا کر آنسو پینے لگی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا اسوہ! سکندر بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت خوش رکھے گا تمہیں''

جس پل وہ اپنا پنک شرارہ دونوں ہاتھوں سے ذرا سا اٹھائے تقریب کے اختتام پر اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی ابنِ زید جانے کہاں سے نکل کر اس کے راستے میں آ گئے تھے۔ ان کے لہجے کے تیقن اور رسان نے اسے لمحوں میں بھڑ بھڑ جلا دیا تھا۔

''آپ بھی اتنے ہی عام انسان نکلے ہیں ابنِ زید ہونٹوں پر مچلتی مسکان کو دیکھنے والے، دل کے اندر جو آنسو گرتے ہیں آپ ان سے باخبر بھی کیسے ہو سکتے ہیں کہ اس کے لیے اس دل سے محبت کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے آپ سے شکوہ کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے شاید......''

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی اندھا دھند اپنے لباس میں الجھتی اندر بھاگ گئی تھی۔ ابنِ زید سرد آہ بھر کے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

یہ کس نے کہا تم کوچ کرو۔ بہانیں نہ بناؤ انشاء جی!
یہ شہر تمہارا اپنا ہے اسے چھوڑ نہ جاؤ انشاء جی!

اگلے روز وہ اسے لینے کے لیے آیا تو روبی بھی آئی ہوئی تھی پہلے تو اس کی ایکسائٹمنٹ ہی ختم نہ ہوئی وہ کھلم کھلا بار بار دیا کی قسمت پر رشک کرتی رہی تھی اور اسے مبارک باد سے نوازتی رہی پھر اس نے بڑے مان کے ساتھ غلام حسین سے کچھ سنانے کی فرمائش کر دی تھی۔ وہ معمول کی

نسبت بے حد سنجیدہ تھا مگر روبی کو انکار نہیں کیا تھا۔ اور انشا جی کا کلام منتخب کیا تھا۔ دیا چائے کی ٹرے سمیت آئی تو اسے آنکھیں موندے ایک وجد کی کیفیت میں گنگناتے پایا تھا۔

جتنے بھی یہاں کے باسی ہیں سب کے سب تم سے پیار کریں
کیا ان سے بھی منہ پھیرو گے یہ ظلم نہ ڈھاؤ انشاء جی
کیا سوچ کے تم نے سینچی تھی یہ کیسر کیاری چاہت کی
تم جن کو ہنسانے آئے ہو ان کو رلاؤ انشاء جی

اس کی خاموشی اور اداسی چونکا دینے والی تھی۔ طبیعت کا چونچال پن سرے سے غائب تھا وہ کچھ حیران حیران سی اسے دیکھ رہی تھی جب روبی اس کے کانوں ہی گھس کر ہنسی تھی۔

''یار انہیں کیا ہوا! شادی کا تیسرا دن اور یہ اتنے سنجیدہ۔ کہیں تم نے تو موڈ آف نہیں کیا؟''

دیا نے اپنی گڑبڑاہٹ کو چھپا کر اسے مصنوعی خفگی سے گھورا تھا۔

اس پھول کے جیسی دھرتی پر کس شے کی کمی محسوس ہوئی
کیوں چاند نگر کو جاتے ہوئے اتنا تو بتاؤ انشاء جی!

انداز کی بے دلی اس قدر عیاں تھی کہ اس نے ادھوری غزل چھوڑ دی اور روبی سے معذرت کر لی تھی۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں رکا بھی نہیں تھا دادو کے اصرار کے باوجود۔

''نہیں نانو میں پھر کبھی کھانا کھا لوں گا آ کر، ابھی جانے دیں پلیز!''

اس نے انہیں ٹالا تھا پھر لاتعلق نظر آتی دیا کو دیکھ کر بولا تھا۔

''چلیں دیا!''

اور وہ بنا کچھ کہے اس کے پیچھے پورٹیکو میں آ گئی تھی۔

دل تڑپتا ہے تیرے لیے، بھری محفل میں کیسے کہوں
کل میری جان ایسا نہ ہو، تو رہے میں نہ رہوں
دل تڑپتا ہے تیرے لیے......................

اس نے گاڑی گیٹ سے نکالتے ہوئے کیسٹ پلیئر آن کر دیا تھا۔ دیا نے کئی بار کن اکھیوں سے اسے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ ہونٹ سختی سے بھینچے کسی الجھاؤ کا شکار، اس کی سمت ہرگز متوجہ نہیں تھا۔ وہ پتا نہیں کیوں اتنا جھلائی کہ ہاتھ مار کر ٹیپ آف کر دیا۔

''ضروری نہیں کہ آپ اپنی ٹینشن دوسروں پر بھی زبردستی مسلط کریں''

اس کے چونک اٹھنے اور سوالیہ نگاہوں سے اپنی جانب تکنے پر وہ بھڑک کر بولی تھی۔

غلام حسین نے گہرا سانس بھر لیا۔

''میں سمجھا نہیں۔ کون سی ٹینشن؟''

''یہ تو آپ کو پتا ہو گا'' وہ نروٹھے پن سے بولی تو غلام حسین جیسے ایک دم خاطر خواہ سنبھلا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ ڈونٹ وری!''

''ایکسکیوزمی صاحب میں کیوں پرواہ کرنے لگی وہ بھی آپ کی پریشانی کی؟''

اس نے رکھائی کی انتہا کرتے ترخ کر کہا تھا۔ غلام حسین نے جواباً اس پر صرف ایک نگاہ ڈالی تھی جس میں احساس آ گہی تھی۔ کرب اور تھکن تھی۔

(شاید میں نے من مانی کر کے اچھا نہیں کیا۔ ضروری تو نہیں محبت کا بے ساختہ اور بے پایاں احساس ہر بار جیت کا باعث ہی بنے)

وہ جیسے یکا یک شدید تھکان محسوس کرنے لگا۔

''اتنا غلط سمجھتی ہو مجھے؟''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا دیا نے سر جھٹک کر رخ پھیر لیا تو غلام حسین نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''گاڑی رکی تو وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ مگر غلام حسین اس کے پیچھے نہیں آیا تھا وہیں سے گاڑی موڑ کر پھر کہیں چلا گیا۔

''غلام حسین کہاں رہ گیا بیٹے!''

رات کو جب وہ کھانے کی ٹیبل پر بھی نہیں تھا تب پھپھو نے اس سے استفسار کیا تھا وہ کیا بتاتی محض انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''حد ہے اس لڑکے سے۔ ذرا جو عادتیں بدلی ہوں۔ میں سمجھتی تھی شادی کے بعد بدل جائے گا مگر یہ خوش فہمی بھی دھری رہ گئی۔ زینی فون کرو بیٹے اسے بتاؤ ہم کھانے پر انتظار کر رہے ہیں''

زہرہ پھپھو اتنا جھلائی تھیں کہ آف موڈ کے ساتھ بولتی چلی گئیں۔

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ابنِ زید کہ یہ تم ہو۔ کہاں چھپ گئے تھے یار''

عبدالعلی کے کان سے فون لگا ہوا تھا اور وہ جوشِ مسرت سے بلند آواز میں بات کر رہے تھے۔

زہرہ پھپھو نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''ابن زید سے بات کر رہے ہیں؟''

جواباً وہ مسکرائے تھے پھر فون ان کی سمت بڑھا دیا۔

''ابن زید اپنی بھابھی سے بات کرو پہلے!''

زہرہ پھپھو نے بے تابی سے کارڈلیس ان کے ہاتھوں سے لیا تھا پھر جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔

ابن زید چاچو عراقی مجاہد ہیں۔ اٹھارہ سال قبل جب میری پیدائش ہوئی تھی تب یہ بیس کیمپ آئے تھے کشمیر سے شدید زخمی حالت میں۔ بابا انہیں وہاں کیمپ میں زیر علاج رکھنے کی بجائے گھر لے آئے تھے بابا کے خیال میں ابنِ زید چاچو میں کچھ ایسا انوکھا تھا جو جکڑ لیتا تھا۔ وہ واقعی بہت خاص ہستی ہیں۔ میں نے تصویریں دیکھی ہیں ان کی آپ کو بھی دکھاؤں گی۔ سارے لوگ کہتے ہیں نا بھائی بہت حسین ہیں۔ مگر آپ ابنِ زید چاچو کی تصویر دیکھ کر مان جائیں گی دنیا میں بھائی سے بڑھ کر بھی حسین اور چارمنگ لوگ ہیں۔

زینب جو دیا کی لاعلمی کے باعث اسے ابن زید کا تعارف کرا رہی تھی آخر میں کچھ شوخی سے بولی تھی۔ دیا کسی قدر جھینپ گئی۔

''میں نے ہرگز یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ محترم دنیا کے سب سے حسین انسان ہیں''

جواباً اس نے کس قدر بدمزگی سے مگر بظاہر نارمل انداز کو اختیار کیا تھا۔ غلام حسین اسی پل وہاں آیا تھا۔ اس کی بات سن کر کھنکارتا ہوا کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''غلام حسین کی کیا بات کرتے ہیں ابن زید صاحب! آپ کو اپنی پیش گوئی تو یاد ہو گی جو اسے تب دیکھ کر آپ نے کی تھی کہ اس کی پیشانی غیر معمولی طور پر روشن اور منور ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ دنیا، آخرت میں سرخروئی حاصل کیا کرتے ہیں''

فون اب پھر عبدالعلی کے پاس تھا اور وہ ابنِ زید کی غلام حسین کے متعلق کی گئی کسی بات کے جواب میں سرد آہ بھر کے بولے تھے۔

''سنگر بن گئے ہیں محترم!'' ساری امیدوں کو خواہشوں کو خاک میں ملا کر''

غلام حسین نے چونک کر انہیں دیکھا پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے بڑھ کر کارڈلیس فون ان کے ہاتھ سے اچک لیا۔

''چاچو ہیں نا؟ مجھے بات کرنے دیں پلیز!''

وہ مسکرایا تھا پھر فون کان سے لگا کر ابن زید کو سلام کرنے کے بعد بات کرتا ہوا ڈائننگ ہال سے چلا گیا عبدالعلی گہرا سانس بھر کے رہ گئے۔

''میرا خیال ہے ہم کھانا شروع کریں۔ یہ تو پتا نہیں کب فارغ ہوں گے۔''

زہرہ پھپھو نے مسکرا کر کہا اور دیا کو کھانا شروع کرنے کا اشارہ کرتیں عبدالعلی کی پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں۔

☆☆☆

منگنی ہونے کے بعد سکندر نے شادی پر اتنا زور ڈالا تھا کہ اگلے ایک مہینے کے اندر اسوہ کو رخصت کرا کے لے آیا۔ وہ اتنی جلدی یہ سب ہو جانے پر راضی نہیں تھی مگر اب انکار کا جواز بھی نہیں تھا۔ سکندر کے بعد اگر کوئی اس شادی سے سب سے زیادہ خوش تھا تو وہ اماں ہی تھیں۔ زارا تو پہلے ہی خاموش طبع تھی سکندر کی منگنی کے بعد تو جیسے اسے چپ لگ گئی تھی۔ شادی کی تقریب بہت سادگی سے انجام پائی تھی۔ یہ اسوہ کی خواہش تھی جسے سکندر نے مقدم جانا تھا۔ رشتہ دار تو اتنے تھے بھی نہیں زیادہ تر سکندر کے کولیگز اور دوست ہی شریک ہوئے تھے پیازی کلر کے لہنگے میں ہمرنگ زیورات سے سجی ہوئی اسوہ اس دن عام دنوں سے کہیں بڑھ کر حسین مگر اداس لگتی تھی۔ سکندر نے اس کی اداسی کو اپنے گھر والوں سے جدائی پر محمول کیا تھا رات کو سب مہمانوں کے لوٹ جانے کے بعد اماں نے جب اسے رونمائی میں اپنی بری کے کنگن جو اسی مقصد کے لیے سنبھالے گئے تھے اسے دیئے اور کمرے میں بھیجا تو سکندر کو پہلے ہی مرحلے پر دھچکا سہنا پڑا تھا۔ زیور اور میک اپ اتارے سادہ سے لباس میں اسوہ سامنے ہی پلنگ پر بیٹھی اپنے لانبے بال سلجھا کر انہیں جوڑے کی شکل میں لپیٹ رہی تھی۔ انداز اتنا نارمل اور عام سا تھا جیسے یہ اس کی اپنی شادی کا دن نہ ہو بلکہ وہ کسی کی شادی بھگتا کر اب خود معمول کے کام نپٹا رہی ہو۔

''دروازہ بند کرنا ضروری ہے کیا؟ اتنی تو گرمی ہے پہلے ہی''

اسے حیرانی سے نکل کر گہرا سانس بھر کے دروازہ بند کرتے دیکھ کر وہ کسی قدر نخوت سے بولی تو سکندر نے اس کی بات ان سنی کر دی تھی۔

''اتنی بھی زیادہ نہیں ہے، یہ کشمیر ہے یعنی جنت نظیر، یہاں گرمی ناگوار اور محسوس نہیں ہوتی۔ پھر دروازہ تو بند کرنا یوں بھی ضروری ہے۔ یہ ہماری سہاگ رات ہے۔ ہم نہ بھی کوئی رومینٹک سین کریں مگر گھر والے تو یہی توقع رکھتے ہوں گے نا یار سو فارمیلٹی پوری کرنے دو''

وہ قطعی غیر سنجیدہ تھا۔ آنکھوں میں مچلتی شرارت اور لبوں کے گوشوں میں بڑی شوخ و شنگ سی مسکان اس کے موڈ کی خوشگواری کی گواہ تھی مگر اسوہ کی جان پر بن آئی تھی۔ سکندر سے نکاح ہو جانے کے بعد اس کے اندر ایک دم سے ملال کا احساس گہرا ہو گیا تھا۔ اپنی جلد بازی اور

فیصلے کی حماقت کا احساس اسے سخت مضطرب کر گیا تھا۔ وہ بھلا ابنِ زید سے اتنی جلدی بددل اور مایوس کیوں ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ اس کے جذبوں کی ہی کوئی کجی تھی وہ بے حد جذباتی لڑکی تھی۔ اس کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے فیصلے اس کے مزاج کے عکاس تھے۔ نکاح کے بعد وہ رخصتی نہ کرانے پر اینٹھ گئی تھی اور بی جان سے باقاعدہ الجھی تھی اس بات پر، جواب میں ان کی زندگی میں پہلی بار اسے زبردست ڈانٹ پھٹکار سہنی پڑی تھی۔ کتنا غصہ آ گیا تھا انہیں اس کی اس بچگانہ ضد پر۔

''دماغ ٹھیک ہے اسوہ! شادی بچوں کا کھیل نہیں ہوتی۔ اور مجھے حیرت اس بات پر ہے تمہیں اب ایکدم سے ہوا کیا؟ مت بھولو کہ یہ پروپوزل میں نے تمہاری وجہ سے ایکسپٹ کیا تھا۔ اور اگر یاد ہو تو اس وقت تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی مگر تم نے میری ایک نہیں سنی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے گھر سدھارو اور سنو مجھے اب تمہاری کوئی شکایت سکندر سے یا اس کی ماں سے نہیں ملنی چاہئے، بچپنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے''

اسے بری طرح سے روتے دیکھ کر بھی انہوں نے اپنے لہجے کی سختی میں کمی نہیں آنے دی تھی اور وہ یونہی روتی دھوتی اور بی جان سے بے پناہ شکایتیں لیے رخصت ہو کر سکندر کے بے حد عام سے گھر میں آ گئی تھی تو دل کی گھبراہٹ یکلخت بڑھ گئی تھی۔ کتنی مشکل سے اس نے اپنے آنسو ضبط کئے تھے۔ مگر اب سکندر کی باتیں اسے ایک لمحے کو تو لگا تھا وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ سکندر کی آنکھوں میں مردانگی کے سارے شوخ رنگ اسی کے لیے تھے اور اس کی جان ہوا ہوئی جا رہی تھی۔ سکندر آ کر بستر پر اس کے برابر بیٹھا تو وہ غیر محسوس انداز میں دور سرکی تھی۔ سکندر کے کمرے میں پھولوں کی سجاوٹ اور بستر کی نئی چادر کے علاوہ کوئی اضافی آرائش نہیں تھی۔ البتہ دیواروں پر نیا چونا نظر آ رہا تھا۔ جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی۔ وہ سنگل نواڑی پلنگ تھا اس مختصر سے پلنگ پر سکندر کے اتنا نزدیک آ جانے پر اس کا دل گھبراہٹ کا شکار ہوتا زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ ہتھیلیاں اور پیشانی پسینوں سے بھیگ گئی سکندر کی حیثیت اور استحقاق کا اندازہ کر کے ہی اس کی سانس اٹکنے لگی تھی۔

''تم نے لباس کیوں اتنی جلدی بدل دیا اسوہ؟ میں نے تو تمہیں سب کے سامنے ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' سکندر نے اس سے شکوہ کیا تھا اور اس کا دھیرے دھیرے کانپتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کنگن پہنانے لگا تو اسوہ کی رنگت یکدم پیلی پڑ گئی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بہت تھکن بھی محسوس کر رہی ہوں۔ سکندر میں سو جاؤں کیا؟''

جیسے ہی سکندر نے اسے کنگن پہنایا تھا اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچتی وہ بے حد لجاجت سے بولی سکندر نے چونک کر اسے دیکھا اور پریشان نظر آنے لگا۔

''کیا ہوا ہے؟ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں''

''کیا بتاتی۔ اتنی سریس بیماری تھوڑی ہے۔ سر درد ہے معمولی''

وہ ایک دم جھلائی اور نروٹھے پن سے بولی تھی۔ سکندر کچھ مایوس اور بددل سا ہو کر رہ گیا۔

''او کے کیوں نہیں۔ بلکہ اگر تم چاہو تو میں چائے کے ساتھ تمہیں پین کلر بھی لا دیتا ہوں''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے اور تم کہاں سوؤ گے؟''

رکھائی سے کہتی وہ لیٹتے لیٹتے جیسے ایک دم چونک کر الرٹ سے انداز میں بولی۔ سکندر شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ آہستگی سے مسکرایا۔

''ظاہر ہے یہیں''

''یہیں یعنی اس پلنگ پر؟ اتنا مختصر سا تو ہے یہ''

اسوہ کی آنکھیں پھیل گئی تو سکندر کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

''اس سے مختصر بھی ہوتا تو چلتا مادام! اب فاصلوں کی ضرورت بھی کہاں ہے میاں بیوی ہیں ہم!''

اسوہ تو گویا کہہ کر پچھتائی تھی۔ خائف سے انداز میں سرخ چہرے کے ساتھ نظریں چرائیں۔

''پلیز سکندر! میں ان کنفرٹیبل فیل کروں گی''

وہ یونہی نگاہیں چار کئے بنا بولی تو سکندر کے چہرے پر ایک سایہ لہرایا تھا۔

''او کے فائن! تم لیٹ جاؤ میں کرتا ہوں کچھ۔ مگر سنو یہ رعایت صرف آج کے دن کے لیے ہے۔ او کے؟''

سنجیدگی سے بات کرتے آخر میں پھر اس کا لہجہ اور آنکھیں لو دینے لگی تھیں۔ اسوہ کے لیے یہی مہلت کافی تھی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ وہ بے فکر ہو کر لیٹی تو نیند میں گم ہوتے لمحہ نہیں لگا تھا۔ جبکہ نیچے فرش پر چٹائی پر تکیہ رکھ کر لیٹا سکندر کروٹیں بدل بدل کر پریشان اور عاجز ہوتا رہا تھا۔

☆☆☆

میں تو لفظ تیری ذات ہوں
مجھے حرف حرف تو مٹا تو نہ

تیرا ساتھ مانا کہ چاہیے
مگر اس قدر تو ستا تو نہ
میں بکھر گیا تو سمیٹ لے
میری دھول تو یوں اڑا تو نہ
تیری سانس بن کے رہوں گا میں
کہ وہ وعدہ ایسے بھلا تو نہ
تجھے چاہنا ہی ہے دوش کیا
جو نہیں تو اتنا رلا تو نہ

زینب کے سر پر کھڑا ہو کر وہ اپنی پیکنگ کرانے میں مصروف تھا جب دروازہ کھول کر دیا اندر داخل ہوئی اس نے غصیلی نگاہ غلام حسین پر ڈالی تھی اور کچھ کہے بغیر جا کے صوفے پر بیٹھ گئی اور میگزین کھول کر ورق گردانی کرنے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ بیگ بند کر دو۔ شیونگ کٹ رکھی ہے؟''

اس نے غلام حسین کی آواز پر اٹھایا وہ زینب سے مخاطب تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل اسے پھپھو سے علم ہوا تھا کہ وہ امریکہ جا رہا تھا۔ کنسرٹ کے سلسلے میں۔ دیا کا یہ سنتے ہی فشارِ خون بڑھتا چلا گیا تھا۔ شادی کے بعد وہ اس سے سرد جنگ میں اتنا مصروف ہوئی تھی کہ اصل بات تو اس کٹھائی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

زینب کے باہر جاتے ہی وہ اس کے سر پر سوار ہوئی تھی انداز بے حد کڑا تھا۔ غلام حسین سیل فون پر مصروف تھا شاید کسی کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔

''مما نے بتایا نہیں شو کے سلسلے میں......''

''آئی تھینک یہ شادی اسی شرط پر ہوئی تھی کہ آپ میوزک چھوڑ دیں گے''

وہ پھنکارزدہ لہجے میں بولی تو گلابی رنگت غصے کی زیادتی سے دہک کر انگارا ہو رہی تھی۔

غلام حسین نے چونک کر مگر بغور اسے دیکھا تھا۔

''میں نے ایسا کوئی ایگری منٹ سائن نہیں کیا تھا مجھے یاد ہے اچھی طرح''

اس نے نخوت سے جواب دیا تو دیا ہکا بکا رہ گئی تھی۔

یو چیٹر! آپ میرے ساتھ اس طرح نہیں کر سکتے۔

وہ حواسوں میں لوٹتے ہی بپھر پڑی۔

''کیا نہیں کر سکتا؟''

غلام حسین نے سیل فون پٹخا اور غصے سے اٹھ کر اسے گھورتے ہوئے مشتعل آواز میں پوچھا۔

''مجھے آپ کا یہ گانا بجانا بالکل پسند نہیں ہے۔ فوراً علیحدگی اختیار کریں اس سے۔ آپ کو میری پسند میرے جذبات کا پاس کرنا ہوگا''

''اور تم نے کتنا میری پسند اور میرے جذبات کا پاس کیا؟؟ میری محبت تمہیں ہوس محسوس ہوتی ہے نا؟''

''تمہاری بلا سے میں جو مرضی کروں اپنی زندگی میں''

غلام حسین جواباً چیخ پڑا تھا۔ پہلے دن کے بعد سے ان کے درمیان دوریوں کی خلیج حائل تھی تو اس کا سبب دیا کی وہ تلخ کلامی اور ناگواری ہی تھی۔ غلام حسین اتنا انا پرست تھا کہ اس کے بعد دوبارہ پیش رفت نہیں کی تھی۔ اب جو دیا نے اس پر اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غصے میں جتلا گیا۔

دیا کا سرخ پڑتا چہرا اس کی خفت کا گواہ تھا اور غصے کا بھی۔

''اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اصل آگ اسی بات کی لگی ہوئی ہے آپ کو''

وہ طنزیہ کاٹ دار لہجے میں پھنکاری تو غلام حسین کے چہرے پر تمسخر پھیل گیا تھا۔

''تم اپنی ہر سوچ میں آزاد ہو مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے صفائیاں پیش کرنے کی''

''میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو چیلنج بن گئی تھی نا آپ کے لیے۔ آپ کی غیرت کو للکارا تھا نا آپ کو نظر انداز کر کے میں بس بدلہ لے لیا اس طرح''

غلام حسین کے سرد وسپاٹ انداز اور بیگانے نخوت زدہ لہجے نے خنجر بن کر اس کے دل پر وار کیا تھا۔ اس کے گمان تک میں بھی نہیں تھا غلام حسین جو اس کی ایک جھلک پر فدا ہوا کرتا تھا اس طرح رکھائی اور تلخی سے بھی بات کر سکتا ہے۔ زعم بکھرا تھا تو اسے خود کو کمپوز رکھنا نہیں آسکا۔ وہ بری طرح سے رو پڑی تھی۔ غلام حسین نے بے حد مضطربانہ نظروں سے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا۔

''ایسی ہرگز کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے بالکل بھی تمہیں چیٹ نہیں کیا دیا! کیسے سمجھاؤں تمہیں؟''

اس کے آنسو برداشت سے باہر ہوئے تو وہ وضاحتیں پیش کرنے پر خود بخود مجبور ہو گیا تھا۔

دیا نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں سمیت اسے غیر یقینی سے دیکھا۔

''آپ وہاں نہیں جائیں گے بس''

اس کا لہجہ ضدی تھا۔ غلام حسین سخت عاجز ہوا۔

''یہ بھلا کیسی فضول بات ہے؟ اب کام بھی نہ کروں میں اپنا؟''

''یہ کام نہیں کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا''

''تمہیں تو میں بھی اچھا نہیں لگتا۔ کیا اب میں خود بھی کہیں جا مروں؟''

وہ اتنا جھلایا تھا کہ قہر بھرے انداز میں کہہ گیا۔ دیا نے بے حد ناراضی سے اسے دیکھا۔

''اور لگا لیں مجھ پر الزام اگر کوئی رہ گیا ہے۔ اور جانا اتنا ضروری ہے تو میں ساتھ چلوں گی آپ کے''

وہ نروٹھے پن سے بولی تو غلام حسین کچھ دیر اس جھنجلائی ہوئی کیفیت میں اسے تکتا رہا تھا پھر ایک دم ہنس پڑا۔

''ایک بات پوچھوں بیوی؟''

وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ دیا کچھ خائف اور گریزاں سی ہونے لگی۔

''یار محبت تو نہیں ہو گئی مجھ سے معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے''

اس کی آنکھوں میں جھک کر زبردستی جھانکتے ہوئے اپنی بات کا مزا لے کر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔

جبکہ دیا کے چہرے پر سرخی کے ساتھ تمتماہٹ بکھرتی چلی گئی تھی۔

''خوش فہمی اچھا مرض ہے''

اس نے لاکھ چاہا تھا اپنا مخصوص اکل کھرا انداز اور بے نیازی قائم رکھے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

''وہاں جو تھرڈ کلاس حرکتیں کرتے ہیں نا آپ لڑکیوں کے ساتھ سب پتا ہے مجھے! اسی لیے جانا چاہتی ہوں کہ آپ کی حرکتوں پر نظر رکھ سکوں۔ پھپھو سے شکایت بھی لازمی کروں گی''

اس کی بجائے وہ خود اسے وضاحتیں پیش کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ غلام حسین اسے گہری نظروں سے تکتا مسکرائے گیا تھا۔

''اب اتنی ظالم بھی نہ بنو بیوی! اپنے قریب آنے پر تو پابندی لگائی ہی ہے۔ باہر کے عیش پر بھی نظر رکھیں گی تو میرا رومانس کا کوٹہ کیسے پورا ہوگا''

مصنوعی آہیں بھرتا ہوا وہ بے حد فارم میں آچکا تھا۔ دیا کے چہرے پر حیا کی سرخی کا رنگ مزید گہرا ہو کر رہ گیا۔

"یار سیدھی طرح سے کہہ دو اصل بات کہ تم میرے بغیر اتنے دن نہیں رہ سکتی ہو۔ کیا جائے گا تمہارا! میں بیچارا ذرا سا خوش ہو لوں گا نا"

"میرا دماغ خراب نہیں ہے فی الحال کہ فضول باتیں کرتی پھروں"

اس نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تو غلام حسین ایک دم بجھ سا گیا۔

"کب ہے آپ کی فلائٹ مجھے بتائیں تا کہ میں پیکنگ کر لوں؟"

وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس نے اب غلام حسین کو ہر قیمت پر سدھارنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی فی الحال وہ اسے وہاں جانے سے نہیں روک سکتی۔ وہاں جا کے آگے کیا کرنا ہے کس طرح اسے اس کام سے باز رکھنا ہے اس نقطے پر فی الحال اس نے غور نہیں کیا تھا۔

"دیا میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس بات کو کس رنگ میں لیتی ہو۔"

دوٹوک قطعی اور اکل کھرا انداز تھا۔ جس میں رتی برابر بھی کوئی گنجائش کا شائبہ نہیں تھا دیا کا چہرہ متغیر کر کے رکھ گیا۔ غلام حسین نے اس کی پھیکی پڑی رنگت کو چند لمحے دیکھا تھا پھر مزید کچھ کہے بغیر سختی سے ہونٹ بھینچے پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ دیا ابھی تک غیر یقینی کے عالم میں بتلا ساکت کھڑی تھی۔

☆☆☆

اس نے ایک سرمستی کی کیفیت میں اپنی بائیک دروازے کے باہر باغیچے کے پاس روکی اور سیٹی پر کسی شوخ گانے کی دھن بجاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دو دن پہلے ویسے کی شام ہی اسوہ بی جان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ حالانکہ وہ بالکل بھی ایسا نہیں چاہتا تھا مگر اسوہ کی خواہش کے آگے اس نے اپنے دل کی خواہش کو دبا لیا تھا۔ میرون کلر کی پشواز میں کندنی زیورات سے سجی وہ قدیم مغلیہ دور کی شہزادی کی طرح ہی نظر آ رہی تھی اور سکندر نے اس دن اس پر اپنے دل کی تمام بے تابیاں عیاں کرنے کے کتنے منصوبے تیار کر لئے تھے مگر زارا کے اس پیغام پر کہ اسوہ اسے اندر کمرے میں بلا رہی ہے وہ پہلے تو حیران ہوا تھا پھر مسکراہٹ دباتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

"یار زوجہ تمہیں تو لگتا ہے مجھ سے بھی بڑھ کر بے چینی ہے۔ دھیرج جانِ من ابھی

مہمان گھر پر ہیں۔ اماں بھی کیا سوچیں گی۔ ساری رات اپنی ہی ہے"

وہ جتنا شوخ ہو رہا تھا اسی لحاظ سے اس کی گفتگو بھی شگفتہ تھی۔ جس پر شاید اسوہ نے پوری طرح سے دھیان بھی نہیں دیا تھا۔

"میں بی جان کے ساتھ جانا چاہ رہی ہوں سکندر مگر وہ مجھے نہیں لے جا رہی ہیں"

دوپٹے سے پنیں نکالتے ہوئے وہ بسور کر بولی تھی سکندر آہستگی سے ہنس پڑا۔

"انہیں اپنے داماد کے ارمانوں پر اوس پڑ جانے کا اندازہ ہو گا یقیناً!" اور تم مجھے بتاؤ تم کیوں جانا چاہ رہی ہو؟"

اس نے بات کے اختتام پر اسے بے دریغ گھورا تھا۔

"میرا دل اداس ہو گیا ہے نا، پلیز جانے دیں سکندر کل آ جاؤں گی"

وہ بے حد ملتجی ہونے لگی۔ سکندر نے آف ہوتے موڈ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

"میں اپنے گھر کے لیے بھی تو اداس ہو سکتی ہوں نا۔ اور آپ کیا ابھی سے مجھ پر اتنی پابندیاں لگانے لگے بعد میں پتا نہیں کیا کریں گے"

وہ فوراً آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لائی تھی۔ سکندر انہی آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا گویا۔

"یار ظالم بیوی کچھ میرا بھی خیال کر لو۔ کل طبیعت خراب تھی تمہاری اور آج......"

"میرے ساتھ رومانٹک ہونے کی بالکل ضرورت نہیں"

وہ جیسے ہی اس کے نزدیک آیا اسوہ نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا اور برہمی سے بولی۔ سکندر آہ بھر کے رہ گیا۔

"ٹھیک ہے پھر تو تم چلی ہی جاؤ اگر رومینٹک ہونے کی اجازت نہیں دینی"

وہ منہ لٹکا کر بولا مگر اسوہ اس قدر چہک اٹھی تھی۔

"سنو اگر وہاں جا کے میرے لیے اداس ہو جاؤ تو رات کا کوئی بھی وقت ہو بتا دینا آ جاؤں گا میں" اسے لپک جھپک تیاری کرتے دیکھ کر سکندر نے اسے خصوصی آفر کی تھی اور بات کے اختتام پر جس طرح اسے دیکھ کر آنکھ ماری اسوہ بے ساختہ بلش کر گئی تھی۔ سکندر اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر زچ کرنے والے انداز میں ہنستا رہا تھا۔ پھر وہ چلی گئی تھی اور سکندر کاموں میں ایسا الجھا تھا کہ ہزار چاہنے کے باوجود اگلے دن اسے لینے نہیں جا سکا۔ اب آفس سے نکلتے ہی اس نے اس سمت کا رخ کیا تھا تو وجہ اس کے کولیگز کی طرف سے دی گئی دعوت بھی تھی جس میں بہر حال

کی شرکت ضروری تھی۔ حسب سابق وہ سب سے پہلے بی جان کے کمرے میں آیا تھا۔ ان سے سلام دعا کے بعد خیریت دریافت کرتا رہا تھا۔

''ابن زید کیسے ہیں بی جان!''

ٹھیک ہے بیٹے! اپنے کمرے میں ہوگا میں اسے بلواتی ہوں۔ انہوں نے انٹر کام کی سمت ہاتھ بڑھایا تو سکندر ٹوکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''رہنے دیں بی جان! میں خود چلا جاتا ہوں اسوہ بھی اپنے کمرے میں ہوگی نا؟''

''ہاں بیٹے میں اسے چائے کا کہتی ہوں۔ تم کھانا کھا کر ہی جانا اب''

انہوں نے نرمی سے کہا تو سکندر مسکرا کر سر اثبات میں ہلاتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل پر آ گیا تھا۔ پہلے راہداری کے آغاز میں اسوہ کا کمرا تھا وہ اسی سمت آ گیا۔ دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا تھا۔ کمرا نیم تاریک تھا اور اے سی کی کولنگ سے بھرپور وہ سامنے ہی بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ دراز کھلے بال بستر پر دور تک بکھرے نظر آئے تھے۔ گلابی کپڑوں میں اس کی اپنی رنگت بھی لباس سے میچ کر رہی تھی۔ چہرے کی ملاحت اور دلکشی سحر طاری کرتی تھی۔ وہ بے خود سا آگے بڑھ آیا۔ آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں سے لپٹی موٹی لٹوں کو نرمی سے ہٹا رہا تھا جب اسوہ کی دراز ریشمی پلکوں میں جنبش ہوئی تھی اگلے لمحے اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر خمار آلود سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اب میں تم سے اس بات پر معذرت تو کرنے سے رہا کہ تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔ آف کورس نکاح کی صورت پرمٹ حاصل کر چکا ہوں اس کام کا''

اس کے چہرے پر سرخی سی چھا گئی تھی۔ دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتے ہوئے اس کی جھکی پلکیں لرزیں۔ سکندر نے بہت دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا تھا اور مسکراہٹ دبائی۔

''ایٹی کیٹس بھی کسی چڑیا کا نام ہے غالباً''

وہ بستر سے اتر کر پیروں میں سلیپر اڑستے ہوئے کس قدر نخوت سے بولی تھی۔ سکندر نے جواباً ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کے نزدیک سے گزرنے پر ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پر گرفت مضبوط کر لی تھی۔

''میاں بیوی میں ان فارملیٹیز کو نبھانا اتنی اہمیت نہیں رکھتا''

اس کا موڈ خوشگوار تھا۔ وہ بہت نرمی سے اس کی کلائی کے گداز اور نزاکت کو محسوس کر رہا تھا۔ اسوہ کے چہرے پر سنسناہٹ بکھر گئی وہ ہونٹ بھینچے جیسے کسی امتحان سے دو چار کھڑی تھی۔

''ابن زید سے ملے آپ؟ میں چائے بناتی ہوں آپ کے لیے''

''نہیں وہیں چلتا ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں لینے آیا ہوں تمہیں''

وہ اس کی کلائی چھوڑ کر اٹھتا ہوا بولا تو اسوہ نے ایک بار پھر ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ جانا تو تھا ہی۔ یہاں رکنے کا اب کوئی جواز کہاں رہا تھا۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور دروازے سے نکلتے سکندر کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ جس وقت وہ چائے کی ٹرے کے ساتھ ابنِ زید کے کمرے میں پہنچی دونوں حسب سابق کسی سنجیدہ و سنگین موضوع پر بات کرنے میں مصروف تھے۔ اس کی آمد پر یہ سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔

''اسوہ آپ نے چائے پر اہتمام کیوں نہیں کرایا۔ سکندر شادی کے بعد پہلی بار آیا ہے یہاں''

ابن زید نے بے ساختہ ٹوکا تھا۔ اسوہ نے ان سنی کر دی۔ سکندر مسکرا دیا تھا۔ اپنے ازلی سادہ انداز میں کم آن ابن زید! یہ کباب، بسکٹس اور نمکو کیا اہتمام نہیں ہے؟ مجھ سے تو یہ سب بھی نہیں کھایا جائے گا

''میں جانتا ہوں۔ خوشی کے مارے آج کل تمہاری بھوک اڑی ہوئی ہے''

ابن زید نے اپنی عادت کے برخلاف اسے چھیڑا تو سکندر کالج بوائے کی طرح جھینپ کر سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے اسوہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح سپاٹ تھا۔ پھر اسی موقع پر نہیں اسوہ کی سنجیدگی نما رنجیدگی ہر جگہ برقرار رہی تھی۔ بی جان نے ان لوگوں کو کھانا کھانے بغیر نہیں آنے دیا تھا۔ جبھی واپسی پر رات مکمل طور پر ڈھل چکی تھی۔

''میرے سب دوست میری قسمت پر رشک کر رہے تھے تمہاری وجہ سے''

وہ بائیک پر اس سے مناسب فاصلہ رکھ کر بیٹھی تو سکندر نے اسے بولنے پر اکسانے کو گفتگو کا آغاز کیا تھا مگر اس کی خاموشی کو توڑنے میں ناکام رہا۔

''کیا بات ہے؟ تم اتنی خاموش کیوں ہو اسوہ؟''

''کچھ نہیں''

اس نے مختصر جواب دیا تھا اور پھر خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ گھر آ کے وہ سکندر کی پرواہ کیے بغیر ٹی وی کے آگے جم گئی تھی۔ سکندر کچھ دیر تو سب کے ساتھ بیٹھا پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا تھا۔

باب 5

گو کہ وہ جانتی تھی سکندر اس کا منتظر ہوگا اس کے باوجود وہ بے نیازی سے وہاں بیٹھی رہی تھی۔ ڈرامہ ختم ہوا اور کوئی ٹاک شو آنے لگا۔ اماں نماز میں مشغول ہوئی تھیں تو زارا مروتاً کچھ دیر بیٹھی تھی پھر وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ اماں اور زارا کی چارپائیاں صحن میں ہی بچھی تھیں۔

"اب سو جاؤ بیٹے! رات بہت ہوگئی ہے۔ سکندر انتظار کر رہا ہوگا"

اماں نماز پڑھ کر آئیں تو اسے نرمی سے احساس دلایا تھا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر بوجھل قدموں کے ساتھ کمرے کی جانب آئی تھی سکندر پلنگ کی کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا اسے دیکھ کر بے اختیار پُرسکون ہوا اور تشکرانہ انداز میں لمبا سانس کھینچا تھا۔

یار...... اتنا انتظار؟ اماں اور زارا کا خیال نہ ہوتا تو خود آجاتا تمہیں لینے"

اس نے جھک کر سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکا جب سیدھا ہوا تو اسوہ کو صوفے پر بیٹھتے دیکھ کر ٹوکا تھا۔

"وہاں کدھر بیٹھ رہی ہو؟ یہاں میرے پاس آؤ نا"

اسوہ نے اب کی مرتبہ بھی جواب نہیں دیا وہ ایک مکمل سرد مہری کا لبادہ اوڑھ چکی تھی۔ سکندر نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"اسوہ میں انتظار کر رہا ہوں یار"

"تو نہ کریں میں نے تھوڑی کہا؟"

اس کا مزاج سوا نیزے پر پہنچنے لگا۔ سکندر کے ماتھے پر ایک شکن نمودار ہوئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا"

اب کے اس کا لہجہ سخت تھا۔ وہ ایک دم سنجیدگی کے حصار میں آیا تھا۔ اسوہ نے ہونٹ بھینچے رکھے۔

"میرا موڈ بالکل اچھا نہیں ہے پلیز!"

"اس روز تمہاری طبیعت اچھی نہیں تھی اور اب موڈ...... اصل بات بتاؤ مجھے"

سکندر نے اسی سنجیدگی سمیت مگر کسی قدر تلخی سے سوال کیا تھا۔

"بس اتنا ہی اسٹیمنا تھا آپ کا؟ یہی محبت تھی؟"

عجیب سوال تھا وہ الجھا تو تھا ہی خار بھی کھا گیا۔

"تمہیں جو بھی بات کرنی ہے یہاں میرے پاس آ کر کرو۔ پھر میں تمہیں محبت کے ہجے سمجھاتا ہوں"

"میں نہیں آرہی ہوں۔ بلکہ میں نہیں آنا چاہتی، بہتر ہے آپ مجھے پریشان نہ کریں"

اسوہ اب کے کسی قدر بدتمیزی سے بولی تھی سکندر کو دھچکا لگا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کے چہرے کی کبیدگی اور درشتی کو نافہم نظروں سے دیکھتا رہا تھا پھر اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے پاس آگیا۔

"واٹس یور پرابلم اسوہ! مجھے بتاؤ پریشان کیوں ہو تم؟"

"میں ہرگز پریشان نہیں ہوں اگر آپ مجھے تنگ نہ کریں"

وہ پھر اسی نخوت سے کہہ گئی۔ سکندر کو اپنا ضبط آزمانا پڑا تھا۔

"اوکے چلو بستر پر جاؤ۔ میں لائٹ آف کر رہا ہوں"

اس نے خود کو سنبھالا تھا اور کسی قدر نرمی سے بولا حالانکہ دل و دماغ غصے سے ابل رہے تھے۔ اسے اسوہ کی بدتمیزی پر شدید تاؤ آرہا تھا۔

"میں پلنگ پر آپ کے ساتھ نہیں سوؤں گی"

وہ اسے دیکھے بغیر تڑخ کر بولی تھی۔ سکندر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اوکے تم لیٹو وہاں جاکے"

اور آپ؟" اسوہ نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا تھا مگر سکندر کو شرارت سوجھ گئی۔

"اگر میری اتنی فکر کرو گی تو پھر تمہارے ساتھ ہی سوجاتا ہوں۔ اطمینان سے تو رہو گی نا تم"

وہ مسکرایا جبکہ اسوہ جھلس کر رہ گئی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ" وہ دبے ہوئے انداز میں چیخی تھی۔ اور جا کر اطمینان سے بستر پر دراز ہوگئی۔ اگلی شب اور پھر اس سے بھی اگلی شب جب اس نے اس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تو سکندر خاموشی سے یہ تماشا نہیں دیکھ سکا تھا۔

"ایسا کب تک چلے گا اسوہ؟ اور تم کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ یہ سب؟"

سکندر نے اس کی کلائی تھام کر کسی قدر سختی سے استفسار کیا تھا جبکہ وہ بپھر اٹھی تھی۔

"ہاتھ چھوڑیں میرا اور مجھ سے اس قسم کا کوئی سوال نہ کریں"

اس کے چیخ اٹھنے پر سکندر کی آنکھیں دہک کر رہ گئی تھیں۔

"کیوں سوال نہ کروں؟ مجھے حق ہے تمہارے رویّے کی وجہ جاننے کا"

"وجہ جاننا چاہ رہے ہیں؟" وہ پھنکاری۔

"ہاں بولو؟ کیوں کر رہی ہو تم ایسا، میں نے زبردستی تو شادی نہیں کی تم سے"

"پچھتا رہی ہوں اپنے احمقانہ فیصلے پر اس لیے۔ پتا نہیں میرا دماغ کیوں خراب ہو گیا تھا"

وہ حلق کے بل چیخ پڑی۔ سکندر کو جیسے شاک لگا تھا۔

"تم خوش نہیں ہو اس شادی سے؟"

وہ بولا تو اس کی آواز جیسے گہرے کنویں سے آئی تھی

"خوش؟" وہ تمسخر سے ہنسی۔

"یہاں خوش ہونے کو ہے کیا مسٹر سکندر۔ آپ شاید میرے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے قبل اپنی حیثیت فراموش کر گئے تھے۔ یہ چند گز کا ٹوٹا پھوٹا مکان بنے گا میری خوشی کا باعث یا آپ کی پھٹیچر نوکری یا پھر آپ کی یہ وجیہہ و شاندار پرسنالٹی......؟ ایسا ہے کچھ قابل ذکر آپ کے پاس؟"

وہ بولنے پر آئی تو جانے کب کب کا جمع شدہ غبار نکال دیا تھا۔ سکندر کو لگا تھا اسے کسی نے آسمان سے اٹھا کر بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ چہرے پر زلزلے کے آثار لیے ساکن پتھرایا ہوا وہ غیر یقینی سے پھٹی پھٹی آنکھوں سمیت کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر یوں بے دم انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا جیسے ٹانگوں نے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا ہو۔ اس کی تیزی سے دھندلاتی آنکھوں میں ہر منظر غیر واضح ہو چکا تھا۔ لب بھینچے سر جھکائے وہ جانے کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ ملال تاسف، رنج، بے مائیگی، اور پامالی، کتنے احساس تھے جن سے مغلوب تھا وہ۔ اسوہ غلط کہاں کہہ رہی تھی۔ وہ تھا اس قابل کہ اس جیسی شاندار لڑکی ڈیزرو کرتا۔ یقیناً نہیں۔ اس کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

☆☆☆

وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی غلام حسین ایسا کر بھی گزرے گا۔ وہ اس کی بات کو اگر مذاق نہیں بھی سمجھی تھی تب بھی پوری طرح سنجیدگی سے بھی نہیں لیا تھا۔ اپنی ذات کا ایک زعم تو بہر حال تھا۔ شعوری نہ سہی لاشعوری طور پر ہی اور احساسِ اہمیت دلانے والا بھی کوئی اور نہیں وہ خود تھا۔ پھر اب اس

درجہ بے اعتنائی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا تھا۔ مگر وہ یہ کر چکا تھا۔ اس کی فلائیٹ کے متعلق بھی دیا کو پھپھو سے پتا چلا تھا۔ ایک عجیب سے بے مائیگی کے احساس میں گھری وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ تبھی غلام حسین اپنے دھیان میں باہر آیا تھا کمرے سے، اسے جامد کھڑے پا کر اس کے پاس آ گیا۔

"خدا حافظ بھی نہیں کہو گی؟"

اس کے خفگی چھلکاتے تاثرات کو نگاہ کی زد پر رکھے وہ مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا بولا۔

دیا نے نہ چاہتے ہوئے بھی نمناک نظروں کو اٹھایا تھا۔

بلیو پینٹ کوٹ میں اپنی سحر انگیز شخصیت اور فریش شیو کی نیلاہٹوں سمیت وہ کس قدر شاندار نظر آ رہا تھا اتنا کہ وہ کچھ دیر کو اسے پلکیں جھپکائے بنا دیکھے گئی۔

"مسز سفر پر نکلنے والے لوگوں سے خفگی اچھی بات نہیں ہوتی۔ کوئی بھی حادثہ اگر انہیں ہمیشہ کے لیے چھین لے تو پیچھے پچھتاوے رہ جایا کرتے ہیں۔"

غلام حسین نے اس کے ارتکاز کو محسوس کیا تھا اور مسکراہٹ دبا کر بولا۔ اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی اس کے باوجود دیا کے دل پر جیسے گھونسہ لگا تھا۔ اس نے بے اختیار اسے ناراضی سے گھورا تھا۔

"شٹ اپ"

وہ تلخی سے بولی تھی اور مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے آگے بڑھتی گئی تھی۔ غلام حسین ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا تھا پھر گہرا سانس بھر کے قدم بڑھا دیئے تھے۔ دیا کمرے میں آئی تو ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیوم کی شیشی کے نیچے دبے پنکھے کی ہوا سے پھڑپھڑاتے صفحے نے توجہ کھینچ لی تھی۔ اس نے چونکے بنا آگے بڑھ کر صفحہ اٹھا لیا تھا۔ نظر سطروں پر بکھرے حروف پر پھسلی تھی۔

اب اگر کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاتا لوگو
راہ تکتے ہوئے پتھرا سی گئی تھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلنی ہوا سینہ لوگو
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح سے کسی اور کو نہ ستانا لوگو
بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پساریں پاؤں
نیند سی نیند ہے اب نہ اٹھانا لوگو

ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل، اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو

اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکتا چلا گیا۔ وہ جانتی تھی یہ اشعار وہ کیوں لکھ کے رکھ گیا ہے کاغذ ہاتھ کی مٹھی میں دبائے وہ یونہی پلٹ کر بھاگی اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر ریلنگ تک آ کر جھک کر نیچے جھانکا۔ نگاہ کی بے تابی نے گیٹ سے نکلتی سیاہ پراڈو کی فرنٹ سیٹ پر موجود غلام حسین کی محض ایک جھلک دیکھی تھی اور بس!

جانے کیا ہوا تھا وہ بے دم سے انداز میں وہیں ریلنگ کو تھام کر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ ایسا کیا تھا ان الفاظ میں کہ اس کے دل کو پنکھ سے لگ گئے تھے اور دل خوف کے حصار میں گھرتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ہوا تو کچھ بھی نہیں
بس تھوڑے سے مان ٹوٹے ہیں
تھوڑے سے لوگ بچھڑے ہیں
ہوا تو کچھ بھی نہیں
کچھ خوشیاں چھن گئی ہیں
کچھ چین لٹ گیا ہے
ہوا تو کچھ بھی نہیں
بس اپنا آپ گنوایا ہے
آنکھوں کو برسنا سکھایا ہے
کسی اپنے نے رلایا ہے
ہوا تو کچھ بھی نہیں
محبتوں کا صلہ پایا ہے

وہ اتنی دیر سے گھر لوٹا تھا کہ واثق امید تھی اماں بھی اس کا انتظار کرتی لازماً سو گئی ہوں گی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ یونہی گھر آنے اور اسوہ کے سامنے سے کترانے لگا تھا۔ کتنا دشوار تھا خود اپنے آپ سے بھی نگاہیں چار کرنا۔ کس قدر بے وقوف تھا وہ، کیوں بھلا دیا بھلا وہ سب کچھ۔ اتنی اندھی کیوں تھی اس کی محبت کہ اسے کچھ بجھائی نہ دیا تھا۔ حالانکہ اماں گریزاں تھیں رشتہ مانگنے جاتے، مگر وہ کتنا پُر یقین تھا اور یقین جس طرح ٹوٹا تھا اس کا کرب تھا کہ پورے وجود میں بکھر رہا تھا۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

اسے حسبِ عادت منہ ہاتھ دھو کر تخت پر بیٹھنے کی بجائے سیدھے اندر جاتے دیکھ کر اماں نے ٹوکا تھا۔ وہ ہی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

"میں کھا چکا ہوں۔ آپ سو جائیں"

اس نے دانستہ غلط بیانی کی۔ منع کر کے وہ انہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"اسی دوست کے ہاں؟"

اماں کے سوال پر وہ حیرانی سے پلٹا تھا۔

"کس دوست کے ہاں؟"

"وہیں جہاں آج تم لوگوں کی دعوت تھی۔ بچی تیار ہو کے بیٹھی رہی، حد ہے اس لاپرواہی کی۔ فون بھی بند تھا" اماں کی جھاڑ پر اس نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔

"مجھے بہت ضروری کام پڑ گیا تھا اماں! دوست سے میں معذرت کر چکا ہوں"

اس نے رسانیت سے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا پنکھے کی ہوا سے کھڑکی کے آگے تنا پردہ ایک تسلسل سے ہل رہا تھا۔ وہ پلنگ پر دیوار کی جانب کروٹ بدلے سو رہی تھی۔ سکندر نے شرٹ اتار کر پھینک دی تھی۔ پھر سگریٹ سلگا کر کچھ دیر کنپٹی کھجاتا رہا تھا۔ سارا دن وہ اتنا اپ سیٹ رہا تھا کہ کالم لکھ نہیں پایا تھا۔ اس وقت وہ یہی کام کرنے کا ارادہ باندھ رہا تھا۔ رائٹنگ پیڈ دراز سے نکال کر اسٹڈی ٹیبل پر رکھا۔ پین میں انک چیک کی اور گہرا سانس بھر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن منتشر تھا۔ اس نے جتنی بار بھی لکھا ہر بار کراس لگا کر صفحہ پھاڑ کر پھینکتا رہا تھا۔ اس کام میں البتہ اتنا مگن تھا کہ اسوہ کی بے چین کروٹوں کی سمت دھیان نہیں جا سکا۔

"کیا مصیبت ہے۔ یہ کام صبح بھی کیا جا سکتا ہے۔ مچھر کھیاں اوپر سے یہ لائٹ کی آفت۔ میری نیند خراب ہو رہی ہے سکندر"

وہ اتنا جھلائی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سکندر بے ساختہ چونکا۔ نیوی بلیو ہاف سلیو شرٹ میں اس کی گداز مرمری کلائیاں موی شمعوں کی طرح سے روشن نظر آتی تھیں اور چہرے پر اتنی تازگی اور دلکشی تھی کہ نگاہ ٹھٹھکتی تھی۔

"تم باہر صحن میں سو جاؤ جا کر اماں کے پاس"

نگاہ کا زاویہ بدلتے ہوئے وہ نخوت سے بولا۔

"کیوں سو جاؤں میں وہاں؟ آپ لائٹ بند کریں"

وہ اس جواب پر تلملا کر پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

''مجھے کام کرنا ہے۔ اگر نہیں باہر جانا تو اسی طرح سونے کی کوشش کرو''

سکندر نے جواباً منہ بگاڑ کر نخوت سے جواب دیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے اعتنائی تھی۔ جسے اسوہ نے شاید اپنی توہین سے تعبیر کیا تھا۔ جبھی بھڑک اٹھی تھی۔

''یہ کام کر رہے ہیں آپ؟ میں لائٹ بند کر رہی ہوں۔ آپ کو کام کرنا ہے تو باہر چلے جائیں''

غصے سے بڑبڑاتی وہ اٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس آئی تھی اور لائٹ بند کر دی۔ سکندر کا تو جیسے اس حرکت پر دماغ گھوم گیا تھا۔ غصہ تو اس توہین کا تھا جو اس انداز میں نکلا وہ اٹھا تھا اور لائٹ آن کرنے کے بعد خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پھنکار کر بولا تھا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے''

''آپ بدتمیزی کر رہے ہیں میرے ساتھ؟ اور کیوں دفع ہو جاؤں۔ آپ ہی لائے تھے نا مجھے یہاں میری زندگی برباد کرنے کو''

وہ تو جیسے بالکل ہی آؤٹ ہو گئی تھی غصے سے بپھرتے ہوئے انداز میں اسے زور سے دھکا دیا اور بے ساختہ چیخ پڑی تھی۔ سکندر بھی کہاں نارمل تھا اس حرکت پر دماغ اس کا بھی گھوم گیا تھا جبھی طیش میں آ کر اس نے پوری قوت سے پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ اسوہ کو اس سے شاید ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی بے اختیار لڑکھڑائی تھی اور گرنے سے بچنے کو سکندر کو ہی پکڑنا چاہا تھا۔ نتیجے کے طور پر دونوں ہی عدم توازن ہو کر اوپر تلے گرے تھے۔ اسوہ چونکہ نیچے تھی جبھی اس کے سر کے پچھلے حصے میں گرنے کے باعث شدید چوٹ لگی تھی۔ بہتا ہوا خون اور اس کی ضبط کی کوشش میں بہتی آنکھیں اور سرخ چہرہ۔ سکندر کا غصہ تمام ہوا تو خجالت اور تاسف نے آن گھیرا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔

''بہت چوٹ لگی ہے نا تمہیں؟ مجھے دکھاؤ۔

وہ جیسے ہی اس کے نزدیک آیا۔ اسوہ نے اس کا ہاتھ بے حد سختی سے جھٹک دیا تھا۔

''میرے پاس آنے کی اور بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے آپ!''

تیزی سے بہتے آنسوؤں کو پونچھے بغیر وہ حلق کے بل غرائی تھی اور اٹھ کر پلنگ کے سرہانے پڑا اپنا دوپٹہ اٹھا کر متاثرہ جگہ کو اس کے کونے سے دبا دیا۔ اسکائی بلیو کاٹن کا دوپٹہ لمحوں میں خون سے رنگین ہو گیا۔ سکندر جو اس کی سمت متوجہ تھا تشویش میں مبتلا ہونے لگا۔

''ضد نہیں کرتے اسوہ خون کا اخراج تو روکنے دو مجھے''

وہ پائیوڈین اور کاٹن لے کر دوبارہ اس کے پاس آیا تو اسوہ کے بدکنے پر وہ کسی قدر بے بسی سے بولا تھا۔

''اگر آپ باز نہیں آئیں گے تو میں خود چلی جاؤں گی اٹھ کر، آئی تھنک آپ یہی چاہتے ہیں''

وہ سرد مہری سے بولی تو سکندر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''آئی ایم ساری اسوہ! مجھے غصہ نہیں کرنا چاہیئے تھا اس بات کے لیے بھی کہ میں نے تم سے شادی کر کے تمہیں یہاں پھنسا دیا۔ تم ٹھیک کہتی ہو یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو تمہارے اسٹنڈرڈ کے مطابق ہوتا'' کچھ دیر بعد کاٹن اور دوا اس کے پاس رکھ کر وہ دلگیری سے بولا تھا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ اسوہ ہونٹ بھینچے بیٹھی آنسو پونچھ رہی تھی۔

☆☆☆

نماز کی ادائیگی کے بعد وہ جائے نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ جب اس کے سیل فون کی میسج ٹون بجی تھی۔ اس نے جائے نماز رکھی اور پلٹ کر سیل فون اٹھا لیا۔ میسج غلام حسین کے نمبر سے تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ بے تابی سے میسج کھول کر پڑھنے لگی۔

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دلگیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر
تمہارے قدموں میں آ گرے تو یہ جان لینا
وہ استعارہ تھا میرے دل کا
اگر نہ آئے۔ مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے
کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو تو اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پر ہاتھ رکھنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا

اس نے اضطراب میں مبتلا ہو کر سیل فون واپس رکھ دیا۔ اور بے مقصد کمرے کے بیچوں بیچ ٹہلنے لگی۔

اسے گئے ہوئے کئی دن بیتے تھے۔ وہ ہر رات بیڈ پر لیٹ کر خالی جگہ کو گھورا کرتی جہاں کئی راتیں وہ موجود رہا تھا۔ اس کا تکیہ اس کی چادر ہر شے میں اس کی خوشبو بسی تھی۔ وہ تمام تر شدتوں کے ساتھ اس کی کمی محسوس کرتی تو حیران ہو کر خود سے سوال کیا کرتی کیا میں اس کو یاد کر رہی ہوں وہ حیران رہ جاتی۔ جواب مثبت تھا جس سے اسے غضب کا اختلاف ہوا کرتا جانے کیوں وہ خود سے بھی اظہار سے گریزاں تھی۔ اس وقت بھی اس نے اپنا دھیان بٹانے کو ہی اخبار اٹھا کر کھول لیا تھا۔ اپنی الجھنوں میں مبتلا ہو کر وہ اپنے پسندیدہ صحافی کے کالمز کو بھی فراموش کر گئی تھی۔ کتنا پسند تھا اسے محبِّ عبدالقدوس کا اندازِ تحریر وہ ہمیشہ کاٹ دار سچائی اور کرنٹ افیرز پر لکھتا تھا اس کے الفاظ سے وطن کی مٹی کی محبت اور عقیدت چھلکتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے محب عبدالقدوس کا نام ہی تلاشا تھا جس کے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس کالم میں اس نے فیوڈل سسٹم اور سیاست کو بیک وقت نشانہ بنایا تھا۔ اور آخیر میں گہرا طنز اور یاسیت کا احساس لیے وہ مختصر سی نظم جسے دیا نے بار بار پڑھا پھر با آوازِ بلند گنگنانے لگی۔

ساری طاقت آپ کے بس میں ہے
ساری ذہانت آپ کی ہے
ہم مجبور ہنستے سارے
پھر بھی ہمارے ساتھ ہیں
سب تاریخ کے دھارے
شب کے سب اسرار تمہارے
صبح کا نور ہمارا ہے
گم رستوں پر خوں کے چھینٹے راہ دکھاتے تارے ہیں

دیا نے اخبار لپیٹ کر سائیڈ پر رکھ دیا۔ اس کے لبوں کے گوشوں میں پر سوز مسکان تھی۔

(کتنے خاص ہوتے ہیں یہ دل جو خالصتاً وطن کی محبت میں دھڑکتے ہیں۔ کاش، اے کاش غلام حسین کا دل بھی اتنا ہی خاص ہوتا جس قدر محبِّ عبدالقدوس کا)

اس کے دل نے انوکھی خواہش کی تھی۔

☆☆☆

اے قلم ٹوٹ جا!
آج رشتہ حرف جسم و جان سے چھوٹ جا!
آج کو بہانہ نہیں چاہیے
بلبل باغ افکار خاموش ہے
آج شامِ غزل بھی سیاہ پوش ہے

اس نے ایک وحشت زدگی کے عالم میں ریموٹ کنٹرول سے چینل سرچنگ کی تھی۔

ہر چینل پر ایک ہی خبر تھی۔ اسامہ بن لادن کی شہادت کی خبر۔ پاک سرزمین کے ہی ایک حصے پر امریکی فوج کے آپریشن کے نتیجے میں اسامہ بن لادن کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اور وہ بھی پاکستانی گورنمنٹ کی ایما پر۔

اس نے بریکنگ نیوز سنی تھی اور اندر ہوتی اکھاڑ پچھاڑ کے ساتھ وہ پتھرایا ہوا سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ دکھ کی شدت ایسی تھی کہ تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ جب کچھ اور سمجھ نہیں آسکی تو وہ اٹھ کر ابنِ زید کی سمت دوڑا تھا۔ ابنِ زید اپنے کمرے میں مقید تھے اور ان کی حالت تو گویا سکندر سے بھی زیادہ خراب تھی اس خبر کے سننے کے بعد۔

آپ نے سنا ابنِ زید.........اسامہ بن لادن؟؟

وہ بات مکمل نہیں کر سکا اس کے آنسو پھر سے چھلک گئے تھے۔ اپنے بچپن سے اس نے جن چند شخصیات کو آئیڈیلائز کیا تھا اس میں اسامہ بن لادن کا بھی شمار ہوتا تھا۔

”دعا کرو سکندر بابا یہ خبر جھوٹ ہو۔ اس سے قبل بھی تو اس قسم کی افواہیں پھیلائی گئی ہیں“

ابنِ زید گو کہ خود خدشات میں مبتلا تھے اس کے باوجود اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تسلی دی تھی۔

”خدا کرے خدا کرے ایسا ہی ہو“

اس نے شدتِ جذب سے کہا تھا پھر وہیں بیٹھ کر ابنِ زید سے اسامہ کے اسی ہاٹ موضوع کو ڈسکس کرنے لگا تھا۔ ابنِ زید نے دراز کھول کر ایک میگزین نکال لیا۔ جس میں اسامہ کے حوالے سے ایک جامع رپورٹ کے ساتھ ان کی تصویریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ نوجوانی، جوانی اور ادھیڑ عمر کی تصویریں۔ سکندر نم آنکھوں سے بغور ایک ایک تصویر کو تکنے لگا۔

دبلا پتلا وجود۔ سیاہ داڑھی اور چہرے کے گرد نور کا ہالہ، روشن پیشانی، وہ مردِ مجاہد انسانی روپ میں گویا کوئی فرشتہ تھا۔

”لوگوں کو تو ان کے بارے میں صحیح آگاہی تک نہیں ہے ابنِ زید! خاص طور پر ینگسٹر

یہ سمجھتے ہیں کہ اسامہ دہشت گرد تھے۔ کسی چینل نے بھی ان کے لیے ''شہید'' کا لفظ استعمال نہیں کیا''

سکندر کے لہجے میں کرب کی آمیزش تھی۔ ابن زید کے چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔

''اس ملک میں جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اب اس کے قوانین بدل دیئے گئے ہیں۔ گستاخ رسول ﷺ کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ اور عاشقِ رسول ﷺ اگر گستاخی کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینک کر اس کے لیے سزائے موت تجویز ہوتی ہے۔ مرنے والا گستاخ شہید کہلاتا ہے۔ ہم اس المیے سے تو کب کے آگاہ ہو چکے ہیں سکندر بابا!''

''میں نے تمام نیوز چینل کی ویب سائیڈز بھی سرچ کی ہیں۔ مگر اس خبر کی سچائی کے متعلق مزید کوئی انفارمیشن نہیں ہے''

ابن زید نے بوجھل آواز میں اطلاع دی تھی۔

''پتا نہیں حقیقت کیا ہے ابنِ زید! مگر میرا دل نہیں مانتا۔ آپ خود سوچیں۔ اسامہ بن لادن امریکیوں کی طرح طاقت کے نشے میں بدحواس نہیں کہ ایبٹ آباد میں پناہ لیتے۔ شمالی وزیرستان میں امریکی اور نیٹو فورسز داخل نہیں ہوسکیں۔ افغانستان کے کئی علاقوں میں ان کا کوئی کنٹرول نہیں۔ پہاڑوں میں اپنا مسکن بنانے والا ایک گھر میں کیوں چھپتا؟''

ابن زید نے محض سر ہلایا اور سرد آہ بھری تھی۔ پھر بوجھل آواز میں بولے تھے۔

''پاکستان میں امریکی آپریشن کا معاہدہ مشرف نے کیا تھا۔ اسامہ بن لادن کی موجودگی کی صورت میں امریکہ کو پاکستانی سرزمین پر فوجی کارروائی کا حق دیا گیا کہ پاکستان کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گا لیکن دکھاوے کے لیے احتجاج کیا جائے گا۔ معاہدے کی تجدید 2008ء میں کی گئی تھی۔ یہ برطانوی اخبار گارجین کی رپورٹ ہے۔

وہ کتنی دیر اس قسم کی تکلیف دہ باتوں میں مصروف رہے تھے۔ سکندر وہاں سے اٹھا تو اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔

☆☆☆

وعدۂ حور پر بہلائے ہوئے لوگ ہیں ہم
خاک بولیں گے کہ دفنائے ہوئے لوگ ہیں ہم
یوں ہر اک زخم پر دم سادھے کھڑے ہیں
جیسے دیوار میں چنوائے ہوئے لوگ ہیں ہم

اس کی ہر بات پر لبیک بھلا کیوں نہ کہیں
زر کی جھنکار پر بلوائے ہوئے لوگ ہیں ہم
جس کا جی چاہے وہ انگلی پر نچوا لیتا ہے
جیسے بازار سے منگوائے ہوئے لوگ ہیں ہم
ہنسی آئے بھی تو ہنستے ہوئے ڈر لگتا ہے
زندگی! یوں تیرے زخمائے ہوئے لوگ ہیں ہم
آسماں اپنا، زمیں اپنی، نہ سانس اپنی تو پھر
جانے کس بات پر اترائے ہوئے لوگ ہیں ہم
جس طرح چاہے بنالے ہمیں وقت قتیل
درد کی آنچ پر پگھلائے ہوئے لوگ ہیں ہم

اس نے قتیل شفائی کی غزل کو پڑھا تھا پھر سرد آہ بھر کے کتاب بند کر دی اس کا دل ہنوز بوجھل تھا۔ اس نے قلم اٹھایا اور پھر واپس رکھ دیا امریکی لائر'' کلائیو اسمتھ'' کا بیان صرف پاکستانی حکمرانوں کے لیے ہی نہیں غیرت مند مسلمانوں کے لیے بھی باعث شرمندگی تھا۔ اس کے دماغ میں جیسے کلائیو اسمتھ کے الفاظ کھب کر رہ گئے تھے۔

''پاکستان نے جن افراد کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا۔ ان میں سے نوے فیصد بے گناہ تھے یعنی جعلی مجرم تھے''

''یکم اور دو مئی کی درمیانی شب امریکہ کے فوجی آپریشن کے نام پر جو جہاز پاکستان آئے ان میں اسامہ بن لادن کے خاندان کے افراد کو یہاں لایا گیا۔ امریکی انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ تاکہ پاکستان میں ان کی موجودگی کے واقعہ کی صداقت پر لوگوں کو یقین دلا سکے

اس نے محب عدالقدوس کی تصدیق شدہ خبر پڑھی اور زہر خند سے مسکرایا۔

اسامہ بن لادن کی شہادت ایک پراسرار کہانی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ پسِ پردہ حقائق کیا ہیں؟

دنیا کا سب سے مطلوب شخص ایبٹ آباد کیسے پہنچا؟

اور وہاں کیسے انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان سوالوں کے جواب ملنا اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ امریکہ سے روز بروز آنے والے نئے نئے بیانات نے ہر ذی شعور کو الجھا کر رکھ دیا ہے اور اس پراسرار کہانی سے پردہ تب ہی اٹھے گا شاید جب کوئی امریکی ایبٹ آباد آپریشن پر کتاب لکھے گا۔''

اگلے دن وہ پھر ابنِ زید کے روبرو بیٹھا اس موضوع پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھا۔

''اسامہ بن لادن کی ڈیڈ باڈی کو سمندر برد کر دینے والی خبر میں کس حد تک سچائی تھی وہ نہیں جانتے تھے مگر اس خبر نے اضطراب کی تیز لہریں پورے وجود میں دوڑا دی تھیں۔ امریکی اہلکاروں کے مطابق یو ایس ایس بحری جہاز کے عرشے پر اسامہ بن لادن کی میت کو غسل دیا گیا تھا اور کفن پہنا کر میت ایک تھیلے میں رکھ دی گئی اس کے بعد میت تختے پر رکھ کر سمندر برد کر دی گئی۔ اس کے ساتھ پتھر باندھ دیئے گئے۔''

آپ کو پتا ہے سعودیہ نے اسامہ کی باڈی لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

وہ سخت روہانسا ہو کر بولا تھا۔ ابن زید جواب میں خاموش لب بستہ بیٹھے رہے۔

''اگر اسامہ بن لادن کی لاش کو سمندر برد کرنے کی اطلاعات درست بھی ہیں تب بھی اسلامی نقطۂ نظر کے سراسر خلاف ہے۔ میت کو صرف اس صورت میں سمندر برد کیا جا سکتا ہے اگر اس کا خشکی تک پہنچانا ناممکن ہو۔''

''امریکہ جیسے غاصب اور ال منیرڈ ملک کے حکمرانوں سے اور کس شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ تم نے دیکھا ہے سکندر بابا جو ان باتوں پر احتجاج کر رہے ہو؟'' اسامہ کے متعلق اس قسم کی خبر کو ہاٹ کرنے کا مقصد کچھ اور ہے سکندر بابا! صدر اوبامہ نے امریکی عوام کی توجہ کسی اور مسئلے سے ہٹانا چاہی ہے گویا! پیو ریسرچ سنٹر اور اخبار دی واشنگٹن پوسٹ کی طرف سے کیے گئے ایک عوامی جائزے میں بتایا گیا ہے کہ 56 فیصد امریکیوں کا خیال ہے کہ اوبامہ اپنا کام بخوبی سرانجام دے رہا ہے۔ اس سے قبل کیے گئے ایک سروے میں اوبامہ کی پسندیدگی کی شرح 47 فیصد تھی۔ امریکی میڈیا کا کہنا ہے کہ اس کارنامے کے بعد اوباما الیکشن دوبارہ جیت سکتا ہے۔''

''ان سب باتوں سے قطع نظر اگر یہ دیکھا جائے کہ امریکی انٹیلی ایجنسیوں کی جانب سے خوف اور دہشت کا کراؤن پرنس قرار دیا جانے والا ''اسامہ بن لادن'' نے امریکہ کو صحیح معنوں میں ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ امریکی میڈیا کے مطابق ''اسامہ'' کے خلاف اس آپریشن میں کھربوں ڈالر خرچ ہوئے اس میں شک ہے بھی نہیں کہ ''اسامہ'' کی وجہ سے امریکہ کی معاشی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ اس دوران امریکہ کی بہت بڑی اور پرانی کمپنیوں کے ساتھ ساتھ لاکھوں امریکی بھی دیوالیہ ہو گئے۔ اور اس وقت اسامہ کی شہادت کی خبر اکیسویں صدی کی تیسری بڑی خبر بن چکی ہے۔''

بی جان جو اسی پل وہاں آئی تھیں پرسوز مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھیں۔ ابن زید گہرا سانس کھینچ کر رہ گئے۔ ان کے لبوں پر نظم کے الفاظ اتر آئے تھے۔

یہ ظلمت باطل دھوکہ ہے
یہ ہیبت کافر کچھ بھی نہیں
مٹی کے کھلونے ہیں سارے
یہ کفر کا لشکر کچھ بھی نہیں
اللہ سے ڈرنے والوں کو
باطل سے ڈرانا مشکل ہے
جب خوفِ خدا ہو دل میں
یہ قیصرو کسریٰ کچھ بھی نہیں
دستور بھی ہے، تنظیم بھی ہے
تہذیب بھی ہے، تعلیم بھی ہے
قرآن میں پنہاں سب کچھ ہے
قرآن سے باہر کچھ بھی نہیں
اسلام اگر منظور نہیں
قرآن اگر دستور نہیں
پھر افسوس ہے اس آزادی پر
یہ ملک وملت کچھ بھی نہیں

☆☆☆

جامِ وفا ہے سوچا نہیں کرتے
یہ رسم سکھائی ہے حسینؓ ابن علیؓ نے

اسامہ بن لادن 1957ء میں ''محمد بن لادن'' کے گھر ان دنوں پیدا ہوئے جب ان کے والد کا شمار سعودی عرب کے گنے چنے امیر لوگوں میں ہوتا تھا۔ 1970ء میں اسامہ کے والد بن لادن کا انتقال ایک ہوائی حادثے میں ہوا۔ جب وہ اپنے ذاتی طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ ''محمد بن لادن'' ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ موجودہ شاہی خاندان کے بانی ''شاہ عبدالعزیز'' سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ چھوٹے سرمائے سے تعمیرات کا آغاز کرنے والے ''محمد بن لادن'' اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچے کہ آج ''مکہ اور مدینہ منورہ'' کی ہر قابل ذکر عمارت ہی نہیں بلکہ سعودی عرب کی اسی فیصد سڑکیں ان کی تعمیراتی کمپنی نے بنائی

ہیں۔ اپنے تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے ''اسامہ'' نے دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے، اکنامکس اور بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم ان کی ملاقات مسلم دنیا کے نوجوانوں سے ہوتی رہی۔ اس دوران وہ مصر کے اس نوجوان گروپ سے متعارف ہوئے جو مسلم معاشرے کے قیام کا حامی اور اسلامی دنیا میں بڑھتے ہوئے مغربی اثر و رسوخ کا مخالف تھا۔ ان نوجوانوں نے اسامہ کو وہ انقلابی فکر عطا کی جس نے بعد میں انہیں مغربی معاشرے کے ایک دشمن کی حیثیت سے نمایاں کیا۔ دسمبر 1979ء میں جب اسامہ کی عمر بائیس سال تھی وہ روس کی افغانستان پر فوج کشی کے خلاف میدانِ عمل میں نکل آئے اور سعودی عرب سے افغانستان آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ انجینئرز کی ایک ٹیم لائے تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے لیے دفاعی اہمیت کی سڑکیں بنائیں۔ انہیں اسلحہ ذخیرہ کرنے کے لیے ڈمپ بنا کر دیئے۔ افغان جہاد کو ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اور دنیا کے کونے کونے سے مسلمان نوجوان افغان مسلمانوں کی مدد کے لیے آ رہے تھے۔

بعض انٹیلی جنس ایجنسیوں کا دعویٰ ہے کہ ان دنوں اسامہ بن لادن کا رابطہ سی آئی اے سے بھی ہوا تھا۔ جو ساری دنیا سے مسلمان نوجوان کو ترغیب دے کر افغانستان میں جہاد کے لیے بھیج رہی تھی۔ ان مسلم نوجوانوں کو ''سی آئی اے'' نے روس کے خلاف تربیت اور اسلحہ دے کر میدان میں اتارا تھا۔ دس سال بعد جب وہ بہترین تربیت یافتہ مجاہد بن کر روس سے فارغ ہوئے تو امریکہ کے خلاف سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ امریکہ آج بھی دہشت گردی کا شاکی ہے۔ اس کی بنیاد دراصل اسی نے رکھی تھی۔

سی آئی اے کے تربیت یافتہ مجاہدین کی خدمات استعماریت کے خلاف مسلم انتہا پسند گروپوں کو حاصل ہو گئیں۔ سی آئی نے اس عمل کو Back Blow کا نام دیا۔ پھر اسامہ ''سوڈان'' چلے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے ذاتی سرمائے سے غریب ملک ''سوڈان'' کی اکانومی بحال کرنے کے لیے خرطوم سے بورٹ سوز کی تک تقریباً آٹھ میل لمبی سڑک تعمیر کرائی اس طرح اس ملک کی اکانومی تباہی سے بچ گئی۔ مختلف زرعی فارم قائم کیے۔ جس کے نتیجے میں ''سوڈان'' خوراک میں خود کفیل ہو گیا اور چینی برآمد کرنے لگا۔ اس دوران ان کے نظریات کا پرچار ہونے لگا جس بنا پر سعودی حکومت نے ان کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا۔ ان کی فیملی نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سوڈان میں اسامہ کی سرگرمیاں جاری رہیں جس پر امریکہ نے سوڈان پر بے پناہ دباؤ ڈالا کہ وہ اسامہ کو ملک بدر کر دے جس کی بنا پر 1996ء میں اسامہ واپس

افغانستان آ گئے۔

انہوں نے اپنی دولت کو چھپا نہ رکھا۔ آج بھی سوڈان سے مغربی ممالک کو غذائی ضروریات کے لیے برآمد ہونے والے ایک نیچرل گم میں 53 فیصد حصص کے مالک اسامہ تھے۔ دنیا بھر میں ان کا بزنس فرنٹ کمپنیوں کے رابطے سے ہو رہا تھا۔ وہ براہِ راست کسی بزنس میں ملوث دکھائی نہ دیتے تھے۔ اپنے خاندان کے وسیع تعمیراتی کام میں شریک ہو کر انہوں نے 250 ملین ڈالر کمائے۔ مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا گمان ہے کہ اسامہ بن لادن نے اپنی دولت کے بل بوتے پر ایک نہ دکھائی دینے والا مضبوط نیٹ ورک امریکہ کے خلاف قائم کر رکھا ہے۔ ''لانگ آئس لینڈ یونیورسٹی'' کے ماہر دہشت گردی کے متعلق ہی رائے دی تھی۔ جب اسے واشنگٹن طلب کیا گیا تو اس نے کہا بن لادن کے گروپ میں مختلف رنگوں، نسلوں کے دنیا کے مختلف ممالک کے باشندے شامل ہیں جو پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ ان کو ڈھونڈنا یا شناخت کرنا بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ ستر اور اسی کے عشروں کے درمیان جنم لینے والی دہشت گرد تنظیموں کے برعکس یہ لوگ نہ تو کسی مخصوص ملک سے تعلق رکھتے ہیں نہ ہی انہوں نے کسی مخصوص مقام پر اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی مخصوص ملک ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔ دنیائے اسلام میں جہاں کہیں جہاد ہو بن لادن وہاں موجود ہوتے تھے۔

افغانستان کے غاروں اور ہر مشکل محاذ پر بن لادن خود موجود تھے۔ الجزائر میں انتخاب جیتنے والی اسلامی جماعتوں پر افواج چڑھ دوڑی تو امریکہ نے باور کرایا کہ جمہوریت کا تحفظ کرنے والی الجزائری فوج کے مقابلے پر درحقیقت اسامہ ہی ہیں۔ فوج کو الیکشن میں ہاری ہوئی جنگ بندوق کے ذریعے جیتنے نہیں دیتے۔

بوسنیا میں وہ خود نہیں گئے لیکن امریکہ نے بے شمار مجاہدوں کی طرف سے انگلیاں اٹھا اٹھا کر دنیا کو بتایا کہ یہ سب بن لادن کے بھیجے ہوئے مجاہد ہیں۔ مجاہدوں اور انہوں نے سالہا سال تک سابقہ کمیونسٹ یورپ اور جمہوری یورپی امداد کے باوجود سربوں کے جیتنے نہیں دیا۔ اب انہیں مجبوراً بوسنیا کو آزاد ملک ماننا پڑ رہا ہے۔ عراق وہ کبھی نہیں گئے لیکن امریکی ذرائع ابلاغ دن رات چیخ رہے تھے کہ عراق کا بچہ بچہ مجرم ہے۔ کیونکہ بن لادن ان مجرم بچوں کی بھوک اور بیماری کا مسئلہ دنیا کے سامنے لا رہے تھے۔ کروستان بھی وہ نہیں گئے لیکن امریکہ نے دنیا کو بتایا کہ یہ بن لادن ہی تھے جو غیرت مند کردوں کو تین ملکوں میں تقسیم کر کے انہیں ختم کرنے کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔

امریکہ کے اقتصادی محاصرے سے سوڈان کی معیشت تباہ ہونے لگی تو اسامہ وہاں

دوبارہ آ گئے۔ اسامہ بن لادن کا کہنا ہے مسلمان ممالک میں انتشار پیدا کر کے مغربی ممالک خصوصاً امریکہ اپنے مفادات حاصل کرتا ہے تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسرائیل کے قیام کے لیے مغربی قوتوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت پیدا کروا کے عالمِ اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور پھر انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رکھا۔ ان باہمی اختلاف کی وجہ سے عرب دنیا سالانہ تقریباً چالیس بلین ڈالر کا اسلحہ خریدتی ہے جس کا 58 فیصد حصہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ سے خریدا جاتا ہے یہ سارے ہتھیار وہ ہوتے ہیں جو اسرائیل کے خلاف موثر نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کا توڑ اسرائیل کو پہلے ہی دے دیا جاتا ہے۔

عراق، ایران جنگ میں عربوں کو بے پناہ اسلحہ بیچا گیا اور جب روس کی شکست کے بعد نیٹو کو اسلحے کی ضرورت نہ رہی تو عراق سے کویت پر حملہ کروا کے امریکہ نے وہ سارا اسلحہ عرب سرزمین پر پھونک دیا اور اس کا بل عراق سے وصول کر لیا۔ ساتھ ہی اپنے پرانے منصوبے کے مطابق کویت اور سعودی عرب کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کر کے اپنی فوج متعین کر دی۔

''اسامہ'' کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ امریکہ عرب ممالک خصوصاً حرمین شریفین کی ارضِ مقدس سے نکل جائے۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کی فوجیں عربوں کے ہی خرچ پر ان کے ملکوں میں دندناتی پھریں۔ یہ مطالبہ امریکہ کی نظر میں سب سے بڑی دہشت گردی تھا۔ جو اس نے دھیرے دھیرے مسلم حکمرانوں کے منہ سے بھی کہلوا لیا۔ لیکن غیور مسلمان امریکہ کے اس فکر و نظر سے متفق نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی نظر میں ''اسامہ بن لادن'' کا یہ مطالبہ دہشت گردی نہیں ''اسلام دوستی اور امت مسلمہ'' سے عشق تھا۔ اس جدوجہد کے دوران ''اسامہ بن لادن'' نے 1996ء میں دہران (سعودی عرب) میں امریکی ایئر فورس کے ٹھکانے پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں انتیس امریکی فوجی لقمۂ اجل بنے۔ یہ اقدام کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد امریکیوں نے اعلان کئے بغیر سعودی عرب میں اپنے تمام فوجی کیمپ اور دفاتر شہروں کے قریب سے دور لے جا کر صحرائی علاقوں میں قائم کر لئے تا کہ عام سعودی شہریوں کی نگاہ سے دور رہیں۔ اس سے سعودی شہریوں میں اسامہ بن لادن کی مقبولیت کا پتا چلتا ہے۔ انہوں نے اپنی ارضِ وطن سے ناجائز طور پر مسلط غیر ملکی فوجوں کے انخلاء کے مطالبے کو اپنے ہم وطنوں کی نظر میں اتنا مقبول کر دیا کہ اب کوشش کی جاتی ہے کہ غیر ملکی فوجی سعودی شہروں کے بازاروں میں چلتے پھرتے نظر نہ آئیں۔ وہ عالمِ اسلام کو ہر طرح کے استعمار سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ وہ رسول اکرم ﷺ کے حکم کو بیان کرتے کہ مقدس مقامات سے کافروں کو نکال دیا جائے۔

امریکہ کی صومالیہ یا سوڈان میں مداخلت انہیں پسند نہ تھی۔ وہ اسے مسلمانوں کے خلاف جارحیت خیال کرتے تھے۔ دراصل امریکہ اسلامی قوتوں کو ہی اپنا اصل دشمن اور مدمقابل سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اسلامی قوتیں مضبوط ہونے لگتی ہیں تو امریکہ کو ہی سب سے پہلے تشویش ہونے لگتی ہے اور ان قوتوں کو کسی نہ کسی طریقے سے زیر کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اور ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔

فلسطین، کشمیر، بوسنیا، افریقہ اور دیگر مقامات پر جہاں کہیں مسلمان مصیبت یا مسائل کا شکار ہیں اس کی بنیادی وجہ امریکہ ہے۔ جو مسلمانوں کی راہ کا بڑا اور بھاری پتھر ہونے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ جب امریکہ انسانی حقوق کی بات کرتا ہے تو اسے مقبوضہ کشمیر میں پچھلے ساٹھ سالوں سے انسانی حقوق کی پامالی دکھائی نہیں دیتی۔ اسرائیل کی ناجائز پیدائش کا مقصد بھی یہی تھا کہ فلسطینیوں کو ان کا علیحدہ اور آزاد ملک نہ مل سکے۔

''اسامہ بن لادن'' نے 1997ء میں پیٹر آرینٹ کو دیئے گئے انٹرویو میں لبنان میں ''یو این او'' کے قائم کردہ ریفیوجی کیمپ پر اسرائیل کے حملے کا سوال اٹھایا جس میں سینکڑوں عورتوں اور بچوں کے کٹے ہوئے اعضاء سارے علاقے میں بارش کی طرح برسے۔ بن لادن مشرقِ وسطیٰ میں مغرب کی مداخلت کو اسلام کے خلاف خطرہ قرار دیتے تھے۔ 1990ء میں عراق نے کویت پر قبضہ کر لیا تو بن لادن نے سعودی عرب کے ''وزیر دفاع شہزادہ سلطان'' کو پیش کش کی تھی کہ وہ عراقیوں کو کویت سے نکال سکتے ہیں بشرطیکہ امریکہ سے کوئی مدد نہ لی جائے یہ سن کر سعودی شہزادہ نے جب ''اسامہ بن لادن'' سے پوچھا کہ وہ عراقی ٹینکوں، ایئر کرافٹ، کیمیکل بموں اور خطرناک ہتھیاروں کا جواب کیسے دے پائیں گے تو اس مردِ مجاہد نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا ''ہم اپنی قوتِ ایمانی سے انہیں شکست دیں گے'' لیکن سعودی حکومت نے ان کی یہ پیشکش قبول نہ کی اور وہ احتجاجاً سوڈان منتقل ہو گئے۔

خوست کی پہاڑیوں میں بسیرا کرنے والے اسامہ بن لادن افغانستان میں اپنی تین بیویوں چودہ بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔ ان کے ساتھ بیالیس دوسرے عرب خاندان بھی تیس گھروں پر مشتمل ایک کالونی میں رہتے تھے۔ اسامہ پہلے امریکہ کی نظروں میں ایک ہیرو تھے۔ لیکن سعودی عرب میں امریکیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے امریکہ کے نزدیک انسانیت کے قاتل قرار پائے۔

پہاڑی سلسلوں میں موجود غار جو بن لادن کی رہائش تھی ایک کمپیوٹر، ایک فیکس مشین

اور ٹیلی فون، اسامہ بن لادن کی کل کائنات تھی۔ ان سب کا مواصلاتی رابطہ سیٹلائٹ ٹیلی فون کے ذریعے دنیا کے کونے کونے سے بندھا تھا۔ ان تین مشینوں کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر امریکہ کی حکومت سے جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے جہاد کے لیے پرانے طریقے نہیں آزمائے بلکہ جدید ٹیکنالوجی اپنا رکھی تھی۔

سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے اس ''سعودی شہزادے'' کی زندگی نے ایک عجیب کروٹ بدلی کبھی ان کے دسترخوان پر دنیا بھر کی نعمتیں سجی ہوئی تھیں لیکن ان کے ساتھی اور وہ ڈبل روٹی اور چائے پر گزارہ کرتے۔ ملاقات کرنے والے ایک صحافی نے بتایا ہے کہ ''بن لادن'' اور ان کے چار ساتھیوں کو ڈنر کرتے دیکھا ان پانچ آدمیوں کا ڈنر تھا چار ابلے ہوئے انڈے جنہیں انہوں نے آپس میں تقسیم کیا اور اپنا ڈنر مکمل کیا دو مئی کی صبح دنیا حیران رہ گئی جب اوبامہ نے اچانک اعلان کیا کہ اسامہ کو ختم کر دیا گیا۔

امریکہ کا کہنا تھا کہ اسامہ ایبٹ آباد کے ایک گھر میں مقیم تھے۔ امریکی کمانڈوز نے وہاں چالیس منٹ کارروائی کی اور انہیں ختم کر دیا نہ صرف یہ بلکہ ان کی لاش کو بھی امریکہ نے بارہ گھنٹے کے اندر سمندر برد کر دیا۔ اسامہ کی پاکستان میں موجودگی ان کی پراسرار شہادت ابھی تک شکوک وشبہات میں لپٹی ہوئی ہے ایک سروے کے مطابق نوے فیصد پاکستانی اس پر یقین نہیں رکھتے اور ان کا کہنا ہے کہ امریکہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں ان کی زندگی کی طرح ان کی شہادت بھی ایک پراسرار معمہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا بھر میں مطلوب ایک اہم ترین شخص ایبٹ آباد کے گنجان آباد علاقے میں پانچ سال سے مقیم رہے اور امریکہ کی ایجنسیوں کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اسامہ نے امریکہ سے ٹکر لی تھی اور ایک سپر پاور کے مقابل تھے کیا وہ اتنے بھی سادہ اور سیدھے تھے کہ ایبٹ آباد کے ایک ایسے مکان میں چھپتے جو ہر ایک کی نظر میں آجاتا؟

اس علاقے میں ایسی شاندار حویلی ایسی ہی ہے اور چھت پر ڈش انٹینا بھی لگا ہوا ہے۔ آپریشن جس انداز سے ہوا اس کی تفصیلات انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جس شخص کی عمر گزر گئی اسلحہ سے کھیلتے ہوئے وہ ایسے مارا جائے جیسے پنجاب پولیس کسی بے گناہ کو پولیس مقابلے میں مار دیتی ہے۔ کوئی مزاحمت نہیں؟ امریکی کمانڈوز ہیلی کاپٹر سے اتر رہے تھے تو اسی وقت اس خطرناک دہشت گرد (بقول امریکہ) کو مقابلے کے لیے تیار ہو جانا چاہئے تھا۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ نہتے تھے تو پھر انہیں زندہ گرفتار کیوں نہ کیا؟ ان سے امریکہ ''القاعدہ'' کے نیٹ ورک کی تفتیش ہی نہیں

کر سکتا تھا بلکہ پوری دنیا کے سامنے انہیں زندہ گرفتار کرنے کی صورت اپنی فتح کا جشن منا سکتا تھا کہ کسی کی بے بسی اور کمزوری سے لطف اٹھانا امریکہ سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ مار بھی دیا تھا تو ان کی لاش کو دریا برد کرنے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ اگر واقعی اسامہ شہید کر دیئے گئے ہوتے تو ''القاعدہ'' کے باقی لوگوں کی ہمت پست کرنے کے لیے امریکہ کئی دن ان کی لاش کی نمائش کرتا۔ سمندر برد ایک ہفتہ بعد بھی کیا جا سکتا تھا۔

ایک نہیں متعدد اطلاعات ہیں کہ اسامہ بہت پہلے شہید ہو گئے تھے۔ ویسے بھی ماضی میں جب ''صدام حسین'' کو پھانسی دی گئی تو عین عید کے دن اسے پھانسی دی گئی اور اس کی پھانسی کا منظر ساری دنیا میں دکھایا گیا۔ جبکہ وہ ایک قوم کا صدر تھا۔ اس وقت امریکہ نے مسلمانوں اور عراقیوں کے جذبات کا خیال نہیں کیا تھا۔ صدام کے بیٹوں کو ہلاک کیا گیا تو ان کی تدفین بھی پندرہ دن بعد کی گئی۔ خود امریکی صحافی اس بات پر شکوک کا شکار ہیں۔ ''پال کریگ رابرٹس'' امریکی وزیر خزانہ اور وال اسٹریٹ جرنل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون ''اسامہ بن لادن کی مفید موت'' کے نام سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ اسامہ بن لادن نائن الیون کے حملوں کا ماسٹر مائینڈ تھا یہ بات ابھی تک ثابت نہیں ہو سکی لیکن اس کی موت کے سلسلے میں یہ اہم بات ہے کہ جس شخص کا سراغ برسوں پہلے لگا لیا گیا تھا اس تک پہنچنے میں اتنی دیر کیوں لگائی گئی؟ گارجین اور دیگر برطانوی اور یورپی اخبارات نے لکھا ہے کہ ''اسامہ بن لادن'' کی لاش کا فوٹو جعلی ہے۔ اسامہ کی لاش سمندر برد کر دی گئی ہے یہ ایک اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔ جس طرح عراق میں وسیع پیمانوں پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی بات جھوٹ تھی۔ ایران کے ایٹمی ہتھیاروں کی بات بھی غلط نکلی۔ ہزاروں ماہرین کے مطابق نائن الیون بھی حقیقت میں کچھ اور ہے۔

''پال کریگ رابرٹس'' کا کہنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ امریکی حکومت کو بجٹ خسارے پر قابو پانے اور افغانستان میں جنگ ختم کرانے کا ایک بہانہ درکار تھا اس لیے ''اسامہ بن لادن'' کی موت کا ڈرامہ رچایا گیا۔ امریکیوں کو ان کی فوج کی ایک اور بڑی کامیابی کا یقین دلایا گیا۔ جنرل (ر) مرزا اسلم بیگ کا کہنا ہے۔ نائن الیون کا ڈرامہ اس لیے کیا گیا تا کہ مسلم ممالک کے خلاف ''صلیبی جنگ'' کا آغاز کیا جا سکے۔ اب دو مئی کو اسامہ بن لادن کی شہادت بھی ڈرامہ اور جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسامہ کے ہم شکل ایک قیدی کو بگرام کے ایئر بیس سے ایبٹ آباد لایا گیا اور یہاں پر مقیم اس کے اہل خانہ کے سامنے اسے نہایت سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''اسامہ'' کو کچھ عرصے قبل ہی افغانستان میں شہید کر دیا گیا ہو اور ان کی میت مردہ خانے میں

پڑی ہو۔ان کی گولیوں سے چھلنی جو تصویر دکھائی گئی وہ دو سال پہلے کی ہے۔اینٹی وار میں امریکی صحافی ''ایرک مارک گولسی'' نے لکھا ہے۔''نائن الیون'' اور اس سے تعلق کی ساری کہانی ابھی تک دھندلی اور غیر واضح ہے۔ایک تہائی امریکی شہری نائن الیون کے متعلق اپنی حکومت کے موقف کو تسلیم نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ میں امریکی حکومت یا اسرائیل ملوث تھا۔

اب ''اسامہ بن لادن'' کی شہادت کے بعد شاید ہم حقیقت کبھی نہ جان سکیں کہ دنیا سے جانے والے بولا نہیں کرتے ''بن لادن'' ہمیشہ کہتے تھے کہ ''نائن الیون'' میں ان کا کوئی کردار نہیں تھا۔''اسامہ'' جا چکے ہیں مگر ''اسامہ ازم'' زندہ ہے اسامہ کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ مسلمان ملکوں میں مغرب کا غلبہ ختم کیا جائے تا کہ مغربی ممالک مسلمان ملکوں کے ''قدرتی وسائل'' سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔امریکی صحافی نے لکھا ہے۔اسامہ نے بار بار کہا تھا کہ مسلمان ملکوں سے امریکہ کو نکالنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ امریکہ کو چھوٹی چھوٹی مگر زیادہ اخراجات والی جنگوں میں الجھا دیا جائے جس سے امریکی معیشت تباہ ہو جائے گی۔امریکہ اسامہ کے جال میں پھنس گیا اور دیوالیہ پن کے قریب ہونے کے باوجود امریکہ آج افغانستان، عراق، صومالیہ، یمن اور صحرائے اعظم کے ملکوں میں سالانہ کھربوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔فوج پر اٹھنے والے بے انتہا اخراجات اور قرضوں کی بھرمار نے امریکہ کو ''اپاہج'' بنا دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آسمانوں پر اسامہ بن لادن کی روح یقیناً مسکرا رہی ہوگی۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ مسلسل کام میں مصروف تھا۔مگر جب رپورٹ مکمل ہوئی تو اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ آسودگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔اسامہ بن لادن کو تھوڑا سا خراج عقیدت پیش کر کے وہ خود کو بے حد سرشار محسوس کر رہا تھا۔اس وقت بنیادی مقصد آگاہی تھی۔اور اس نے اپنا فرض پورا کرنے کی ایک معمولی سی سعی کی تھی۔

اگلے دن کے سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ''محبِ عبدالقدوس'' کے اسامہ بن لادن کے حوالے سے مضمون کی بدولت جب سنڈے میگزین کا شام تک تیسری مرتبہ پرنٹ نکالنا پڑا تو عبدالرحیم کو احساس ہوا تھا۔پاکستانی قوم میں ابھی اتنی بھی غفلت اور گمراہی نہیں بڑھی تھی۔مسلسل ہمت اور کوشش سے تو پتھروں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔یہ تو پھر اتنا مشکل کام نہیں تھا۔وہ ایک نئے جوش ایک نئے ولولے کے ساتھ مصروفِ عمل ہوا تھا۔

☆☆☆

میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
لیکن اس داد و غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
جلسہ گاہ میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
راہگزاروں پر ہلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیاہ فام زمیں
تیرہ و نار مکاں مفلس و بیمار مکیں
نوح و انسان میں سرمایہ محبت کا نقاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قدموں کے فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم
نت نئی طرز پر ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پر جوانی کے سماں
اور دہکان کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں
یہ فلک بوس ملیسیں دلکش و سمیں بازار
دور ساحل پر وہ شفاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے ہوئے گلزار
درو دیوار پر انوار کا سیلاب رواں
جیسے اک شاعیر مدہوش کے خوابوں کا جہاں
یہ سبھی کیوں ہے؟
کیا ہے؟
مجھے سوچنے دے
اپنی مایوس محبت کا فسانہ نہ سنا

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔اس نے نظم پڑھی تھی اور کتاب کو بے دلی سے بند کر دیا۔

امریکہ یہ جنگ جیت نہیں سکتا۔ ہر عالمی قوت آخر کو مرجاتی ہے۔ مگر ہم ہار رہے ہیں۔ اپنے تعصبات اور جہل کے طفیل۔ راستہ صرف ایک ہے ''رحمت العالمین ﷺ'' کا اور اہل علم ہی ان کے وارث ہیں۔ ''مرتبت ﷺ'' نے ہر حال میں خیر خواہی کا حکم دیا اور ارشاد یہ فرمایا تھا کہ ''دانا وہ ہے کہ جو اپنے زمانے کے پیچ و خم سے آشنا ہو۔'' ظاہر ہے اس کے علوم اور تقاضوں سے۔ زندگی کے دو سب سے اہم شعبے سیاست اور مذہب کو اہمیت دی جانی چاہیے مگر ہم نے انہیں غاصبوں یا حریص شعبدہ بازوں کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی ہم نجات کی امید پالتے ہیں۔ امید اچھی اور دعا بھی اچھی۔ مگر جو غور و فکر کا حکم تھا۔ اور جو جدوجہد کا فرمان تھا۔

اس نے گہرا سانس بھر کے کچھ لمحوں کا توقف کیا پھر ڈھیلے انداز میں قلم کو کاغذ پر گھسیٹنا شروع کیا تھا ''وزیر اعظم یوسف رضا'' نے اسامہ کے سانحہ عظیم کو امریکہ کی عظیم فتح قرار دیا ہے جس کے نصیب میں جو تھا وہ اسے مل گیا کسی کو شہادت کا عظیم درجہ اور کسی کو قاتلوں اور سامراجیوں کی خوشامد، اردو سے گاندھی بہت چڑتے تھے۔ کہتے تھے یہ قرآن پاک کے لفظوں سے لکھی گئی ہے اور آج ہم انہی کی زبان بڑے فخر سے بولتے ہیں تو...... شرم ہم کو مگر نہیں آتی

نو سال قبل گودھرا اور گجرات میں 59 یاتری ٹرین میں آگ لگنے سے زندہ جل مرے اور اگلے دن مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ریاست کی خصوصی عدالت نے 31 افراد کو موت کی سزا سنائی جبکہ دیگر 65 بے گناہوں کو نو سال تک قید رکھنے کے بعد رہا کیا گیا۔ مودی نے خود گودھرا کا واقعہ کرایا کیونکہ وہ گجرات میں مسلمانوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ ہم کب تک تاریخ کو فراموش کیے انہی کے پھیلائے جال میں پھنستے رہیں گے؟ وہ لکھتے ہوئے تھک گیا بلکہ اکتا گیا تو قلم رکھ دیا۔ لائٹ ایک بار پھر چلی گئی تھی شمع کا پھڑ پھڑاتا شعلہ دیواروں پر اس کا سایہ بے ہنگم انداز میں لیے ڈولتا تھا وہ کچھ دیر اپنے سائے کو بے مقصد گھورتا رہا پھر شمع بجھا کر اٹھا تھا اور بے دلی سے بستر پر لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا تھا صبح وہ نماز کو نہیں اٹھ سکا۔ اسے حیرت ہوئی اسے کسی نے جگایا نہیں تھا۔ کھلی کھڑکی سے گرم ہوا کے جھونکے اور سورج کی کرنیں بڑے دھڑلے سے پہلے کمرے میں پھر اس کے بستر تک آ گئی تھیں۔ کھڑکی سے پار روشن دن طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہ دیوار پر آویزاں اسامہ بن لادن اور قائداعظم کے پورٹریٹ پر ٹھہریں تو جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھیں نم ہوتی چلی گئی تھیں۔

اس نے ''امام حسینؓ'' کے بعد ''ٹیپو سلطان'' قائداعظم اور پھر اسامہ بن لادن سے مرحلہ وار عشق کے پینڈے نپٹائے تھے۔ کل اس نے جب ''محبِ عبدالقدوس'' کا ''اسامہ بن

لادن'' پر مضمون پڑھا تو پہلی مرتبہ اس کے دل میں محبت کے ساتھ ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور وہ اس خواہش کی بے تابی کے ہمراہ ''ابنِ زید'' کے پاس چلا آیا تھا۔

''آپ محبِ عبدالقدوس سے واقف ہیں نا؟''

''ہاں محبِ وطن اور سچا جرنلسٹ ہے''

ابنِ زید کا لہجہ و انداز متوازن تھا۔ سکندر نے سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔

''میرا مطلب آپ اس سے کبھی ملے ہیں؟''

''خیریت کیا ہوا ہے سکندر بابا!''

اسے لگا تھا ابنِ زید نے اس کا بے حد اہم سوال گول کر کے اسے اپنے سوال میں الجھا دیا ہے۔

''مجھے ''محبِ عبدالقدوس'' کو دیکھنا ہے''

اس کے لہجے میں اشتیاق کے ساتھ ضدی بچوں کا سا دھڑلہ تھا۔ ابنِ زید مسکرا دیے۔

''میں نے سنا ہے وہ کسی سے نہیں ملتا۔ وہ گمنام رہنا چاہتا ہے۔ آج تک اس کا کبھی کوئی انٹرویو شائع نہیں ہوا۔ اس کے اتنے فینز ہیں مگر کسی کو اس کی عمر، اس کی شکل کا اندازہ نہیں کہ وہ کیسا ہے''

''وہ ایسا کیوں کر رہا ہے ابن زید؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

سکندر جھنجھلا گیا تھا جبکہ ابنِ زید بردباری سے مسکرائے تھے۔

''ہر کسی کا اپنا لائف اسٹائل ہوتا ہے۔ مجھے تو اندر کی ایک بات بھی پتا چلی ہے کہ ''محبِ عبدالقدوس'' کا اصل نام بھی یہ نہیں ہے۔ وہ فرضی نام سے لکھتا ہے''

یہ انکشاف سکندر کو ششدر کر گیا تھا۔

''شاید وہ ضرورت سے زیادہ محتاط اس لیے ہے کہ ابھی وہ بہت عرصہ تک اپنا کام کرنا چاہتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو سر ٹھیک سے اٹھانے بھی نہیں دیا جاتا اور ختم کر دیا جاتا ہے''

سکندر کی حیرت کو دیکھتے ہوئے ابنِ زید نے سمجھایا تھا۔ وہ لوگ ابھی چائے پی رہے تھے جب ملازمہ نے ابنِ زید کو آ کر اس کے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی تھی اور سکندر نے دیکھا تھا ابنِ زید ایک دم سب کچھ بھول بھال کر اس کے استقبال کو چلے گئے تھے۔ سکندر نے انہیں زندگی میں اس سے قبل اتنا خوش اور سرشار کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند لمحوں بعد جس دراز قد اور بے حد خوبرو لڑکے کے ہمراہ واپس کمرے میں آئے سکندر نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی تب بھی اسے وہ چہرہ کچھ شناسا سا محسوس ہوا تھا۔

''ان سے ملو سکندر بابا یہ میرے محسن کے بیٹے ''غلام حسین'' ہیں۔ مشہور و معروف پاپ سنگر شاہ حسین!'' ''تم جانتے تو ہو گے انہیں؟''

اور سکندر نے بغیر کسی ایکسائٹمنٹ کے عام سے انداز میں اس سے مصافحہ کیا تھا۔ اسے شوبز کی سیلیبرٹی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

''آپ دیا بیٹی کو کیوں نہیں ساتھ لے کر آئے ہیں غلام حسین! وعدہ کیا تھا نا آپ نے مجھ سے؟''

اور جواباً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''کم آن چاچو! میں تو ادھر کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ لے کر تھوڑا گھومتا ہوں۔ ویسے بھی بہو کی رونمائی تو آپ کو خود وہاں آ کر کرنی پڑے گی''

''ہاں بیٹے آؤں گا کیوں نہیں''

''مجھے تو لگتا تھا جب تک آپ آئیں گے محترمہ میرے دو تین بچوں کی اماں تو لازماً بن چکی ہو گی۔ یہ رونمائی پھر بچوں کو دیجئے گا''

وہ بات بات پر ہنستا تھا۔ اس کی ہنسی میں زندگی کے وہ سارے رنگ ملتے تھے جو بے فکرے، لاپرواہ اور غافل لوگوں کی ہنسی میں مل سکتے ہیں۔ سکندر سپاٹ نظروں سے تکتا بے زار سا بیٹھا رہا۔

''غلام حسین سکندر بابا صحافی ہیں۔ انہیں آپ بہت پسند ہیں۔ آپ کی کارکردگی ہے بھی تو قابل ستائش!''

غلام حسین سے جو بات ابنِ زید نے کہی تھی وہ سکندر کو ڈنگ بن کر لگی۔ اس نے جز بز ہو کر مگر کچھ بے رخی سے ابنِ زید کو شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔ ابنِ زید سے اسے ایسی چاپلوسی کی ہرگز امید نہیں تھی۔ جبھی اس کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

''آپ یقیناً میرے نیشنل سانگ سنتے ہوں گے۔ ہے نا؟''

غلام حسین اس کی سمت دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرایا تو سکندر کا اچاٹ دل کچھ اور بے زاری سمیٹ لایا تھا۔

''نہیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ایسے کاموں میں صرف کر سکوں۔ او کے ابنِ زید میں چلتا ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوتی ہے''

وہ ہرگز بھی اتنا بد اخلاق اور غیر شائستہ نہیں تھا جتنا اس وقت ہو گیا تھا۔ پلٹ کر دیکھے بنا

وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔

''اماں پوچھ رہی ہیں آج اٹھنا نہیں ہے آپ نے؟''

وہ اسامہ بن لادن کی تصویر پر نگاہ جمائے سوچوں میں دور تک نکل گیا تھا۔ اسوہ کی آواز سن کر چونکا اور جواب میں کچھ کہے بغیر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سرہانے رکھی شرٹ اٹھا کر پہننے لگا۔ الماری سے تولیہ نکال کر نہانے گھس گیا۔ باہر نکلا تو لائٹ ایک بار پھر بند ہو چکی تھی۔ اس نے ہیئر برش اٹھا کر بال سنوارے اور پلٹ کر باہر آ گیا۔ کچن سے کھٹ پھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اماں کو چائے کا کہا تھا اور خود برآمدے کے روشن دان میں چڑیوں کے گھونسلوں میں موجود چڑیا کے بچے کو چہکارتے دیکھنے لگا۔ زندگی ایک دم کتنی بے مقصد سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے اس خالی پن کے احساس سے وحشت ہونے لگی۔

''اماں! اماں!''

اماں کی بجائے کچن سے اسوہ کو ناشتے کی ٹرے سمیت برآمد ہوتا دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔ جبھی زور سے چیخا!

''اماں گھر پر نہیں ہیں''

اسوہ نے اس کے تنے ہوئے چہرے کو ایک نگاہ دیکھ کر ٹرے اس کے سامنے دھری چھوٹی میز پر رکھ کر رسان سے کہا۔

''زارا تم کہاں ہو، بات سنو باہر آ کے میری''

وہ پھر اسے نظر انداز کئے اندر کی سمت منہ کر کے بولا۔

''زارا بھی نہیں ہے۔ اماں اسے ہی سلائی سینٹر چھوڑنے گئی ہیں۔ جو بھی کام ہے مجھ سے کہیں''

اسوہ کو بھی غصہ آیا تھا جبھی چڑ کر بولی تھی۔

''تم سے مجھے کوئی کام نہیں ہے اب''

وہ بھڑک کر بولا اور اٹھ کر تن فن کرتا پھر کمرے میں گھس گیا۔ اسوہ ساکن کھڑی رہ گئی تھی۔

''کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے نا؟ آج آفس بھی نہیں گئے''

وہ اس کے پیچھے اندر آئی تھی۔ سکندر بائیک کی چابی ڈھونڈ رہا تھا ایک پل کو اس کے ہاتھ اسی زاویئے پر ٹھہرے پھر نظر انداز کئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ چابی اسے بستر کے گدے کے نیچے سے ملی تھی اٹھا کر وہ مڑا تو اسوہ کو ہنوز سوالیہ نشان بنا دیکھ کر جھنجلایا۔

''اب کیا ہے؟''

''کچھ پوچھا ہے آپ سے'' وہ خفا نظر آئی۔

''ضروری نہیں ہے کہ تمہیں ہر بات کا جواب دوں''

وہ زہر خند سے پھنکارا تو اسوہ کو تپ چڑھ گئی تھی۔

''یہ کیا بکواس ہے سکندر! آپ اس طرح بات نہیں کر سکتے مجھ سے''

''تم مجھے یہ بتاؤ میں نے کب تمہاری منت کی تھی کہ لازمی مجھ سے شادی کرلو۔ ورنہ میں زندہ نہیں رہوں گا، مر جاؤں گا، وغیرہ وغیرہ''

سوال گندم جواب چنا! اسوہ بھنا کر رہ گئی تھی۔

''میرا اپنا دماغ خراب ہو گیا تھا''

''کیوں ہوا تھا۔ میری زندگی خراب کرنے کا کس نے حق دیا تھا تمہیں؟''

وہ بھڑک اٹھا جبکہ اسوہ شاکڈ رہ گئی تھی۔

''واٹ! آپ کی زندگی خراب ہو چکی ہے مجھ سے شادی کر کے؟''

''نہیں تم نے تو مجھے اتنا نہال کیا ہے کہ میں ہواؤں کے رتھ پر سوار جنت کی سیر کر رہا ہوں''

وہ چٹخا تھا اور جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ اسوہ ہونٹ بھینچے کھڑی رہی تھی۔

☆☆☆

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور تیرے صحن میں گویا
پتہ پتہ میرے افسردہ لہو میں ڈھل کر
حسن ماہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانے تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصت قافلہ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی شمعوں میں نظر آیا کہیں

ایک پل آخری خوں میں تیری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نے نہ ٹھہرنا چاہا

اس نے سنڈے میگزین کو سائیڈ پر رکھا اور جلی آنکھوں کو موند لیا۔ ''محب عبدالقدوس'' کی محنت لاجواب تھی یہ محنت عبدالقدوس کا ہی کمال ہو سکتا تھا۔ اتنے جامع اور مفصل انداز میں ریسرچ کا نچوڑ دنیا کے سامنے رکھنا۔ یہ حقیقت تھی کہ اسامہ بن لادن کو اس قدر پسند کرنے کے باوجود وہ ان کے پس منظر سے اس حد تک آگاہ نہیں تھی اور ان کے متعلق جو ابہام تھے وہ بھی دور ہو گئے تھے بلاشبہ یہ ایک عظیم مجاہد کو شاندار خراجِ تحسین تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمارے حکمرانوں کا رویہ قابلِ ندامت ہی نہیں۔ بے حد مذمت کے لائق بھی تھا۔ ظلم کا کہیں کوئی خاتمہ ہی نہ تھا۔ ہم نے انگریز کے عہد میں ظلم سہے آزادی کی آس میں۔ آزادی ملی تو چند ہی برسوں میں لگا ہم آزاد نہیں ہوئے بس ہمارے حکمران تبدیل ہو گئے وہ انگریز ہی کی طرح ہمیں نوچ کھسوٹ کر کھاتے رہے۔ ان ہی کی طرح بندوق کے زور پر حکومت کرتے جو آواز اٹھانے والوں کو قید کر دیتے جو سختیاں سہتے سہتے مر جاتے جو کوئی ایک آدھ زندہ بچ کر نکل جاتا وہ چپ چاپ وطن چھوڑ کر پردیس میں جا بستا۔ ہمارے ہاں چور کبھی نہیں شرماتا۔ وہ سر اٹھا کر بڑی بے غیرتی سے اپنی قابلیت کی ڈینگیں مارتا ہے۔ سر چھپاتا پھرتا ہے تو وہ جس پر ظلم ہوا تھا۔

مشرف جب آیا تھا تو کچھ جاننے والوں نے کہہ دیا تھا اسے پاکستان کی تقسیم کا ایجنڈا دے کر بھیجا گیا ہے اور اس نے ثابت کر دیا کہ کہنے والے صحیح کہتے تھے۔ بلوچستان میں مقامی اور غیر مقامی اور کراچی میں پٹھان و مہاجر خانہ جنگی کی بنیاد اسی نے رکھی۔ کارگل سازش کے بعد مشیروں نے نواز شریف کو رائے دی تھی کہ وہ اس سازش کے چاروں مجرموں مشرف، عزیز، جاوید حسن اور محمود کو برطرف کر دیں لیکن نواز شریف نے یہ تجویز نہیں مانی۔ یہ تجویز مان لی ہوتی تو پاکستان پر یہ سیاہ ترین دور وارد نہ ہوتا جو ابھی تک چل رہا ہے اور جس نے پاکستان کو پتھروں اور غاروں کے دور میں دھکیل دیا ہے۔

ہمارے ملک میں بار بار انقلاب آتے ہیں۔ کتنی ہی دفعہ عوام نے تنگ آ کر حکومتوں کو پٹخ دیا پھر ہم نئی دنیا کی آس میں جینے لگتے ہیں۔ ہم بہت خوش فہم ہیں۔ ہر دفعہ ایک نئی آس لگا لیتے ہیں لیکن اس تبدیلی سے آج تک بدلا کچھ نہیں۔ وہی چور اچکے دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا چور آ جاتا ہے۔ قاتلوں کو پناہ دی جاتی ہے۔ شریف لوگوں سے جیلیں بھر گئیں۔ جن کی

حفاظت کی ذمہ داری حکومت اور قانون کی تھی ان کو ''دہشت گرد'' گردان دیا گیا۔

ابنِ زید جو اسے خاموشی اور سکون سے سن رہے تھے رسانیت سے مسکرائے اور آہستگی ونرمی سے گویا ہوئے تھے۔''تمہاری عمر کا تقاضا بھی ہے یہ شعلہ بیانی تم پر جچتی بھی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سکندر کی رفاقت کا اثر اتنی جلدی رنگ دکھائے گا۔ ڈیٹس گریٹ تم کب کوئی کالم یا فیچر لکھ رہی ہو؟''

اور اسوہ اتنا جھینپی تھی کہ ڈھنگ سے انہیں گھور بھی نہ سکی وہ آج صبح ہی یہاں آئی تھی اور تب سے گویا ابنِ زید کے ہی سر پر سوار تھی۔ سکندر کے ساتھ تو جھگڑا چل رہا تھا جبکہ اسے دل کا بوجھ بہر حال ہلکا کرنا تھا۔ اور ابنِ زید بہترین سامع تھے۔

''ہر جگہ کرپشن ہو یہ ضروری تو نہیں، ہر جگہ محافظ ہی لٹیرا ہو یہ بھی ضروری نہیں۔ ضروری تو یہ بھی نہیں کہ ہر انقلاب ضائع ہو جائے۔ ہم قوم یہود نہیں کہ ''اللہ تعالیٰ'' نے ہمیں دھتکاری ہوئی قوم قرار دیا ہو۔ وہ ہماری طرف متوجہ ہوگا۔ تبدیلی بھی آئے گی''

اس کی بے دلی اور مایوسی کو انہوں نے خوش امیدی کی آس میں بدلنا چاہا۔

''قوم تو متحد ہے نا کہیں بھی نہیں لڑ رہی سوائے کراچی کے اور کراچی کے میدان جنگ میں مصروف تینوں ارباب حکمران پارٹیوں کے لوگ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم''

''تم مجھے یہ بتاؤ سکندر کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے تمہاری؟ خوش ہو؟''

ابنِ زید نے موضوع تبدیل کر دیا۔ اسوہ کی پلکیں بے اختیار جھک گئیں۔ اس پل اسے ابنِ زید کا سامنا دشوار محسوس ہوا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

اس نے الٹا ان سے سوال کر دیا تھا۔ اور وہ جیسے سوچ میں پڑ گئے تھے۔ میں آپ سے آج ''اسامہ بن لادن'' کے بارے میں ڈسکس کرنے آئی تھی میں ان کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں ابنِ زید!''

اس نے دانستہ بات کا رخ موڑ دیا۔ ابنِ زید نے چونک کر اسے دیکھا۔

''محبِ عبدالقدوس کی رپورٹ پڑھ لینے کے باوجود''

''وہ محبِ عبدالقدوس کے الفاظ تھے مجھے آپ کے الفاظ میں ان کو جاننا ہے۔ یوں سمجھ

لیں میں آج انہیں کی باتیں کرنا چاہتی ہوں''

اس فرمائش پر ابنِ زید نے گہرا سانس بھرا تھا۔

اپنی بک کے لیے ان کی شخصیت پر میں نے بھی ریسرچ کی ہے۔ کروڑوں لوگوں کے لیے بیک وقت ہیرو اور ولن کی حیثیت رکھنے والے ''اسامہ بن لادن'' کی زندگی کا بیشتر حصہ دیومالائی اور پراسرار کردار معلوم ہوتا ہے۔ اسامہ بن لادن امریکہ کے بہترین دوست اور بدترین وادلین دشمن رہے۔ ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلو ہمیشہ حیرانی کا باعث رہے۔ انہوں نے شہزادوں جیسی زندگی بھی گزاری اور افغانستان کے غاروں میں بھی مقیم رہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ ''اسامہ بن لادن'' نئی چیزوں کو جانتے اور سیکھنے کے ہمیشہ شائق رہے۔

جس طرح ان کی زندگی ایڈونچر اور مہم جوئی سے بھرپور رہی ان کی موت بھی ایک معمے کی حیثیت اختیار کر گئی اور جانے کب تک معمہ ہی رہے گی۔

''اسامہ بن لادن'' دس مارچ 1957ء کو ''سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض'' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا تعلق ''یمن'' اور والدہ کا ''شام'' سے تھا۔ ان کے خاندان کے سعودی شاہی خاندان سے قریبی تعلقات تھے۔ اسامہ اپنے پچاس بہن بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھے۔ اسامہ کے والد عوا بن لادن 1930ء میں ''یمن'' سے ''سعودی عرب'' آئے۔ اسامہ کے والد نے ''جدہ'' میں ایک قلی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا اور اختتام پر وہ سعودی عرب کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی کے مالک تھے۔

تیرہ برس کی عمر میں اسامہ کی والدہ کا انتقال ہوا اور سترہ برس کی عمر میں اسامہ کی شادی ایک ''شامی لڑکی'' سے ہوئی جو ان کی رشتہ دار تھی۔ وہ ایک مذہبی پابندی کرنے والے لڑکے کے طور پر بڑے ہوئے۔ اسامہ نے اپنی پرائمری اور سیکنڈری تعلیم جدہ میں حاصل کی۔ ریاض کی ''کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی سے'' انہوں نے ''سول انجینئرنگ'' کی ڈگری حاصل کی۔ اسامہ نے اپنی ابتدائی زندگی شہزادوں کی طرح گزاری۔ ان کی بیویوں کی تعداد پانچ اور بچوں کی تیس بتائی جاتی ہے۔ اسامہ لمبے قد کے دبلے پتلے اور پھرتیلے آدمی تھے۔

ان کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا۔ گندمی رنگت کے حامل لیفٹ ہینڈ تھے۔

ابتدائی عمر سے ہی ان کا رجحان ''مذہب'' کی جانب تھا۔ ''حج'' کے دنوں میں وہ اپنے والد کے ساتھ سینکڑوں مسلمانوں کی مہمان نوازی کیا کرتے تھے۔ جن میں کچھ علماء اور اسلامی تحاریک کے سربراہ بھی شامل ہوتے۔ اسلامی تعلیمات میں ان کے دو اساتذہ نمایاں رہے۔ ''عبداللہ بن

عظام'' جن کا بعد میں ''افغانستان'' میں بڑا نام بنا اور ''محمد قطب'' جو مشہور اسلامی مصنف اور فلاسفر تھے۔ ان کے والد تین ستمبر 1967ء کو سعودی عرب میں ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کے والد نے درجن سے زائد شادیاں کیں اور ان کے پچاس سے زائد بچے تھے۔ والد کی وفات کے بعد اسامہ اور ان کے بھائیوں کو تقریباً پچیس کروڑ ڈالر کے اثاثے ملے۔

اسامہ کے سب سے بڑے سوتیلے بھائی، ''سلیم بن لادن'' بھی 1988ء میں امریکی ریاست ''ٹیکساس'' میں فضائی حادثے کا شکار ہوئے۔ اسامہ زمانہ طالب علمی میں ''اخوان المسلمون'' کے ساتھ منسلک رہے 1978ء میں سودیت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تو انہوں نے مجاہدین کی مالی مدد شروع کی۔ 1982ء میں اسامہ نے افغانستان جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھ بڑی تعداد میں تعمیراتی مشینری بھی لے کر گئے۔ جو انہوں نے مجاہدین کے حوالے کر دی۔ بعد ازاں انہوں نے زیادہ سے زیادہ وقت افغانستان میں گزارنا شروع کر دیا وقتاً فوقتاً وہ جنگ میں بھی حصہ لیتے رہے اور ساری دنیا سے مجاہدین کو افغانستان لانے کی ذمہ داری بھی انہی کے کندھوں پر تھی۔ 1989ء تک اسامہ نے سو سے زیادہ جھڑپوں اور بڑی جنگوں اور چھوٹے آپریشن میں حصہ لیا۔ وہ سال میں آٹھ ماہ سے زیادہ وقت افغانستان میں گزارتے تھے۔ ان کی موجودگی نے دوسرے سعودی لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جو اس وقت بہت کم تعداد میں تھے۔

1984ء میں انہوں نے افغانستان میں اپنی موجودگی کو مضبوط کیا۔ پشاور میں ''بیت النصر'' کے نام سے ایک مہمان خانہ قائم کیا۔ اس گھر کو عرب مجاہدین کا پہلا مرکز کہا جاتا ہے۔ جہاں وہ افغانستان کے محاذ پر جانے سے پہلے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس تمام عرصے میں اسامہ کی اپنی کوئی کمانڈ نہ تھی نہ ہی کوئی تربیت گاہ وہ نئے آنے والے کو افغانستان محاذ پر بھیجا کرتے تھے۔

1986ء میں اسامہ نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان میں اپنے کیمپ قائم کریں اور دو سال کے اندر انہوں نے چھ سے زیادہ کیمپ بنا لئے۔ اسامہ نے اپنے محاذ قائم کرنے، اپنی جنگ لڑنے اور خود کمان کا فیصلہ کیا۔ عرب لڑنے والوں میں ان کے پاس سابقہ فوجی تھے جن کا تعلق شام اور مصر کی افواج سے تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے علاوہ ان کا سودیت یونین کی افواج سے پہلا براہ راست ٹکراؤ پکتیہ کے صوبے کی جنگ میں ہوا جو کہ ''خوست'' سے 200 کلو میٹر دور تھا۔ ان کو 1988ء میں احساس ہوا کہ وہ تنظیمی اعتبار سے کمزور ہیں۔ اسامہ نے فیصلہ کیا کہ اس سارے کام کو باقاعدہ طور پر منظم کیا جائے۔ انہوں نے تمام آنے والوں کے بارے میں تحریری ریکارڈ رکھنا شروع کیا کہ آیا وہ مجاہدین تھے، رضا کار تھے یا صرف دورہ کرنے والے تھے۔ ان کی

تحریک کو باقاعدہ ضابطہ تحریر میں لایا گیا جو کہ گیسٹ ہاؤس سے کیمپ تک تھی اس سارے کام کو ''القاعدہ'' کا نام دیا گیا۔ ''القاعدہ'' ایک عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''بنیاد''

1989ء میں افغانستان سے روسی فوجیوں کے انخلاء کے بعد وہ عام دورے پر سعودی عرب گئے۔ جہاں ان کے سفر کرنے پر پابندی لگا دی گئی اور نظر بند کر دیا گیا۔ کویت پر عراقی حملے کے بعد تحفظ کے نام پر امریکی سعودی عرب میں آ گئے تھے۔ امریکی فوج کی سعودی عرب میں موجودگی پر اسامہ اور شاہی خاندان میں اختلاف ہو گئے تھے۔ 1991ء میں اسامہ نے سعودی شہریت چھوڑ دی اور 1992ء میں وہ سوڈان چلے گئے۔ اسامہ نے سعودی عرب میں امریکی فوج کی موجودگی کے خلاف نہ صرف عرب نوجوانوں میں تحریک پیدا کی بلکہ دنیا بھر میں موجود دیگر تحریکوں سے بھی رابطے کیے۔ اسی دوران اسامہ نے دنیا بھر میں موجود امریکی مقامات پر حملوں کا فتویٰ بھی جاری کیا۔ 1996ء میں اسامہ دوبارہ افغانستان پہنچے اور طالبان کے امیر ''ملا عمر'' نے انہیں سیاسی پناہ دی۔ ''اسامہ'' نے ایک بار پھر ''تورا بورا'' میں جہادی کیمپ قائم کیے۔ 1997ء میں امریکی ''صدر بل کلنٹن'' نے ''اسامہ'' کی حوالگی کے لیے طالبان پر دباؤ ڈالا مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

1998ء میں امریکہ نے ''اسامہ'' کو مارنے کے لیے افغانستان اور سوڈان میں کروز میزائل سے حملے کئے۔ اسامہ پر نیروبی دھماکوں سے لے کر ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون پر حملوں کے الزامات لگائے گئے۔ 2001ء میں نائن الیون کے بعد ''اسامہ'' امریکہ کو سب سے زیادہ مطلوب شخص کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ''اسامہ'' کو پناہ دینے کے جرم میں امریکہ نے افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف جنگ شروع کی تو اسامہ ''القاعدہ قیادت'' کے ساتھ روپوش ہو گئے۔ گزشتہ دس برس سے امریکی فوج انہیں تلاش کر رہی تھی۔ اور وہ امریکہ کو انتہائی مطلوب دس افراد کی فہرست میں پہلے نمبر پر تھے ان کے سر کی قیمت پانچ کروڑ ڈالر مقرر کی گئی تھی۔ ان دس برسوں میں کئی دفعہ ان کے مارے جانے کی اطلاعات بھی آتی رہیں اور ان کے حوالے سے متضاد خبریں گردش کرتی رہیں۔ ان کی شدید بیماری میں مبتلا ہونے کی رپورٹس شائع ہوئیں اور کہا گیا کہ اسامہ بن لادن کے گردے ختم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ''عسکری آپریشن'' کی قیادت اپنے نائب ''ایمن الظواہری'' کو سونپ دی ہے 2 مئی 2011ء کو ایبٹ آباد میں ایک اور ڈرامہ ان کی ہلاکت کے حوالے سے رچایا گیا ہے مگر اس کے باوجود امریکن ''اسامہ'' کے کردار کو لافانی ہونے سے بچا نہیں سکے۔

''آپ کا کیا خیال ہے ابن زید ''اسامہ بن لادن'' اس آپریشن میں شہید نہیں کیے گئے؟

ابن زید کے خاموش ہوتے ہی اسوہ نے ایک اہم نقطہ اٹھایا تھا۔

''حقیقت کا حال تو ''عالم الغیوب'' کو ہی ہے مگر ایک ایسا شخص جس کی ساری عمر اسلحہ سے کھیلتے گزری ہو وہ اتنا سیدھا تھا کہ ایبٹ آباد کے ایک گنجان آباد علاقے میں سکون کی نیند سوتا مارا جاتا؟''

آپ نے ایبٹ آباد آپریشن کے حوالے سے سرچنگ نہیں کی؟ ملکہ کوہسار کا دلفریب خطہ ایبٹ آباد اپنے فطری حسن کا شاہکار پر فضا مقام ہے لیکن جس طرح 2 مئی کو ''پاکستان ملٹری اکیڈمی'' سے ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر ''اسامہ'' کی تلاش میں یہ آپریشن ہر پاکستانی کے لیے سوال چھوڑ گیا ہے کہ اس اہم اور حساس علاقے میں اگر ملک کی داخلی خودمختاری کا تحفظ یقینی نہیں تو امریکی سپیشل فورسز کی دسترس سے پاکستان کے باقی حصوں کا محفوظ رکھا جانا کیسے ممکن ہے؟

اس سوال پر ابن زید نے سرد آہ بھری تھی اور خاموشی کے ایک تکلیف دہ مرحلے میں داخل ہو گئے۔

''بلال ٹاؤن میں جس فصیل بند عمارت پر امریکی ہیلی کاپٹروں نے حملہ کر کے وہاں کئی افراد کو ہلاک کیا اس کے بارے میں امریکی حکام کا کہنا ہے کہ ''اسامہ بن لادن'' اور اس کے اہل خانہ گزشتہ کئی برسوں سے اسے رہائش گاہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

آپریشن کی رات اس عمارت کے آس پاس کا علاقہ اگرچہ چاروں طرف سے سیل کر دیا گیا تھا اس کے باوجود ''بلال ٹاؤن'' کے مقامی لوگوں نے دھماکوں کی آواز اور بچوں کی چیخ و پکار کو خود اپنے کانوں سے سنا۔

چھتوں پر موجود لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ کارروائی دیکھی اور اس بارے میں ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ پر تفصیلات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ واقعہ کے روز ابتدائی معلومات سے ہی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ملکی سکیورٹی کے ذمہ داروں نے اس آپریشن میں حصہ ہی نہ لیا۔ نہ ہی کسی قسم کی مداخلت دیکھنے میں آئی۔ تاہم ایک بات ابتدائی مرحلے میں ہی سامنے آ گئی کہ کمپاؤنڈ سے جوابی کارروائی میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر کو بھی نشانہ بنایا گیا اور اس دوران فائرنگ کی آوازیں سنائی دی گئیں جس کے نتیجے میں یہ ہیلی کاپٹر کریش ہوا۔

اسامہ کی موجودگی کے عرصے اور پاکستان میں آمد کے بارے میں ابھی بھی یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی لیکن امریکن حکام محض اپنے اندھے انتقام میں یہ بات ثابت کرنے کی

کوشش کر رہے ہیں کہ وہ گزشتہ کئی برس سے یہاں مقیم تھے۔ اسامہ بن لادن نے 21 جنوری 2011ء کو آخری پیغام جاری کیا جس میں فرانسیسی یرغمالیوں کی رہائی کے لیے اس کی فوج کو افغانستان سے نکل جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ مزید یہ جس شخص کے سر کے لیے ڈھائی کروڑ ڈالر رکھے تھے وہ ''ابوعبداللہ، اسامہ بن لادن'' بالآخر پاکستان کے دارالحکومت سے 60 کلومیٹر دور ایبٹ آباد ہی میں کیوں امریکیوں کے ہدف کا نشانہ بنا۔ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں پر دستک تو دیتا رہے گا کہ اس مخصوص وقت کا انتخاب کرنا کہیں امریکی انتخابات میں کسی سیاسی مہم کا حصہ تو نہیں؟''

امریکہ میں جہاں اس سرجیکل آپریشن کے لیے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ رائے عامہ کے آزاد ارکان بھی ''سی آئی اے'' کے سربراہ ''لیون پینٹا'' اور اس آپریشن کے انچارج ''وائس ایڈمرل، ولیم میکن ریون'' پر کڑی نکتہ چینی کر رہے ہیں کہ آخر ایسی کیا مجبوری تھی کہ ''اسامہ بن لادن'' کے خلاف عدالت انصاف کی کارروائی عمل میں لائے بغیر اسے آپریشن کے دوران ہی ہلاک کر دیا گیا۔ یہ نکتہ چینی صرف امریکہ میں ہی نہیں ہو رہی۔ دنیا کا ہر مہذب فرد کا طاقت کے اندھا دھند استعمال پر یہ سوال ہے کہ کسی ملک کی سلامتی اور وقار کو روند کر آخر کب تک امریکہ اسی قسم کی مہم جوئی کو مہذب دنیا پر مسلط کیے رکھے گا۔ کیا امریکی صدر ایک کے بعد دوسری کارروائی اس طرح اپنے مانیٹرنگ روم میں بیٹھ کر ملاحظہ کرتا رہے گا یا دنیا میں حقیقی امن و سلامتی کے لیے دوسری اقوام کی قیادت سے مل جل کر بھی کوئی سفارتی تقاضے پورے کیے جائیں گے۔

''آپ یہ بات جاننے میں کامیاب ہو سکے ہیں ابن زید کہ ''اسامہ بن لادن'' واقعی شہید ہو گئے ہیں؟''

اسوہ کو جس بات کی بے چینی تھی اس نے وہ سوال اٹھایا تھا۔ ابنِ زید کے چہرے پر اضطراب کی ایک اور لہر اٹھی تھی انہوں نے گلا کھنکارا تھا پھر آہستگی سے بولے تھے۔

''نائن الیون'' کے واقعہ کے بعد یوں تو اسامہ بن لادن کے بہت سے ویڈیو منظر عام پر آئے جس میں اسامہ اپنے کارناموں پر سے پردہ اٹھاتے اور آنے والے دنوں کی کارروائیوں کے بارے میں ذکر کرتے دکھائی دیئے لیکن ان کی شہادت کے بعد جو ان کی ویڈیوز جاری کی گئیں وہ متنازعہ ہی رہیں۔ اسامہ کی شہادت کی خبر سے لے کر جاری کی جانے والی تصاویر کو مختلف پہلوؤں سے بار بار منظر عام پر لایا گیا۔ جس میں کہیں تو وہ اسامہ جیسا ہی لگا اور کہیں امریکیوں کی چلاکیوں کا پردہ فاش ہوا کہ کسی اور شخص کی تصویر پر اسامہ کی تصویر اس انداز میں چسپاں کی گئی کہ اسامہ کا ہی گماں پیدا ہو جائے اب صورتحال یہ ہے کہ جس کمپاؤنڈ میں اسامہ بن لادن کو شہید

کرنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے وہاں سے ملنے والی ویڈیوز سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ایک تو تمام ویڈیوز ایڈیٹ شدہ تھیں جس کی وجہ سے مکمل کارروائی کا کچھ پتا ہی نہ چل سکا پھر امریکی قیاس پر کس طرح یقین کرلیا جائے کہ واقعی اسامہ بن لادن کو ہی وہاں امریکی فوجیوں نے شہید کر دیا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ہے کہ 2007ء میں اسامہ کی جو ویڈیو منظر عام پر لائی گئی تھیں۔اس میں اسامہ ادھیڑ عمر دکھائی دیئے پھر اچانک اپنی شہادت کے وقت وہ جوان کیسے ہو گئے۔ان کی داڑھی کے سفید بال کالے کیسے ہو گئے؟''

یعنی طے یہ پایا یہ امریکن کی محض ایک مکارانہ کارروائی تھی جو اپنے ناقص العقلی کے باعث انہوں نے خود ہی دنیا پر آشکار بھی کر دی۔

اسوہ نے مسکراہٹ دبائی۔ابن زید نے کاندھے اچکا دیئے۔

لگتا تو یہی ہے۔واللہ اعلم!

☆☆☆

نصف صدی آ کے ہے گزری
میرا گھر اور میری بستی
ظلم کی اندھی آگ میں جل جل
راکھ میں ڈھلتی جاتی ہے
میرے لوگ اور میرے بچے
خوابوں اور سرابوں کے جال میں الجھے
کٹتے مرتے جاتے ہیں
چاروں طرف ہے لہو کی دلدل
گلی گلی تعزیر کے پہرے
کوچہ کوچہ مقتل ہے
اور یہ دنیا
عالمگیر تقدیس کی پہرے دار یہ دنیا
ہم کو جلتے، کٹتے، مرتے
دیکھتی ہے اور چپ رہتی ہے
زور آور کے ظلم کا سایہ

پل پل لمبا ہوتا ہے
وادی کی ہر شام کا چہرا
خون میں لتھڑا ہوتا ہے
لیکن جو خونِ شہیداں کی شمعیں ہیں
جب تک ان کی لو سلامت
جب تک ان کی آگ فروزاں
وادی کی آخری صد پر بھی
دل کو دلاسہ ہوتا ہے
ہر اک کالی رات کے پیچھے
ایک سویرا ہوتا ہے

روشنی نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔کشمیر کی سرسبز وادی پر شام تیزی سے پر پھیلاتی جارہی تھی اسے ابنِ زید کا انتظار تھا۔ابن زید جو اس کا سوتیلا چھوٹا بھائی تھا اور کشمیر جیسے علاقے میں رہتے ہوئے جہاد کی بجائے شعر و شاعری کا دلدادہ تھا۔اس کی ماں ہمیشہ کتنا کڑھتی تھی اس کی اس چونچالی اور لاپرواہ فطرت پر۔حالانکہ اس نے ابنِ زید کی تربیت خالص جذبۂ جہاد کے انداز میں کی تھی اسے مجاہدین سے عشق تھا۔وہ مجاہدین کے لیے اسلحہ اور کھانے پینے کے لیے اناج کا ذخیرہ کرتی اور خفیہ طور پر مجاہدین تک پہنچایا کرتی تھی۔ بھارتی فوج کو ایک دوبار شک بھی ہوا تھا جس کے نتیجے میں اسے کڑی سزا بھی دی گئی تھی مگر وہ اپنے اطوار سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹی تھی۔روشنی کو ماں سے عقیدت تھی تو اس کے جذبے سے عشق مگر یہ ابنِ زید پتا نہیں کیوں اتنا لاپرواہ تھا اس کی ماں اکثر اس بات پر ہولا کرتی تو روشنی کو انہیں تسلی دینا پڑتی۔

''ابھی وہ بہت کم عمر ہے ماں جی! اس خطے، اس سرزمین کی سرشت میں جہاد کا جذبہ شامل ہے اسے بالآخر اس سمت آنا ہے''

''شاید اس وقت کو دیکھنے کو میں زندہ نہ رہوں۔روشنی میں مجاہد کی ماں بننا چاہتی ہوں اپنے بیٹے کے لیے شہادت کی دعا کرتی ہوں''

وہ اکثر اپنے مخصوص فقرے دہراتے بے اختیار ہوتی تو آنسو بہہ پڑتے۔معاً بارش کی تیز بوچھاڑ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ٹین کی چھت پر گرنے والی بوندوں سے فضا جلترنگ ہوگئی تھی۔باہر اندھیرا سا چھا رہا تھا۔سرد ہوا کے تھپیڑے اسے چھو کر کمرے میں داخل ہونے لگے۔

آسمان کے کنارے سرخ انگارہ ہو رہے تھے۔اداسی کی دبیز کہر میں لپٹی سرمئی شام گہری ہو رہی تھی جنت نظیر وادی کی سرسبز پہاڑی چوٹیوں پر اندھیرا پر پھیلا چکا تھا۔فضا میں کچھ دیر پہلے آزاد پنچھیوں کا شور وغل تھا مگر اب تمام آوازیں اور چہکاریں دیو قامت درختوں کی اوٹ میں دم توڑ چکی تھی۔

"روشنی! ابنِ زید نہیں آیا ابھی تک؟"

اس کی ماں کی آواز لکڑی کے در و دیوار سے ٹکرا کر پلٹی۔روشنی نے چونک کر گردن موڑی۔کچھ بادلوں اور کچھ گہری ہوتی شام نے کمرے میں تاریکی کو بڑھا دیا تھا اسے کچھ ٹھیک سے نظر نہیں آیا تو اٹھ کر بلب روشن کر دیا تھا۔بلب کی زرد روشنی اس کی بستر پر لیٹی نحیف ماں کے چہرے کو واضح کرنے لگی جو بار بار کھانستی تھی۔

"آپ کے لیے پانی لاؤں؟ دوائیں لی نا آپ نے؟"

وہ ان کے نزدیک آ کر ان کا لحاف ٹھیک کرتے ہوئے فکر مند نظر آ رہی تھی۔

"ابن زید نہیں آیا؟"

ماں نے سب سوال نظر انداز کر کے اس سے اپنی بات دہرائی تھی۔اس سے قبل کہ وہ جواب دیتی بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا پھر ابن زید کے قدموں کی مخصوص چاپ ابھری تھی اگلے چند لمحوں میں وہ برساتی اتارتا سر سے پانی جھاڑتا ہوا اندر آ گیا۔

"آپا مجھے چائے بنا کے دو، پھر میں تمہیں اپنی نئی نظم سناتا ہوں جو آج میں نے چنار کے درختوں کے پاس بیٹھ کر لکھی ہے۔اور پتا ہے وہاں مجھے ایک بے حد حسین لڑکی نے چنار کا پتہ بھی دیا ہے تم جانتی ہو نا چنار کا پتہ دینے کا مطلب ہے ہم نے تمہیں اپنی محبت دے دی"

آخری انکشاف اس نے ماں کی موجودگی کے باعث سرگوشی میں کیا تھا۔وہ بے حد خوش نظر آتا تھا اس کے گھنگریالے اخروٹی رنگ کے بالوں کے لچھے اس کے سرخ و سفید چہرے پر کتنے بھلے دکھتے تھے۔روشنی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔تم کچن میں چلو میں وہیں آ رہی ہوں"

پھر جب وہ چولہے کے پاس آ کر بیٹھی ابنِ زید نے بے تابی سے اسی وقت اسے اپنی نظم سنانا شروع کر دی تھی۔

سورج سرمئی پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا
اور چناروں میں آگ لگی تھی
اور زعفران کے کھیتوں میں وہ خود بھی

زعفران کا ایک پھول لگ رہی تھی
یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے
زعفران کے پھولوں سے جنم لیا ہو
اس کے رخساروں کو گلابوں نے دھویا ہو
ڈوبتے سورج کا سارا سونا
اس کے وجود سے لپٹ رہا تھا
وہ اس حسین وادی کی بیٹی تھی
وہ سونے سے بنی تھی
میں نے اسے ہر روز زعفران کے کھیتوں میں دیکھا تھا
اور ہر روز اپنے دل میں پہلے سے زیادہ محسوس کیا
اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا
تو اس نے مجھے چنار کا پتہ دیا
مجھے لگتا ہے وہ ساری زندگی کے لیے میرے دل میں اتر گئی ہے۔

اس نے اپنی نظم ختم کی تھی تو روشنی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ابنِ زید نے پہلے حیرانی پھر خفگی سے اسے دیکھا۔

"آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں؟"

"یہ نظم ہے یا آپ بیتی؟"

جو خود پر بیتے اسے ہی تو شاعری کا نام دیا جاتا ہے آپ نے وہ مشہور و معروف شعر نہیں سنا

لاکھ پردوں میں رہوں بھید میرے کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

"تمہیں پتا ہے تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"ہاں سترہ سال" ابنِ زید نے گردن اکڑائی تھی۔

"اور سترہ سال کی عمر میں لڑکے بچے ہوتے ہیں۔تم محبت کر کے شاعر بھی بن بیٹھے"

"سترہ سال کا لڑکا ہرگز بچہ نہیں ہوتا۔یونو "اسامہ بن لادن" اور "قائداعظم" کی تقریباً اسی ایج میں شادی ہوئی تھی۔اور وہ دونوں ہی گریٹ پرسنالٹیز میرے فیورٹ ہیرو ہیں ان کی تقلید میں میں بھی اسی ایج میں شادی کروں گا دیکھ لیجیے؟"

وہ منہ پھلا کر بولا تھا۔

''صرف شادی ہی اس ایج میں کر کے ان عظیم شخصیات کو فالو کرو گے بس؟''

روشنی نے گویا ایک بار پھر اسے کریدنا چاہا تو ابنِ زید نے سر کھجا کر مسکراہٹ دبائی تھی۔

''نہیں میں قائداعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کشمیر کو آزاد کراؤں گا''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے اور ہمیں آزادی کی دولت نصیب ہو آمین''

ان کی ماں جو یہ ساری گفتگو سن رہی تھی بے اختیار بولیں تھیں پھر تینوں ہی مسکرا دیئے تھے۔

☆☆☆

کیوں آنکھ میں بہتے ہوئے اشکوں کی لڑی ہے
چپ رہ میرے ہم وطن قیامت کی گھڑی ہے
ہوتا ہے کچھ گمان سا میدان حشر کا
ہر اک مسلمان کو اپنی ہی پڑی ہے
مٹ جائے میرا دیس یہ حالات بنا کر
اطراف کی ہر قوم تماشے پر کھڑی ہے
پھر سرخ سرخ ہے میرے دریاؤں کا پانی
لگتا ہے کہ کہیں خون کی برسات پڑی ہے
ان ظالموں کو جڑ سے مٹا دے میرے یا رب
سب ہاتھ اٹھاؤ کہ ملک کو دعاؤں کی کمی ہے

وہ ہاتھوں پر سر گرائے ملول نظر آتا تھا جب اس کے آفس کا دروازہ کھلا اور افتاں و خیزاں عبدالرحیم داخل ہوا تھا۔

''سنا تم نے محبّ! احد مرتضیٰ کو کسی نے گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ احد مرتضیٰ شہید ہو گیا ہے۔ یعنی اس ملک کا ایک اور ستون گرا یعنی ملک کی کچھ اور بھی بنیاد کمزور کی گئی۔

عبدالرحیم کا لہجہ رقت آمیز تھا۔ محبّ نے ہاتھوں سے سر اٹھایا اور ایک نظر اسے دیکھا۔ پتا نہیں اس کی اپنی نظر دھندلائی تھی یا عبدالرحیم کا ہی چہرا دھواں ہو رہا تھا۔

''ہاں اسے اللہ کی امان میں دیا! اس نے اپنا فرض احسن طریقے سے نبھایا۔ صالح لاپتہ ہے اور احد اگلے سفر پر رخصت ہوا''

کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر اس نے بوجھل آواز میں کہا اس کے بال اس کی گردن

پر بکھر گئے تھے۔ اس کا دل اس اطلاع کو پا کر کتنے آنسو بہا چکا تھا مگر یاسیت پھر بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ احد مرتضیٰ ایک بے باک صحافی تھا۔ کتنی تیزی سے مقبول ہوا تھا وہ اپنی سچائی اور جذبۂ حب الوطنی کے باعث!

''میں نے کہا تھا بہت کہا تھا اتنی فاسٹ نہ چلو۔ اتنی جلدی سارے پردے نہ اٹھاؤ مگر وہ سنتا کہاں تھا''

عبدالرحیم کی آنکھیں آشکبار تھیں۔

''سچ سفاک نہیں ہوتا عبدالرحیم ہاں اسے سہنے کا حوصلہ کسی کسی میں ہوتا ہے''

محبّ عبدالقدوس نے گویا اس کی تصحیح کی۔

''یہی سمجھ لو۔ محبّ میں تم سے بھی کہوں گا۔ اتنے کٹھن راستوں پر مت چلو۔ جہاں پاؤں فگار ہو جائیں، میں جانتا ہوں تمہیں بھی دھمکی آمیز کالز آنے لگی ہیں۔ ابھی تم جیسے لوگوں کی اس ملک و قوم کو بہت ضرورت ہے''

عبدالرحیم کی بات پر محبّ عبدالقدوس نے خفگی بھری نظریں اس پر جمائی تھیں۔

''مجھے بزدلی کے اسباق مت پڑھاؤ عبدالرحیم!''

''یہ بزدلی نہیں بس احتیاط کا ایک انداز ہے''

عبدالرحیم نے توجیہہ دی تھی جسے محبّ عبدالقدوس نے رد کر ڈالا۔

''یہ بھی جانتے ہوئے کہ موت کا ایک دن متعین ہے؟''

اور عبدالرحیم لاجواب ہو کر رہ گیا۔

''تو تم باز نہیں آؤ گے؟ یہی خیال کر لو کہ اس ملک کو تم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے''

''اس ملک کے لیے ہی تو کچھ کرنا چاہتا ہوں بے وقوف لڑکے! مت روڑے اٹکاؤ میری راہوں میں ورنہ کائنات کا نظام کسی کے چلے جانے یا ٹھہرنے سے نہ رکا ہے نہ رکے گا۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا عبدالرحیم مجھے صرف صالح کو بازیاب ہی نہیں کرانا اس اسرار کو بھی پانا ہے۔ رازوں سے پردے اٹھانا ہے۔ اب تو مجھے موقع مل رہا ہے ہو سکتا ہے وقت گزرنے پر میں ایسا نہ کر پاؤں''

''تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے ابھی تک صالح کو تمہاری خاطر زندہ رکھا ہوا ہو گا کہ تم آؤ اور چھڑا کر لے جاؤ''

عبدالرحیم کو اتنا غصہ آیا تھا کہ بھڑک کر طنزیہ بولا۔

''تم جو بھی کہو مگر مجھے وہاں جانے سے نہیں روک سکتے''

"یہ تمہاری بھول ہے تمہیں روکنے کو میں دوسرا حربہ بھی استعمال کرسکتا ہوں۔ اور تم جانتے تو ہوگے وہ دوسرا حربہ کیا ہوسکتا ہے"

اب کے عبدالرحیم کا لہجہ دھمکی آمیز تھا مگر محب عبدالقدوس کے اطمینان میں ذرا برابر جو فرق آیا ہو۔

"تم مجھ سے بدعہدی کے مرتکب نہیں ہوسکتے یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

اس کی مسکراہٹ میں جو اعتماد تھا وہ عبدالرحیم کو گہرا سانس بھر کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرگیا۔

☆☆☆

نہ کوئی رنگ نہ ہاتھوں پر حنا تیرے بعد
میں مکمل ہی سیاہ پوش ہوا تیرے بعد
لے کے جاتا رہا ہر روز میں پھول اور چراغ
بس یہی میں نے کیا جتنا جیا تیرے بعد
میرے ہونٹوں سے تیرا نام نکل جاتا تھا
جس نے اپنایا مجھے چھوڑ دیا تیرے بعد
ساری دنیا نے مجھے مالِ غنیمت سمجھا
جس نے بھی چاہا مجھے لوٹ لیا تیرے بعد
فیصلہ لکھ کے قلم توڑ دیا منصف نے
پھر محبت کی نہ دی کوئی سزا تیرے بعد

اس نے ڈائری میں رقم غزل کو پڑھا۔ جو ایسی ہی مزید تحریروں سے بھری پڑی تھی۔ ہجرو نارسائی اور فراق کی ایک لمبی داستان تھی جو اس کی وطن کی محبت میں سرشار ماں کی شخصیت کا ایک بالکل منفرد اور انوکھا چہرہ دکھا رہی تھی۔ وہ ساری زندگی یہ سمجھ نہ سکی تھی اس کی ماں کو "ابنِ زید" نام سے اتنی محبت کیوں تھی اس نے اپنے بہت بچپن سے اپنی ماں کو کونے کھدروں میں چھپ کر روتے دیکھا تھا۔ اس کا سوتیلا باپ ایک غصیلا آدمی تھا۔ جو بات بات پر اس کی ماں کو زدو کوب کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی ماں کی بیشتر دولت سوتیلے باپ نے اجاڑ دی تھی مگر وہ بڑے صبر کے ساتھ اس سے گزارا کیے جاتی۔ ہر زیادتی کو تحمل سے سہہ جاتی اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی اس کے باوجود ایک دن وہ آدمی اس کی ماں پر شرمناک الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے بعد

طلاق دے کر چلا گیا۔ اس دن سے اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ تنہا دیکھا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی ماں پر بہت رحم آیا کرتا وہ اسے مظلوم عورت سمجھتی تھی مگر اس کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ اس ڈائری نے آنکھوں پر گرے سارے پردے ہٹا دیئے تھے۔ سیاہ جلد والی مخملیں ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ پرانے سامان سے یہ اس کے ہاتھ لگی تھی اور شاید کبھی اسی طرح اس کے سوتیلے باپ کے بھی۔ پتا نہیں اس کی ماں نے اپنی ناکام محبت کی داستان کو محفوظ کیوں کیا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔

ابنِ زید اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر تیزی سے ڈائری وہیں چھپا دی اور سرعت سے اٹھ کر باہر آگئی۔

"اماں بلا رہی ہیں۔ آپا وہ تجھے اکرم بھائی سے شادی پر مجبور کرے تو صاف منع کر دینا۔ مجھے وہ ہرگز بھی اچھا نہیں لگتا۔"

ابن زید نے گویا اسے نصیحت کی تھی۔ وہ بوجھل دل سے مسکرا دی۔ ابن زید کی توقع کے عین مطابق اس کی ماں نے اس سے اکرم سے شادی کی بات چھیڑ دی تھی۔

"اگر تم مجھے کوئی جواب دو تو میں انہیں ہاں کہنے والی بنوں، تم جانتی ہو یہاں کے حالات کو ہر دم جان کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ تم اپنے گھر کی ہوگی تو میں بھی سکون سے مرسکوں گی"

اس کی ماں کے لہجے میں لجاحت تھی۔ روشنی نے ایک نظر اپنی نحیف ماں کو دیکھا پھر سر کو نفی میں جنبش دی تھی۔

"میں اکرم سے شادی نہیں کروں گی۔ آپ ان لوگوں کو منع کردیں"

باب 6

اس کا لہجہ دوٹوک تھا اور بے حد قطعت لیے ہوئے۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی۔ اس کی ماں ساکن پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

گنگناتے ہوئے آنچل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سلادے مجھ کو
یاد کر کے مجھے تکلیف ہی ہوتی ہوگی
ایک قصہ ہوں پرانا سا بھلا دے مجھ کو
ڈوبتے ڈوبتے آواز تیری سن جاؤں
آخری بار تو ساحل سے صدا دے مجھ کو
میں تیرے ہجر میں چپ چاپ نہ مرجاؤں کہیں
میں ہوں سکتے میں کبھی آ کے رلادے مجھ کو
دیکھ میں ہو گیا بدنام کتابوں کی طرح

غلام حسین نے اپنے جذبات کو ایک بار پھر شاعری کی زبان میں ڈھالا تھا۔ ابھی وہ پورا میسج پڑھ کر فارغ بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اسی وقت اس کی کال آنے لگی۔ دیا کا دل ایک دم بہت بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے گئے ہوئے اور بالآخر اس نے اس دشمن جاں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اعتراف میں عار تو تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ سو اسے خود سے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ اپنی تمام تر سحر انگیزی کے ساتھ اسے اپنی محبت میں مبتلا کر چکا تھا وہ اس کی ایک ایک یاد کو اس کی کمی محسوس کرتے ہوئے کتنی جزئیات کے ساتھ کتنی دل جمعی سے دہرایا کرتی تھی تو آنکھیں اپنی شکست اور اس کی ستمگری کے احساس سے بھیگنے لگتی تھی۔

خیال یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روز گار کرتے رہے

نہیں شکایت ہجراں کہ اس جھمیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے
وہ دن کہ کوئی وجۂ انتظار نہ تھی
ہم ان میں بھی تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہلکی خفگی لیے بھر پور شکایتی لہجہ دیا کے دل کی منتشر دھڑکنوں کو کچھ اور بھی انتشار کا شکار کر گیا۔

"کیسی ہو ظالم بیوی!"

وہ آہ بھر کے گویا ہوا تھا۔ دیا نے مسکراہٹ ضبط کی۔ اگر اسے پتا چل جائے اس کے دل کی مضروب حالت کیا ہے کیسا ری ایکشن دے وہ، اسے سوچ کر بھی حیا آئی۔

"اچھی ہوں"

وہ چاہنے کے باوجود اس کی خیریت دریافت نہ کر سکی۔ غلام حسین نے سرد آہ بھری تھی۔

"تمہیں ابھی پتا چلا ہوگا اس اچھائی کا میں تو ہمیشہ سے جانتا ہوں"

وہ گویا چھیڑ رہا تھا۔ دیا نے جواباً کچھ کہنا ضروری خیال نہ کیا۔

"میں نے یہ بتانے کو کال کی تھی کہ مجھے کچھ دن مزید لگ جائیں گے"

بہت دیر تک اس کی طرف سے کچھ سننے کا منتظر رہ کر وہ مایوس ہو کر بولا تھا۔ دیا کے دل پر یکدم جیسے اوس گر گئی۔

"مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ بھلے کبھی بھی لوٹ کر نہ آیئے"

اسے یکا یک بے تحاشا غصہ اور ڈھیر سارا رونا آ گیا تھا۔

"چلیں یہ آپ کا آرڈر ہے تو اس پر بھی غور کر لیں گے ویسے بھی ہمیں اپنی اوقات اچھی طرح پتا ہے" اس کی کیفیت کو پائے بغیر غلام حسین ان الفاظ سے ہرٹ ہو چکا تھا۔ دیا نے محسوس کیا اور بہت کچھ کہنے کی خواہش دل میں ہی دبا کر رہ گئی۔

"سنو! کیا تمہیں واقعی مجھ سے کبھی محبت نہیں ہو سکتی؟ کبھی کبھار تو مجھے لگتا ہے میں تمہارے ساتھ واقعی زیادتی کر چکا ہوں"

"یہ خیال آپ کو بہت دیر سے نہیں آیا؟ خیر آئندہ اس قسم کی خود غرضی کے مظاہرے سے پرہیز کیجئے" اب کے وہ سراسر شرارت سے بولی تھی۔ غلام حسین کو شاید اس سے اتنی سرد مہری کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کی سمجھے بغیر اتنا ہرٹ ہوا تھا کہ مزید کچھ کہے سنے بغیر سلسلہ

کاٹ دیا تھا۔ ایک لمحے تو تو دیا ہونق رہ گئی۔ پھر اس کے ہونٹوں کی تراش میں شریری مسکان بکھرتی چلی گئی تھی۔

(آپ واپس تو آئیں غلام حسین صاحب! آپ کے لیے ایک نہیں دو دو سرپرائز اکٹھے کر کے رکھے ہیں)

☆☆☆

بھسم چہرے کے سرخ آنسو
سبز عماموں پر جم گئے ہیں
عروسی آنچل پر دکھ کے تارے
ہماری قسمت میں ٹنگ گئے ہیں
ہمارے خوں سے کشید کر کے
وہ خنجروں کو پلا رہے ہیں
جلتے چہروں پر رقص کرتی
آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں
پہاڑ سرمئی دھواں اڑا کر
فاختائیں بھگا رہا ہے
پناہ گزینوں کی مٹھیوں میں
عذاب جذبہ دبا رہا ہے
وہ جلتی آنکھوں کے بھاپ آنسو
چیخ اٹھیں گے تو حشر ہوگا
ظلم گردن سے خاک ارضی پر
کٹ گرے گا تو امن ہوگا
جو سرنخوت سے بھر چکا ہے
وہ سر گرے گا تو امن ہوگا

کچھ ہفتوں، کچھ مہینوں بعد یہ سال بھی تاریخ کا حصہ بن جائے گا وہ تاریخ جس میں ہے کو تھا سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ تاریخ ہماری آنے والی نسلوں کے متعلق وہ بتائے گی جس سے آج ہم بے خبر ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم سے بہت پہلے کے لوگ اپنے حالات

سے بے خبر تھے اور آج ہم ان کی تاریخ پڑھتے ہیں تو از حد حیران ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اہل اندلس کی تاریخ پڑھی ہے۔ وہ اہل اندلس جنہوں نے عظیم الشان مسجد قرطبہ تو تعمیر کی مگر اس کے گنبد کو "اللہ اکبر" کی گونج نہ سنا سکے۔ کیا آپ نے اہل بغداد کی تاریخ پڑھی ہے۔ وہ اہل بغداد جو اپنی دھرتی میں جذب ہونے والے "خونِ حسینؓ" کی لاج بھی نہ رکھ سکے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عزت کے عوض آزادی کا سودا کرنا چاہا تھا مگر نہ پھر عزت رہی نہ آزادی۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ان کے دشمن ان کے سامنے ان کے لیے تلواریں نیزے تیز کر رہے تھے مگر یہ بے پرواہ بنے رہے۔ عیش و نشاط میں مست رہے۔ ماضی پر نظر ڈالنے کے بعد ہم کیوں نہ اپنے حال پر نظر ڈالیں۔ کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم انجانے میں انہی لوگوں کی روش پر چلنے کو تیار کھڑے ہیں۔ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کہ کہیں ہماری آنے والی نسلیں ہماری تاریخ ویسے ہی پڑھ رہی ہوں جس طرح آج ہم اپنے پہلوں کی پڑھ رہے ہیں۔ 2011 بھی تیزی سے اپنے اختتام کی جانب رواں ہے۔ یقیناً ہمارے ذہنوں میں "ہیپی نیو ایئر" کا فقرہ چودھویں کے چاند کی طرح جگمگا رہا ہوگا۔ مگر ایک پل کو ٹھہریئے ایک لمحے کو سوچیئے تو سہی کیا ہم جو ہر ایسے موقع پر وش کرتے ہیں کیا یہ وشنگ جائز ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ نئے سال سے کچھ پہلے ہی ہمارا اسلامی سال بھی شروع ہوا ہے جو محرم الحرام کے ساتھ آغاز ہوتا ہے اور "محرم الحرام، شہادتِ حسینؓ" کا مہینہ ہے۔ نئے سال کی مبارک باد ہے کس لئے؟ امام حسینؓ پر ڈھائے گئے مظالم اور ظلم و ستم کی؟

کیا وزیرستان میں اور دیگر علاقوں میں مرنے والے ہزاروں بے گھر ہونے والے افراد کی؟

زلزلے سے تباہی پھیلنے کی؟
جلتے سلگتے کشمیر کی؟
کھنڈر بنے عراق کی؟
یا سفاکی کا شکار ہونے والے فلسطین کی؟
یا افغانیوں کی بے حالی کی؟
اگر ہم انسان ہیں تو انسانیت کے بارے میں سوچنا ہمارا فرض ہے۔
قوم ہیں تو قوم کے بارے میں فکرمند ہونا ہمارا کام نہیں؟
مسلمان ہیں تو مسلمانوں کے دکھ پر تڑپتے کیوں نہیں۔ پاکستانی ہیں تو پاکستانیوں

کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔

سوچیئے تو سہی کہیں خوشی و مسرت کا کوئی عنصر ہے؟ ہوسکتا ہے انفرادی طور پر یہ سال ہمیں کچھ دے بھی جائے مگر بحیثیت انسان وقوم اور پاکستانی مسلمان تو ہمارے پاس صرف دکھ اور غم ہی بچے ہیں۔ خون اور آنسو ہی ہیں۔ یاد رکھیے ہمارا زوال اسی دن شروع ہوگیا تھا جس دن ہم نے خود کو صرف مسلمان سمجھنے کی بجائے اپنے اپنے ملک کے باشندے سمجھنا شروع کیا۔ ہمیں دعا کرنی ہے بہتری اور بھلائی کی۔

☆☆☆

آسماں سے کوئی بشارت نہیں
اور زمیں گنگ ہے
وقت ایک بیوہ ماں کی طرح
سوگ میں مبتلا ہے
ہوا، سسکیاں لے لے کے چلتی ہے کالی ہوا
خواہشوں کے کنول درد کی جھیل سے
سر اٹھاتے نہیں
خواب تک بند آنکھوں میں آتے نہیں
ساری سچی کتابوں میں یہ درج ہے
ایسے حالات میں
آسماں سے نبی یا تباہی زمیں کی طرف
بھیجے جاتے رہے ہیں
مگر ان کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے
نبی اب نہیں آئیں گے

وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھتے نہیں تھے۔ کمرے میں تکلیف دہ خاموشی کا وقفہ بڑھتا جاتا تھا۔ ابنِ زید کے چہرے پر تاسف و ملال تھا تو سکندر کے روم روم سے مایوسی لپٹی تھی۔

"میں ہرگز یہ تصور نہیں رکھتا تھا سکندر بابا کہ آپ جیسا بہادر انسان بھی یوں ہمت ہار دے گا" معاً ابنِ زید کی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا تھا۔ ان کی آواز میں بھی ان کے چہرے و

آنکھوں جیسا رنج و ملال تھا۔ سکندر کے چہرے پر زہرخند پھیلا۔

"انسان کے ہار تسلیم نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ابنِ زید حالات بدل تھوڑی جاتے ہیں"

"بدلتے ہیں سکندر بابا تاریخ گواہ ہے اس بات کی مسلسل کوشش شرط ہے بس۔ آپ نے ہمت کیوں ہار دی؟"

وہ اس کے مستعفی ہونے پر سخت خفا تھے۔

"میرے پانچ سالہ کیریئر میں یہ دس ہزارویں تحریر ناقابلِ اشاعت ٹھہری ہے۔ ابنِ زید میں کیسے جاری رکھوں ایسی کوششیں؟ اس سفر کا یہی اختتام ہونا تھا کہ بہر حال میں جو لکھتا تھا اپنے لیے نہیں لوگوں کے لیے لکھتا تھا میں نے یہ بات بہت عرصے میں جانی ہے کہ میں "محبّ عبدالقدوس یا ابنِ زید" نہیں ہوں اس کے لہجے میں ٹوٹتے کانچ کی چبھن تھی۔ ابن زید کا تاسف کچھ اور بڑھ گیا۔

"اب کیا کروگے؟"

انہوں نے دانستہ موضوع بدلا۔

"میں کشمیر جا رہا ہوں"

"واٹ؟" ابنِ زید کو دھچکا لگا تھا۔

"اب تم وہاں جاکے رپورٹنگ کروگے؟"

"اتنا اہم کب سے ہوگیا میں۔ نام سکندر رکھ لینے سے کوئی قسمت کا سکندر تھوڑی بن جایا کرتا ہے"

وہ پھر شکستہ ہونے لگا۔ ابنِ زید نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

"مجھے ایسے کیوں لگتا ہے سکندر بابا کہ تم اور اسوہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہو"

اس سے نگاہیں چار کیے بنا وہ کرب سے گزر کر بولے۔ سکندر دل شکستگی سے ہنستا تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں انفرادی سکھ پر خوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں آپ جانتے ہیں"

"مجھے بہلاؤ نہیں سکندر بابا! مجھ سے پلیز کچھ مت چھپاؤ"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے ان کے لہجے میں یکا یک بے حد اضطراب در آیا تھا۔

"آپ کیا کرلیں گے سوائے ہرٹ ہونے کے"

وہ چہرے کا رخ پھیر کر اسی دلگیری سے بولا تھا۔

"تو میرا اندازہ صحیح ہے"

ابن زید بے دم سے ہو کر پھر سے واپس بیٹھ گئے ان کے چہرے کا پھیکا پن بے حد واضح تھا۔

"شاید مجھے اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہئے تھی۔ ایسا تو پھر ہونا تھا"

اپنا تمسخر اڑا کر ہنستا ابن زید کو وہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ پھر اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے تھے اور سکندر اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی ساکت بیٹھے رہے تھے۔ پھر کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

مجھے پتہ ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں ہٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے رو ٹکروں سے
فصیل دشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ
چمک کے ذوقِ غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا
میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی کی سحر نہ ہوگی
مگر میں پھر بھی
سیاہ شب کا غبار بن کے نہیں جیوں گا

گھسی ہوئی بدرنگ جینز پہ ڈھیلی ڈھالی اسکائی بلیو شرٹ جس کے گریبان کے اوپر دو بٹن کھلے تھے۔ ہوا اس کے ریشمی لمبے بالوں کو اڑاتی تھی۔ شرٹ کا کالر پیچھے کی جانب ڈھلکا ہوا تھا اور دائیں بازو کی آستین کہنی تک فولڈ تھی وہ بہت محتاط اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ جولائی 2011ء کا ایک بہت پرتپش دن تھا۔ سورج اپنی شعاعیں تاک تاک کر مارتا تھا۔ اور اس کا پورا وجود پسینے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ یہ ڈھلتی ہوئی شام کا وقت تھا مگر سورج کی تمازت میں جیسے کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ پتھریلا علاقہ تھا۔ اسے اپنی گاڑی ناہموار راستے کی وجہ سے بہت پیچھے چھوڑنا پڑی تھی۔ سرمئی اور بھوری چٹانوں کے بیچ کہیں کہیں سر اٹھاتے کھڑی خودرو جھاڑیوں سے جب کوئی جنگلی جانور اپنی آواز کا جادو جگاتا تو اس پرہیبت اور خاموش ماحول میں عجیب دل دہلا

دینے والا احساس تھرتھرانے لگتا۔ چلتے ہوئے اسے کسی ابھری ہوئی چٹان کے نوکیلے سرے سے ٹھوکر لگی تھی۔ اور وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم آگے جا کر گرتے گرتے بچا ایک گہرا سانس آپ ہی آپ اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اپنے سر کے اوپر کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو محسوس کرتے اس نے بے اختیار اوپر دیکھا تھا گدھوں کے غول کو خود سے کچھ فٹ کے فاصلے پر ہوا میں منڈلاتے دیکھ کر اس کے اعصاب جھرجھرا کر رہ گئے۔ معاً چند قدم چل کر وہ ٹھٹک گیا تھا۔ گدھوں کا غول جس جگہ سے فضا میں بلند ہوا تھا وہاں ابھی کچھ گدھے موجود تھے۔ "محبّ عبدالقدوس" نے ان کا شکار بننے والے انسانی جسم کو دیکھا تھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ خاکی پتلون پر جا بجا خون کے دھبے جو اپنی اصل رنگت کھو کر سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ بلیک پولیس یونیفارم کی مخصوص شرٹ "محبّ عبدالقدوس" پر دیوانگی اور وحشت سی طاری کر گئی۔ گدھوں کے جس غول کو دیکھ کر کچھ لمحے قبل اس کے اعصاب میں خوف کی تھرتھری اٹھی تھی اب وہ ان کی پرواہ کئے بغیر دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا اس انسانی وجود جو یقیناً اب "لاش" بن چکا تھا کی جانب لپکا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اسی وحشت زدہ انداز میں اوندھے منہ پڑے اس وجود کو کانپتے ہاتھوں سے یکلخت سیدھا کر دیا۔ اگلے لمحے اس کے پورے وجود پر جیسے ٹنوں کے حساب پر برف آ گری تھی۔ اور آنکھوں میں جیسے کسی نے بے دردی سے گرم سلائیں پھیر دی تھیں۔ وہ ایک ہراس اور سکتے کی کیفیت میں آ گیا تھا۔ آس پاس کا ماحول بھی اس کے دل کی طرح سے تھرا اٹھا تھا۔

صاح......لح!!!!

وہ حلق کے بل چیخا تھا اور صالح کے وجود سے لپٹ کر پاگلوں کی طرح سے چیختا چلا گیا تھا۔ بار بار صالح کے مردہ وجود سے لپٹ کر اسے دیوانگی کے عالم میں چومتے وہ حواسوں میں نہیں رہا تھا۔ صالح کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ حواس بحال رکھ پاتا۔ آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے۔ اسے یقیناً بہت سفاکی اور بربریت سے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے کے اعضاء کو اس بے دردی سے کاٹا گیا تھا کہ پہچان کے قابل بھی نہیں تھا وہ اندازہ کر سکتا تھا اس کے وجود کو موت سے قبل کن اذیتوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ایک اور "گمنام سپاہی" ملک کی حرمت اور حفاظت کی خاطر جامِ شہادت نوش کر چکا تھا اور حکومت کے ساتھ اب ہمارے فنکار بھی پاک بھارت دوستی کے گیت الاپ رہے تھے اور قوم انٹرنیٹ و موبائل اور ٹی وی پر مصروف انڈین موویز سے دل بہلا رہی تھی اور "محبّ عبدالقدوس" وہاں اس بیابان جگہ ملک کی سالمیت کے بڑھتے خطرے کو محسوس

کرتے خود وہاں چلا آیا اور اب ایک محافظ کی جان جانے پر تن تنہا سسکتا دکھ منا رہا تھا۔ صالح کی اس تباہ کن حالت نے اس پر مجنونیت طاری کر دی تھی۔ آہیں، کراہیں، سسکیاں اس کے درد اور کرب کی گواہ بنی پہاڑوں سے ٹکرا کر فضاؤں میں بازگشت بن کر گونجتی رہی تھیں۔ جانے کتنی دیر اس طرح گزری تھی۔ رنج اور ملال تھا کہ گھٹتا ہی نہ تھا۔ معاً ایک کریہہ اور بے ہنگم قہقہے کی آواز پر درد کے اس لامتناہی صحرا کی خاک چھانتا چونکا اور سیدھا ہو کر دھندلاتی آنکھوں سے سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔

موٹا بھدا وجود، سیاہ رنگ، اندر کو دھنسی آنکھوں والا چھوٹے قد کا آدمی اسے دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ میں پکڑی گن کو سنبھالے لہراتا جھومتا بدمست بیل کی طرح اس کی جانب آیا اور اسی بے ڈھنگی ہنسی کے درمیان بولا تھا۔

''اسے کہتے ہیں۔ نہ جان نہ پہچان! بڑی خالہ سلام! کیوں روتے ہو؟ یہ تمہارا سگا سگوترا تو کہیں سے بھی نہیں تھا آج تو وہ مادہ پرست دور ہے کہ کوئی اپنوں کا بھی اس طرح ماتم نہیں کرتا اور تم اس کراہیت آمیز وجود سے لپٹ کر تڑپے جاتے ہو۔ ذرا سوچو اگر جو تمہارا حال بھی اس جیسا ہو تو......؟''

اس پر جھک کر رائفل سے اس کی ٹھوڑی پر دباؤ ڈال کر چہرا اوپر اٹھانے کے بعد وہ کھڑ کھڑاتی آواز میں سوال کر رہا تھا۔

محب عبدالقدوس نے نفرت سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اور تحقیر بھرے انداز میں رائفل کی نال جھٹک کر دور ہٹاتا اٹھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''بلے بلے! جیسا جی دار تجھے سنا تھا ویسا ہی دیکھا بھی۔ تو تو بندوکڑی سے بھی نہیں ڈرتا''

پتا نہیں وہ اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا یا تعریف کر رہا تھا۔ عبدالقدوس کو دھیان دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی اس نے صالح کے زخموں پر مکھیوں کو بھنبھناتے دیکھا تھا اور جھک کر اسے بازوؤں میں بھرنے لگا۔

(تم کیا سمجھتے ہو ان لوگوں نے اب تک صالح کو زندہ چھوڑا ہوگا؟) اسے عبدالرحیم کی آواز کی بازگشت سنائی دی تو آنکھیں کچھ اور بھی بھیگ گئی تھیں۔

''کدھر شہزادے؟ اس لیے یہ جال تم پر پھینکا تھا کہ تم آؤ اور اسے لے کر چلتے بنو۔ یہ گدھوں کی خوراک ہے۔ مسلمان ہو اتنا بھی نہیں جانتے کسی کا رزق چھیننا گناہ ہے۔ تو ہمارا مہمان ہے شہزادے چل آگے لگ''

اس کے زوردار دھکے پر محب سنبھل نہیں سکا تھا۔ صالح کا بے جان وجود اس کے ہاتھوں سے چھوٹا اور ڈھلوان پر کئی فٹ نیچے پھسلتا چلا گیا۔ محب عبدالقدوس کے جیسے دل پر تازیانہ آ کر لگا تھا۔ ایک شہید کے وجود کی یہ بے حرمتی اس کی برداشت سے باہر کی بات تھی۔ وہ غیض و غضب سے بھر کر پلٹا اور بجلی کی سی تیزی سے اس بدہیئت انسان پر حملہ آور ہوا تھا مگر اسی پل جیسے ہر سمت ایک طوفان آ گیا۔ جانے کہاں سے پانچ سات آدمی گوریلے انداز میں اس پر جھپٹے تھے اور اسے ٹھگنے آدمی سے الگ کر کے رائفلز کی زد پر لے لیا۔ محب عبدالقدوس کے چہرے سے بے بسی چھلکی تھی۔ اس نے غمناک نظروں سے اس سمت دیکھا جہاں ڈھلوان کی جانب صالح کی باڈی گری تھی۔

''چلو''

ٹھگنے نے اپنی رائفل کی نال سے اس کی پسلی میں ٹھوکا مارا۔ اس نے اٹھتے ہوئے پلٹ کر پھر اسی جانب نگاہ کی تھی۔ جہاں گدھ پھر سے منڈلانا شروع کر چکے تھے۔ بے بسی کے مظہر آنسو اس کی آنکھوں کی کور سے ٹپکے تھے اور پتھریلی زمین پر گر کر اپنی وقعت کھو گئے تھے۔

☆☆☆

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
اے درد بتا کچھ تو ہی پتہ اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بے تاب نہاں یا آپ دلِ بے تاب ہیں ہم

اپنے بستر پر وہ اوندھے منہ ساکن لیٹا تھا جب اماں نے کمرے سے اندر قدم رکھا اور اسے آواز دی۔

''جی اماں!''

وہ اٹھ بیٹھا اور ٹیپ کا بٹن آف کیا۔

''تم نے نوکری چھوڑ دی ہے؟''

''ہاں اماں!''

''کیوں؟'' اماں کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ گہرا سانس بھر کے بڑھی ہوئی شیو کھجانے لگا۔

''اس سے بہتر نوکری مل گئی ہے۔ کچھ دنوں میں جا رہا ہوں۔ بس آپ دعا کیجیے گا''

''کیا مطلب؟ دوسرے شہر میں رہو گے؟''

وہ حیران رہ گئیں۔

"مجبوری ہو گئی اماں! کیا کیا جا سکتا ہے"

"بیٹے نئی نئی شادی ہوئی ہے تمہاری! پھر گھر میں ہم اکیلی عورتیں تم اس شہر میں نوکری ڈھونڈتے نا"

"زارا کے لیے آپ کوئی لڑکا دیکھیں اماں! اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں! باقی اللہ مالک ہے"

"اسوہ کو ساتھ لے کر جاؤ گے؟"

اماں نے اس کی بے حد سنجیدہ صورت دیکھی تھی۔

"میں کام کے لیے جا رہا ہوں اماں!"

اس سوال نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ بے زاری سے بولا۔ اندر داخل ہوتی اسوہ نے بے اختیار ہونٹ بھینچے تھے۔

"اب کون سا کام کر رہے ہیں آپ؟"

اماں کے جانے کے بعد وہ دیوار سے ٹیک لگا کر اسے دیکھتی ہوئی سنجیدگی سے بولی تھی۔

"جب کروں گا تو پتا چل جائے گا"

سکندر سگریٹ سلگا رہا تھا رکھائی سے بولا۔ اسوہ کچھ دیر اس کی بے اعتنائی کو دیکھتی رہی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ، کیا انسان کی توقعات پوری نہ ہوں تو وہ یونہی بدل جایا کرتا ہے؟ اور ایک ابن زید ہیں۔

سکندر خوش نہیں ہے لوٹ کر دولت زمانے کی
قلندر دونوں ہاتھوں سے لٹا کر رقص کرتا ہے

"ہاں فرق تو ہے دونوں میں"

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ جانے اسے اپنی زیادتی کا احساس کیوں نہیں ہو سکا تھا۔

"تم باہر جا کے سو جاؤ"

اسے بستر پر دراز ہوتے دیکھ کر وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"مجھے کھلے آسمان تلے سونے کی عادت نہیں ہے"

اس کے صاف جواب نے سکندر کو ہونٹ بھینچ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی طرح وہ کہہ نہیں سکا تھا کہ اسے اپنے بستر کے بغیر سونے کی عادت نہیں ہے جس پر وہ قبضہ کر چکی تھی۔

"آپ کشمیر جا رہے ہیں نا جہاد کے لیے؟"

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ سکندر کا منہ حیرت کی زیادتی سے کھل گیا۔

"اگر میں آپ کو روکوں تو رک جائیں گے؟"

"نہیں۔ اور تم کس برتے پر روکو گی؟ ہمارے بیچ ایسا کوئی تعلق نہیں ہے"

وہ تڑخ گیا تھا۔ اسوہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا میں سمجھوں کہ آپ اسی وجہ سے اس حد تک ہرٹ ہوئے ہیں کہ میں آپ کو کوئی خوشی نہیں دے سکی؟"

اس کی نظریں جھکی تھیں اور لہجے میں تاسف تھا۔ سکندر کو جیسے آگ لگ گئی۔

"تمہیں اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ خوش فہمی لاحق ہے۔ میں نے تم سے محبت کی حماقت ضرور کی تھی مگر تمہیں اپنا دین ایمان نہیں سمجھا تھا"

اس نے بہت اچھے طریقے سے اس کی طبیعت صاف کی تھی۔ اسوہ کا چہرا دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"آئی ایم سوری سکندر!"

"سوری! سوری فار واٹ؟" وہ پھنکارا اور زہر خند سے ہنسا۔

"تم نے بہت اچھا کیا اسوہ بی بی کہ مجھے جلدی میری حیثیت اور اوقات یاد دلا دی مگر نہیں تم نے غلطی کی تمہیں اس وقت مجھے یہ سب کہنا چاہیے تھا جب میں نے پہلی بار تمہارے آگے دستِ سوال دراز کیا تھا۔ اب میں شاید اگر تمہارے لیے کچھ کروں بھی تو...... تمہیں پتا چل تو گیا ہی ہے میں صاف بتا دوں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا وہاں سے لوٹنا میرا نصیب بنتا ہے کہ نہیں۔ اماں کو میں نے جبھی نہیں بتایا کہ مجھے ممتا کا واسطہ دے کر روک نہ لیں۔ وہاں جانے کے بعد میں انہیں سب بتا کر راضی کر لوں گا۔ تم مجھے بتاؤ جانے سے قبل میں تمہارا ابھی فیصلہ کرنا چاہوں گا"

اس کا لہجہ اتنا مدلل مضبوط اور دوٹوک تھا کہ اسوہ کا رنگ اڑ کر رہ گیا۔ اس نے سٹپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

وہ سراسیمہ ہوئی تھی۔

"اتنی معصوم نہیں ہو تم کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکو"

وہ پھر زہر خند ہونے لگا۔ اسوہ کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔

"سکندر! اگر آپ نے کوئی فضول حرکت کی تو میں بتا رہی ہوں آپ کو میں زہر کھالوں گی، اس بدنامی سے بدرجہ اتم یہ بہتر ہوگا"

اس کے حواس اتنے ہی سلب ہو گئے تھے کہ ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر بے اختیار رو پڑی تھی۔

سکندر سخت کوفت کا شکار ہو گیا۔

"رونا بند کرو۔ کیا فضول حرکت ہے یہ"

وہ کسی طرح بھی خود کو اسے جھڑکنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور یہ پہلا موقع تھا جبھی اسوہ سہم کر نہ صرف چپ ہوئی بلکہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں حیرت لیے ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی تھی۔ لانبی ریشمی پلکوں والی سحر طراز آنکھیں بھیگ کر کچھ اور بھی قاتل ہو گئی تھیں۔ سکندر کا دل مضبوط سینے کے اندر ڈگمگا کر رہ گیا۔ اس نے بے ساختہ نگاہ کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"اٹھو باہر جاؤ مجھے سونا ہے اب اور میں اپنے بستر پر سوؤں گا"

وہ بے رخی سے کہتا اسے ہاتھ پکڑ کر پلنگ سے اٹھا چکا تھا۔ اسوہ توہین کے احساس سے جھلس کر رہ گئی۔

"سنا نہیں تم نے؟"

وہ زور سے پھنکارا۔

"میں باہر جاؤں گی تو اماں سمجھیں گی ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ زارا کے سامنے آکورڈ لگتا ہے"

وہ منمنائی تھی سکندر گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ ہر صورت اس سے نجات چاہ رہا تھا آج اس کا دل کچھ زیادہ ہی گستاخ ہو رہا تھا اس کی قربت میں اور وہ کسی حد کو پھلانگنے سے خائف تھا۔

"اچھا ہے وہ یہ سمجھیں۔ آنے والے وقت میں فیصلہ کرنے میں سہولت ہوگی"

وہ اتنا جھنجلایا ہوا تھا کہ غرا کر کہہ گیا۔ اسوہ نے دہل کر اسے دیکھا اور سخت روہانسی ہو گئی تھی۔

"پھر تو میں بالکل نہیں جا رہی ہوں"

وہ دھپ سے پلنگ کے کنارے ٹکی تھی۔ سکندر جو بستر پر نیم دراز ہو چکا تھا ہونٹ بھینچے اسے دیکھنے لگا۔

"میں آپ سے سوری کر چکی ہوں نا"

اس کی تیز نظروں سے خائف ہوتی وہ پھر منمنائی تھی۔ سکندر نے ایک دم غصے میں آتے اس کی لانبی چوٹی کو پکڑ لیا اور جھٹکا دیتے ہوئے بولا تھا۔

"سوری مسئلے کا حل نہیں ہے۔ سمجھیں؟"

"پھر اور کیا کروں؟"

وہ روہانسی ہونے لگی تھی۔

"مجھے اس کا نام بتاؤ جس کی وجہ سے تم نے مجھے ٹھکرایا"

اسوہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سکندر! اس دن مجھے کسی اور بات پر غصہ تھا۔ رئیلی!"

دو آنسو ٹوٹ کر اس کی پلکوں سے گالوں پر بکھر گئے۔ سکندر نے اس کے بال چھوڑ دیئے مگر وہ پھر بھی سرک کر دور نہیں ہوئی۔ اس کا کندھا جیسے پہلے اس کے گھٹنے سے لگا ہوا تھا ویسے ہی اب بھی لگا رہا۔ سکندر نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں اور سرک کر فاصلے پر ہونے کے بعد بستر سے اترنے لگا تھا جب اسوہ نے ایک دم سے اس کی کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی تھی۔

"اب کہاں جا رہے ہیں؟"

سکندر چونک کر متوجہ ہوا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی نگاہیں چار ہونے پر پلکیں لرزیں اور پھر جھک گئیں۔

پتا نہیں اس کے انداز ہی ہارے ہوئے تھے یا اسے لگا۔

"میں اگر کہوں کہ مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں تو......؟"

وہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہوا۔

سکندر!!!!

"منہ پر ہاتھ رکھے وہ سرد پڑ گئی تھی۔ اسے ابنِ زید کی بات یاد آئی جو انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہی تھی۔

"یکطرفہ محبت کا سفر محض پاگل پن کہلاتا ہے۔ محض سراب کا پیچھا۔ وہاں کوئی منزل نہیں آتی کبھی بھی، ایسے رشتے تتلیوں کی مانند خوشنما تو دکھائی دیتے ہیں مگر بہت جلد ہاتھوں میں آئی تتلیوں کی طرح سے بکھر کر فقط رنگ چھوڑ جاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ رنگ پھر چھپتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے اس راستے پر کبھی نہ چلو۔ اسوہ میں نہیں جانتا کہ تمہارے اور سکندر کے تعلقات کی نوعیت کیسی ہے مگر میں اتنا ضرور جان پایا ہوں کہ وہ تمہاری سنگت میں مطمئن نہیں ہو سکا اس کی وجہ یقیناً تم بہتر جانتی ہوگی۔ سکندر جیسا انسان بہت کم پر بھی شاکر ہونے والوں میں شمار ہوتا ہے میرا مشورہ ہے اس کے اس اضطراب کو ختم کر دو۔ وہ مقبوضہ کشمیر جہاد کے لیے جا رہا ہے۔ تمہارے پاس اگر

پچھتاوے رہ گئے تو ساری عمر ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔ اگر تم اس راستے پر نہیں چل سکتیں تھیں تو اسے انکار کر دیتیں۔ تمہارا یہ عمل گناہ کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ شادی شدہ عورت کی بدکاری کی سزا کنواری لڑکی سے دوگنی ہے۔ اور یاد رکھنا بد دیانتی صرف جسم کی ہی نہیں ہوتی نظروں اور سوچوں کی بھی ہوتی ہے'' اور وہ اتنی شرمندہ ہوئی تھی کہ ان سے نگاہیں چار نہیں کر سکی تھی۔ یہ بات سوچنا بھی حماقت تھا کہ سکندر نے انہیں اپنے تعلقات کی نوعیت بتائی ہوگی ہاں البتہ وہ اتنے معاملہ فہم ضرور تھے کہ خود سے قیاس کر سکتے۔ وہ اس روز سکندر کو اتنا ہرٹ کر چکی تھی اور یقیناً اب اسے خود پیش رفت کرنا تھی اس نے جھجک آمیز نگاہیں اٹھائیں۔ سکندر سگریٹ سلگا لینے کے بعد اپنا تکیہ اٹھا رہا تھا۔ یقیناً اب روز کی طرح نیچے بستر لگاتا۔

''آپ یہیں لیٹ جائیں سکندر''

وہ تیزی سے بولی تھی۔ سکندر نے تھم کر اسے دیکھا اور بغور جائزہ لیا۔

''اور تم!!!''

اسوہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا مگر اسے کرنا تھا۔

''میں بھی یہیں لیٹ جاؤں گی اگر آپ اعتراض نہ کریں تو''

اس نے پھنسی پھنسی آواز میں بامشکل کہا۔ گال سکندر کی نظروں کی تپش سے جیسے سلگنے لگے تھے۔

''اوکے فائن! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے''

وہ بڑے اطمینان سے کہتا واپس بستر پر آ گیا۔ اسوہ نے بے اختیار ریلیکس ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''چلو لیٹو اور میرے کاندھے پر سر رکھو''

وہ اب بھی اسی پرسکون انداز میں گویا ہوا تھا۔ اسوہ کے چھکے چھوٹنے لگے۔

''جی!!!'' وہ بوکھلائی تھی۔

''ایک بستر پر سونے والے مرد عورت آپس میں میاں بیوی ہوتے ہیں ہمارے مہذب معاشرے میں اور میاں بیوی میں اتنی بے تکلفی تو ہونی چاہئے نا'' اس بے تکلفی پر آپ برا تو نہیں مانیں گی میڈم!

سکندر نے اسے پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹایا تھا اور اس پر جھک کر اسی سنجیدگی سے بولا جبکہ آنکھیں اس سنجیدگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ وہ اس کی شکست کو پا گیا تھا اور اس سے بڑھ

کر اسے جھکانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس لڑکی کی عزت ہی نہیں انا بھی اسی قدر عزیز تھی۔ اسوہ کا وجود اس کی قربتوں کی آنچ سے سلگ کر انگارہ تو ہوا ہی تھا دھیرے دھیرے کانپنے بھی لگا۔

''بے تکلفی کے اس دائرے کو وسیع کیا جا سکتا ہے میم!؟''

وہ اس پر جھک کر آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مچلتی مسکان لیے بولا تو اسوہ کانوں کی لوؤں تلک سرخ پڑ گئی تھی اور اس جھینپ میں اس نے ہاتھ کا مکا سکندر کے شانے پر زور سے مارا تھا۔

''بہت بدتمیز ہیں آپ! اب اس طرح سے میرا مذاق اڑائیں گے؟''

وہ ناز سے اٹھلائی تھی اور سکندر ہنستا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

پچھلے تین گھنٹوں سے وہ ایک تاریک کمرے میں قید تھا۔ شاید اس کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی حبس اور گھٹن سے اسے اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے یہاں پھینکنے سے قبل ٹھگنے سانڈ کے پالتو ساتھی اس کی تلاشی لینے کے بعد اس کا قیمتی قلم و موبائل فون اور ایک عدد چھوٹی نوٹ بک کے علاوہ جو تھوڑی بہت رقم تھی اپنے قبضے میں کر چکے تھے یہاں تک کہ اس کی پنڈلی سے بندھا اس کا وہ جدید پسٹل بھی۔ اس وقت وہ بالکل نہتا تھا اور دل میں خدا کو یاد کرتا تھا۔

معاً دروازے کے باہر کھڑ بڑ اور قدموں کی چاپ ابھری وہ چونکا نہیں البتہ منتظر نظروں سے دروازے کو تکنے لگا۔ صالح کا بے بس، لاچار وجود اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں بس چکا تھا۔ گاہے بگاہے بھیگتی آنکھوں کو ہاتھوں کی پشت سے پونچھتا وہ کسی طرح بھی خود پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ بند دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا فارنر لڑکا شہد رنگ اور سنہرے گھنگریالے بالوں والی نازک اندام دلکش سی لڑکی کے ساتھ اندر آ گیا۔ لمبا تڑنگا لڑکا وہیں دروازے کے پاس رائفل سنبھالے چوکنے انداز میں ٹھہر گیا تھا جبکہ لڑکی ٹرے سمیت اس کے نزدیک جھک کر کھانا اسے پیش کرنے لگی۔

''یہ کھانا کیسے کھا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں''

لڑکی نے انگلش میں اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے الجھن بھرے انداز میں کہا تھا۔

''اس کے ہاتھ نہیں کھلیں گے۔ تم اسے کھانا کھلا دو''

وہ کرخت اور بھاری گونجدار آواز میں بولا تھا۔

''مجھے باہر نکالو۔ کیوں رکھا ہوا ہے یہاں؟''

محب عبدالقدوس ضبط کھو کر چلایا تھا۔

''تمیز سے بات کرو سمجھے؟ اور کھانا کھاؤ انسان بن کر یاد رکھو یہ کھانے ہم ہر کسی کو پیش نہیں کیا کرتے''

لڑکے نے آنکھیں نکال کر غرانے کے انداز میں جتلا کر کہا۔

''اس عنایت پر مجھے افسوس ہے میں تھینکس نہیں کہہ سکتا۔ مجھے کھانا نہیں کھانا''

اس نے پہلے لڑکے کو طنزیہ انداز میں جواب دیا تھا پھر نوالہ اپنے منہ کے قریب لاتی لڑکی کو ٹوکا تھا۔

''اس کھانے میں زہر نہیں ملا ہوا۔ ہمارا مقصد تمہیں قتل کرنا نہیں ہے۔ یوں بزدلوں کی طرح مارنا ہمارا شیوہ ہے بھی نہیں''

لڑکے نے کاٹ دار تیکھے لہجے میں پھنکار کر کہا تھا محبّ عبدالقدوس نے جواباً اسے زہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بزدلی کی ڈیفی نیشن تمہارے نزدیک کیا ہے مجھے بتانا پسند کرو گے؟ ایک انسان کو نہتا کر کے اسے بہیمانہ انداز میں تشدد کر کے مار ڈالنا بہادری کے زمرے میں بھی نہیں آتا''

لڑکے کے نقوش اس عزت افزائی پر تن کر رہ گئے تھے۔ جبھی وہ حلق کے بل غرایا تھا۔

''تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہو بگ باس سے کہنا۔ ہمارا کام بس یہیں تک تھا چلو سویٹی!''

اور سویٹی جو دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے اک محویت اور بے خودی کے عالم میں محبّ کو دیکھنے میں گم تھی ہڑبڑا کر چونکی پھر کچھ کہے بغیر ناک کی سیدھ میں چلتی باہر نکل گئی البتہ دروازے سے نکلنے سے قبل اس نے گردن موڑ کر محبّ عبدالقدوس کو دیکھا تھا اور بے باکی سے مسکرائی تھی۔

''تم اگر ایک ٹائم کا تو کیا کسی ٹائم بھی کھانا نہیں کھاؤ گے تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ضد نہ کرو اور کھا لو کیا میں تمہارے ہاتھ کھول دوں اگر تم مجھ سے کھانے میں متامل ہو؟''

فارنر لڑکا جا چکا تھا جب اس نے بظاہر ہمدردانہ انداز میں محبّ کو یہ آفر کی تھی۔ محبّ عبدالقدوس محض اسے گھور کر رہ گیا۔

''سنو تمہاری شکل کچھ شناسا سی لگتی ہے جیسے کہیں پہلے بھی تمہیں دیکھا ہو''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے''

اب کی مرتبہ وہ انتہائی بدمزگی اور ناگواری کا مظاہرہ کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا لڑکی کا چہرہ لٹک گیا وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس گئی تھی۔ محبّ عبدالقدوس کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ، کچھ نہ کہو خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو، ہاں اے لوگو خاموش رہو
سچ اچھا پر اس کے جلو میں، زہر کا ہے اک پیالہ بھی
پاگل ہو، کیوں ناحق کو سقراط بنو خاموش رہو
حق اچھا پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پر چڑھو خاموش رہو
ان کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر سورج کو ہی گھومنے دو خاموش رہو
مجلس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن بجتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو
گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو اور سیر کرو خاموش رہو
آنکھیں موند کنارے بیٹھو دل کے رکھو بند کواڑ
انشاء جی لو دھاگہ لو، لب سی لو خاموش رہو

وہ اتنی ہی بےزار تھی جتنی آج کل عموماً رہا کرتی، کچھ طبیعت بھی خراب تھی۔ زینی اور پھپھو کے علاوہ دادو کے گھر میں بھی اس کے حوالے سے اس خوشخبری نے خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ جبکہ وہ اپنے دل کا بھید نہ پاتی تھی۔ غلام حسین نے عجیب کھیل کھیلا تھا اس سے، اس کا دعویٰ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ وہ اسے اپنی شخصیت کے سحر اور محبت میں گرفتار کر کے خود اس سے غفلت برتنے لگا تھا۔ بے مائیگی اور پامالی کا احساس اسے اس وقت سے جکڑے تھا جب سے پھپھو اور زینی اس سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔ اسے لگتا غلام حسین نے دانستہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ اس کا پندار ریزہ ریزہ کرنے اور مان توڑنے کو۔ اب وہ یقیناً اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ دل ایسی ہی سوچوں اور کفیات کے سنگ بے حد ملول اور رنجیدہ تھا جب زینی اس کے پاس چلی آئی تھی مگر اسی ڈپریشن اور ہیجانی کیفیت میں اس نے روتے ہوئے زینی کو بھی سخت سُست سنا دی تھیں۔ زینی بدحواس ہو کر نیچے پھپھو کو بلانے دوڑی تھی کہ اسی گھبراہٹ میں اوپر آتے مستقیم سے بری طرح ٹکرا گئی۔

''افوہ دھیان سے، خیریت کہاں بھاگی جا رہی ہیں؟''

مستقیم نے اسے بازوؤں سے سنبھال کر فاصلے پر کرتے ہوئے اپنے ہاتھ ہٹا لیے تھے اور نرمی سے استفسار کیا تھا۔

زینی جو اس تصادم پر چکرا گئی تھی اسے روبرو پا کے ایک دم خجل نظر آنے لگی۔

''آپ کب آئے؟''

''ابھی ابھی، کیوں اچھا نہیں لگا تو واپس چلا جاتا ہوں''

مستقیم کو شرارت سوجھ رہی تھی۔ اسے روبرو پا کے اسے اپنے ذہن پر چھایا اضطراب کا احساس دھیما پڑتا محسوس ہوا تھا۔

''مم میں نے ایسا کب کہا۔ جب سے بھائی گئے ہیں آپ تو بالکل راستہ بھول گئے ہیں یہاں کا''

شکوہ بے اختیار لبوں سے نکل گیا تھا اور احساس اسے اس وقت ہوا جب مستقیم کی متبسم لودیتی نظروں نے اس کے چہرے کو دہکایا تھا۔

''اس کا مطلب آپ میرے جانے آنے کا حساب کتاب رکھتی ہیں۔ زہے نصیب!''

زینب کی پلکوں پر لرزش اتری تھی اور ہونٹ اس نے خفت زدگی کے عالم میں دانتوں تلے دبایا تھا پھر بات کا رخ دانستہ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''بھائی سے آپ کا کانٹیکٹ ہے؟ ابھی میں بھابی کے پاس سے آئی ہوں وہ بہت اپ سیٹ ہیں ان کی وجہ سے''

بات ایسی تھی کہ مستقیم ایک دم سنجیدگی کے حصار میں آ گیا''

''میں دیکھتا ہوں اسے''

زینب نے وہیں رک کر اسے اوپر جاتے دیکھا پھر کچن کی سمت چلی گئی۔ مستقیم کے لیے چائے بنانے کا ارادہ تھا۔ وہ جانتی تھی مستقیم کو اس کے ہاتھ کی چائے پسند ہے۔

مستقیم دستک دے کر اندر داخل ہوا تو دیا آنسو پونچھ کر فارغ ہوئی تھی اسے دیکھ کر بے ساختہ قسم کی خفگی سمیت منہ پھیر لیا۔ مستقیم آہستگی سے مسکرایا تھا۔

''خفا ہو مجھ سے، بٹ وائے؟''

کرسی بیڈ کے نزدیک گھسیٹ کر وہ بظاہر سنجیدگی سے بولا تھا۔

''اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی۔ آپ تو مجھے سر سے بوجھ کی طرح سے اتار کر فارغ ہو بیٹھے ہیں نا''

مستقیم نے حیرت سے اسے دیکھا پھر آنکھیں سکیڑ کر مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

''ارے ارے غلام حسین کا غصہ مجھ پر کیوں نکال رہی ہو لڑکی!''

اور اس کے نام کے ساتھ ہی دیا کے دل کا بوجھ اور آنکھوں کی نمی ایک دم سے بڑھ گئی تھی۔

''میں نے کہا بھی تھا آپ سے وہ مجھ سے لازماً اپنی توہین کا بدلہ لیں گے۔ وہی ہوا نا''

اس نے بری طرح سے روتے ہوئے کہا تھا۔ مستقیم گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

''غلام حسین کو پتا چلے کہ تم اس کی خاطر چھکوں پھکوں رو رہی ہو تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگا آئے گا اور سنو میں نے تو اس کے علاوہ بھی ایک اور اہم بات کہی تھی وہ بھی تو پوری ہو چکی''

''کون سی بات؟''

دیا نے ہچکی بھر کے آنسو گالوں سے رگڑ کر صاف کیے

''یہی کہ وہ محبت کرنا ہی نہیں کروانا بھی جانتا ہے۔ دیا ڈونٹ وری گڑیا وہ تمہیں جان بوجھ کر نظر انداز نہیں کر رہا ہے، بہت بزی ہے۔ اس کا سیل فون بھی گم ہو گیا تھا۔ مجھے بتایا تھا اس نے''

جو صورتحال تھی اس میں مستقیم کو تھوڑی سی جھوٹ کی ملاوٹ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنی پڑی تھی۔

''یہ بات وہ صرف آپ کو ہی کیوں بتا پائے بھلا''

دیا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تو مستقیم کو اسے زچ کرنے اور ستانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

''تم جیلس ہو رہی ہو؟ دوست ہے میرا وہ''

اس کے روہانسی ہو جانے پر وہ ہنستے ہوئے اس کا سر تھپک رہا تھا جب چائے کے لوازمات سے سجی ٹرے لیے زینب اندر داخل ہوئی تھی اسے قدرے ریلیکس دیکھ کر طمانیت سے مسکرائی۔

''اوہ تھینک گاڈ! ویسے مجھے کچھ تو اندازہ تھا کہ آپ انہیں سنبھال سکتے ہیں''

''تو اس کا مطلب تم نے بھائی کو بلوایا؟''

''دیا اب اس پر چڑھائی کو تیار تھی۔ زینب بری طرح سے ٹپٹائی۔

''دیا! کم آن گڑیا! میرے ان سے مراسم اتنے بھی گہرے نہیں ہیں بہر حال!''

مستقیم نے اسے سرزنش کی تھی۔ دیا چونک کر اسے تکنے لگی پھر گہرا سانس بھر کے اس پر گرفت کر لی تھی۔

''یعنی ہیں تو سہی مراسم! آپ لوگ شادی کے معاملے پر اتنے غیر سنجیدہ کیوں ہیں؟''

دیا نے اہم سوال اٹھایا تھا۔ جو بھی تھا فی الحال اس کا ذہن واقعی ریلیکس ہوا تھا۔ مستقیم نے ایک نگاہ زینب کے سرخ چہرے اور جھکی لرزتی پلکوں کو دیکھا تھا پھر کاندھے اچکا دیئے۔

''کس نے کہا غیر سنجیدہ ہوں کوئی ہم سے پوچھتا ہی نہیں۔ غلام حسین ہے اس کا وہ حساب کہ مطلب نکل گیا تو پہچانتے نہیں......''

مستقیم خلافِ عادت ومزاج شوخ ہو رہا تھا۔ جہاں زینب کے چہرے کی تمتماہٹ بڑھی دیا نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''کیا مطلب؟ آپ سنجیدہ ہیں تو میں دادو سے بات کر لیتی ہوں۔ اس سے پہلے تو آپ بات بھی نہیں سنتے تھے ہماری''

خوشی سے معمور ہو کر کہتی وہ آخیر میں کچھ جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی تو مستقیم گڑبڑا سا گیا تھا۔

''کم آن لڑکی حدِ ادب! کیوں ہونے والی گورنمنٹ کے سامنے امیج خراب کرنے پر تلی ہو۔''

وہ مخاطب تو دیا سے تھا مگر ترچھی نظروں کا زاویہ زینب کے لحہ بہ لحہ سرخ ہوتے چہرے پر فٹ تھا۔ جو اسے چائے کا مگ تھما کر اگلے لمحے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ پلٹ کر باہر چلی گئی تھی۔ مستقیم ٹھنڈا سانس بھر کے دیا کو تکنے لگا جو خوش گوار سی کیفیت میں مبتلا بہت دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کر دیا نا سفارتی تعلق خراب! مجھے لگتا ہے وہ مشکوک ہو گئی ہے''

مستقیم نے مصنوعی خفگی سے منہ لٹکا کر کہا تو دیا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''خفا ہو گئی ہے تو منالیں جا کر''

اتنے وافر مقدار میں حقوق کہاں ہیں ابھی میرے پاس!

اس نے پھر سرد آہ بھری تھی وہ بھی مصنوعی۔ دیا اور زیادہ کھلکھلائی تھی۔ پھر خاصی تاخیر کے بعد جب مستقیم واپس جا رہا تھا تو زینب اسے لان میں پودوں کو پانی دیتی ہوئی مل گئی تھی۔

''دیا کا خیال رکھا کرو زینب! مجھے لگتا ہے وہ یہاں تنہائی کا شکار ہے''

زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ تمام نرم گرم جذبے جو پوری شدتوں کے ساتھ کچھ لمحے قبل اس کی نگاہوں میں وہ دیکھ چکی تھی اب ایک گہری سنجیدگی کی مخصوص چادر تلے جا چھپے تھے۔ چھپ گئے تھے یا تھے ہی نہیں۔ شاید اس نے اپنی بہن کی خاطر یہ سب کیا تھا۔ اسے خوشی دینے کی خاطر۔ اس نے سوچا اور ایک دم افسردہ ہو گئی۔ یہی انعام تھا اس کی سالہا سال کی محبت کا، پُرخلوص

جذبوں کا۔ ہونٹ بھینچے وہ سود و زیاں کے حساب میں الجھی ہوئی تھی جب مستقیم کی آواز پر چونک کر متوجہ ہوئی تو آنکھوں کی سطح نمی سمیٹ لائی تھی۔

''میری کوئی بات بری لگی ہے زینی!''

مستقیم نے اس کی خاموشی کو خصوصیت سے نوٹس کیا تھا۔

''نہیں آپ نے ایسی کوئی بات ہی کب کی ہے''

وہ دل گیری کے احساس میں مبتلا پائپ پھینک کر نل بند کرنے لگی۔ مستقیم نے دھیان سے اسے دیکھا تھا۔

''دیا کا خیال ہے میں نے تمہیں خفا کر دیا ہے اور مجھے اب تمہیں منانا چاہئے۔ مگر میرا خیال ہے فی الحال میرے پاس تمہیں منانے کے جائز حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس کام کو میں آنے والے وقت کے لیے اٹھا کر رکھ رہا ہوں جب تمام حقوق میری دسترس میں ہوں گے، ٹھیک ہے نا؟''

زینب نے ٹھٹک کر اسے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ انہی لو دیتے جذبوں کے احساس سمیت وہ بری طرح سے خفیف ہوتی جھینپ گئی تھی۔ مستقیم بھی ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆

اسوہ نے کچن سے نکل کر صاف ستھرے آنگن پر تیزی سے پھیلتی دھوپ کو دیکھا۔ اماں تخت پر بیٹھی دوپہر کے سالن کی تیاری سبزی کاٹنے سے شروع کر چکی تھیں۔

''سکندر نہیں اٹھے اماں؟''

اس نے سیڑھیوں پر دم سادھے اپنی چمکتی آنکھوں سے اپنی سمت دیکھتی بھوری بلی کو دیکھ کر اپنے پیچھے کچن کا دروازہ بند کر کے اماں سے سوال کیا تھا۔

''نہیں ابھی تک سو رہا ہے۔ اٹھایا بھی تھا میں نے''

انہوں نے پالک کا پتہ جھاڑا اور گٹھی بنا کر چھری اٹھا کر کاٹنے لگیں۔ اسوہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اندر آ گئی۔ سکندر بیدار ہو چکا تھا اب پلنگ کے کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لیتا کسی سوچ میں گم تھا۔

''صبح اٹھتے ہی اسموکنگ شروع کر دی ہے اور کچھ نہیں ملا کھانے کو!''

اس نے آتے ہی سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھینا تھا۔ سکندر چونکا پھر ایک دم اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔

''کیا کروں میری بیوی میرا بالکل خیال نہیں رکھتی ہے یار''

وہ اس کی موٹی سی لٹ کو کھینچ کر ہنسا تھا۔ اسوہ نے خفگی بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''آفس کیوں نہیں گئے ہیں آپ؟''

''کیا مجھے آفس جانا تھا؟''

سکندر نے آنکھیں پھیلا کر معصومیت کی انتہا کر دی۔ اسوہ چیخ پڑی تھی۔

''سکندر بدتمیزی نہیں کریں۔ آپ اخبار کا آفس پھر سے جوائن کر رہے ہیں میں بتا رہی ہوں آپ کو''

اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ فاصلے پر ہوتی ہوئی اپنی بات پر زور دے کر بولی تھی۔ سکندر نے کچھ الجھ کر بہت دھیان سے اسے دیکھا۔

''میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں اسوہ''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ تو اسوہ نے کچھ دیر ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا تھا۔ پھر کچھ کہے بغیر پلٹ گئی۔

چند منٹ بعد وہ اس کے لیے ناشتہ بنا کر لائی تھی اور ٹرے اس کے آگے رکھ دی۔

''ناشتہ کریں''

''تم کر چکی ہو؟''

سکندر کی سوالیہ نگاہیں اٹھیں مگر وہ ان سنی کیے کمرے کی صفائی میں مشغول ہو چکی تھی سکندر نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر ہاتھ پکڑ کر نرمی سے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

''خفا ہو؟''

اس کی نظریں بہت تفصیلی انداز میں اسوہ کے ضبط میں سرخ پڑتے چہرے پر جمی تھیں۔

''میں نہیں سمجھتی کہ مجھے اس کا حق حاصل ہے''

دو آنسو ٹپکے تھے اور اس کے ہاتھوں کو نم کر گئے۔ سکندر کے اندر بے چینی اور اضطراب بکھر گیا تھا۔

''اب اس قسم کی باتیں کر کے مجھے پریشان کرو گی تم؟''

وہ عاجز سا ہو چکا تھا۔

''میں سمجھتی تھی اب آپ اپنا ارادہ بدل لیں گے''

''کیا مطلب اب کیا ہوا؟''

گو کہ سکندر اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر اسے چھیڑنے کو بولا ہونٹوں کے گوشوں میں مچلتی مسکراہٹ اور آنکھوں کی شرارت وشوخی وہ جھکا سر ہونے کی بدولت دیکھ نہیں پائی تھی جبھی اس جھانسے میں آ گئی۔

''آپ خفا تھے نا مجھ سے میں نے منا لیا تھا۔ اسی لیے تو منایا تھا کہ آپ نہ جائیں''

انگلیاں مسلتے وہ سخت روہانسی اور کنفیوژ ہو کر کہہ رہی تھی۔ سکندر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔

''اچھا تو اس لیے منایا تھا تم نے مجھے۔ لڑکی اتنی مطلبی ہو تم مجھے ہرگز نہیں پتا تھا''

وہ بے حد کڑے انداز میں بولا تو اسوہ نے گھبرا کر اسے دیکھا تھا پھر اسے ہنستے پا کر سخت بھنا گئی۔

''آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟ اب بات بھی نہیں کروں گی میں''

وہ بری طرح سے بگڑی تھی۔ سکندر نے بوکھلا کر تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''یار تم اتنی معصوم کیوں ہو آخر کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے جھانسا دے جاؤں؟''

''آپ ادھر ادھر کی باتیں نہ کریں مجھ سے سمجھے؟ مجھے بھی اتنا تو علم ہے کہ اگر بیوی شوہر کو جہاد کی اجازت نہ دے تو وہ نہیں جا سکتا یہ میں اپنے پاس سے نہیں کہہ رہی مذہب کا حوالہ دے رہی ہوں۔ اوکے؟'' خود سوچ لیں اگر وہ کام جو آپ اللہ کے لیے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے احکامات کو پورا کرتے ہوئے نہ کیا تو اس کی قبولیت کیسے ہو سکے گی۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی۔ جتلاتی ہو مسکراہٹ اس پر اچھال کر کمرے سے نکل گئی سکندر مضطرب سا ہونٹ بھینچے ساکن بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

راہِ جنوں پر چل پڑے جینا محال کر لیا
ہم نے تلاش یار میں خود کو نڈھال کر لیا
اپنی بھی کچھ خبر نہیں دل کی بھی کچھ خبر نہیں
ہم نے تمہارے ہجر میں کیسا یہ حال کر دیا

انتظار کی کیفیت چاہے کتنی ہی جان لیوا کیوں نہ ہو ہمیشہ موم کی مانند پگھلاتی اور جان لیوا ثابت ہوا کرتی ہے۔ اسے تو وہاں محصور ہوتے چھتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ یہ بھی اندازہ ہرگز نہ کر پاتا اگر اس کی کلائی پر اس کی رسٹ واچ نہ ہوتی۔ اسے حیرانی ہوئی تھی جہاں ان لوگوں نے

اس کی ہر چیز ہتھیالی تھی یا یہ کیسے چھوڑ دی یا شاید ان کے نزدیک اس عام سی رسٹ واچ کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں تھی۔ اس سوچ کے ساتھ اس نے سر جھٹک دیا تھا۔

مگر یہ دل کو تسلی دینے والی بات تھی اور محبّ عبدالقدوس جیسا زیرک اور جینئس بندہ کسی بھی بات کو سرسری انداز میں سوچنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ لازماً اس امر پر بہ نظر غائر سوچتا اگر اس وقت دروازہ پر کھٹکا نہ ہوا ہوتا۔ لاک کھلنے کی مخصوص آواز اور دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ روشنی کا گردش کرتا ہوا ہالہ، وہ جان گیا آنے والے کے ہاتھ میں ٹارچ ہے۔ باریک ایڑی کی ٹک ٹک سے گویا اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسے تھے۔ سویٹی کے وجود اور اس کی آمد سے وہ اب خائف ہونے لگا تھا۔ ان چھتیس گھنٹوں میں یہ اس کی چوتھی مرتبہ آمد تھی اور وہ ہر بار اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اوچھی حرکتوں اور قابل اعتراض حد تک بے باکی کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ محبّ عبدالقدوس نے گو کہ ہر بار اس کی ٹھونک بجا کر توہین کی تھی اور بری طرح سے جھٹک کر خود سے دور کر دیا تھا۔ مسلمان ہمیشہ دشمن کے اس گھٹیا اور شیطانی وار کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ مکہ میں نبی کریم ﷺ کو اسلام کی تبلیغ سے روکنے کو بھی یہ آفر ہوئی تھی، حضرت یوسفؑ اس آزمائش سے گزرے تھے یہ ازل سے روایت چلی آ رہی تھی مردِ مومن وہی ہوتا ہے جو اس شیطانی جال میں پھنسے بغیر سرخروئی سے نکل آئے۔ محبّ عبدالقدوس بھی خدا سے اس آزمائش میں سرخروئی کی التجا کرتا رہا تھا۔ ٹارچ کا گھومتا ہوا روشنی کا ہالہ براہ راست اس کے چہرے پر ڈالا گیا۔ محبّ عبدالقدوس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر آنکھوں کو اس تکلیف دہ روشنی کے حصار سے محفوظ کیا تھا۔ تبھی اسے سویٹی کی جھنکار جیسی ہنسی سنائی دی تھی۔

”کتنے چارمنگ ہو تم! میں محبت کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں تم سے۔ سنو اتنے ضدی اور انا پرست کیوں ہو؟ میں عورت ہو کر تمہیں اپنا آپ پیش کر رہی ہوں اور تم......“

”بہتی ہوئی ندی میں ہاتھ ڈال کر ہر کوئی فیض اٹھانے والا نہیں ہوتا اور مجھے ایک بات بتاؤ تمہیں شرم نہیں آتی خود کو اس حد تک سطح سے نیچے گراتے“

وہ ایک دم پھٹ پڑا تھا۔ سویٹی کا چہرہ پہلے سرخ ہوا پھر پھیکا پڑ گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی سے محبت نہیں ہے۔ کچھ تو خود پر رحم کھاؤ“

اس نے ٹارچ ایسے زاویئے سے رکھ دی کہ اب اس کی روشنی محبّ عبدالقدوس کے لیے پریشان کن نہیں رہی تھی اور سویٹی اس کے تمام نقوش کو براہ راست نگاہ کی زد پر بھی رکھ سکتی تھی۔

”تم اپنی بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ اٹھ کر“

آج وہ ساڑھی میں ملبوس تھی جس کے سلیولیس نیٹ کے بلاؤز کا گلا قابل اعتراض حد تک گہرا تھا۔ باریک پلو اس نے رسی کی طرح لپیٹ کر گلے سے چمٹایا ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنے شیطانی منصوبے کے ساتھ پوری تیاری کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔ محبّ عبدالقدوس نے تب سے دانستہ اسے نہیں دیکھا تھا مگر جب وہ خود آ کر اس سے چپک کر بیٹھی تو وہ کسی طرح بھی خود پر ضبط نہیں کر سکا تھا اور پھٹ پڑا تھا۔

ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی
مجبور تھے ہم بھی، اس سے محبت بھی بہت تھی
واقف ہی نہ تھا اسم محبت سے وہ ورنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی
یوں ہی نہیں مشہور زمانہ میرا قاتل
اس شخص کو اس فن میں مہارت بھی بہت تھی

وہ اس جھاڑ کے نتیجے میں اس سے فاصلے پر تو چلی گئی مگر ڈھیٹ یا شرمسار ہوئے بغیر اسی فدا ہونے والے انداز میں اشعار اس کی جانب لڑھکائے تھے۔ محبّ عبدالقدوس ہونٹ بھینچے نگاہ کا زاویہ بدلے دیوار کو گھورتا رہا۔

”خود کو اتنا خاص بنا کر پیش کرو گے تو پچھتاؤ گے محبّ عبدالقدوس!“

اس نے گویا اسے چیلنج کیا تھا۔ محبّ عبدالقدوس کے ہونٹوں پر زہرخند پھیل گیا۔

”فضول دھمکیوں سے خائف ہونے والا ہوتا تو اس وقت یہاں نہ بیٹھا ہوتا“

وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ سویٹی خاموش منجمد نظروں سے اسے تکتی رہی تھی پھر اس خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔

تب محبّ عبدالقدوس نے گہرا سانس بھر کے خود کو ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

☆☆☆

بہت کچھ اور لکھنے کی تمنا تھی
مگر میں کیا کروں کہ موسمِ جاں کو
ہنر مندی کے لمحے کم میسر تھے
ابھی میں نے قلم پکڑا تھا ہاتھوں میں
ابھی تو پیاس بھی قرطاس کی بجھنے نہ پائی تھی

ابھی لفظوں کو میرے آئینہ پوشاک ہو کر
تیرگی کی بدگماں دہلیز پر
خورشید کی صورت اترنا تھا
ابھی تو میری تحریروں کو تازہ روشنی بن کر بکھرنا تھا
مگر میں کیا کروں کہ موسمِ جاں کو
ہنرمندی کے لمحے کم میسر تھے

اس نے ایک گہرا سانس کھینچا اور تھکے ہوئے انداز میں ابنِ زید کو دیکھا تھا۔

''مجھے بتائیں اب میں کیا کروں؟''

''اسے منالو سکندر بابا! یہ کوئی اتنا بڑا ایشو تو نہیں ہے۔''

وہ نرمی و آہستگی سے مسکرائے تھے۔

''وہ نہیں سنتی۔ مذہب کو بیچ میں لے آئی ہے''

''مذہب تو ہمیشہ بیچ میں رہتا ہے سکندر بابا! آپ شاید اسی اہم نقطے پر غور نہیں کر سکے''

ابن زید نے تصحیح کی تھی وہ خجل سا ہو کر مسکرایا۔

''مجھے ہر صورت جانا ہے ابنِ زید! بتائیں نا کیا کروں؟''

''نبی کریم ﷺ کسی غزوہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ تب حضرت عائشہ صدیقہؓ مان نہیں رہی تھیں یعنی انہیں جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے اس رات کھانا تناول فرماتے ہوئے اپنے دستِ مبارک سے ایک نوالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے منہ میں ڈال دیا مقصد ان کی رضامندی حاصل کرنا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ شرما گئی تھیں اور انہیں خوشی سے جانے کی اجازت دے دی''

''سبحان اللہ!''

سکندر جو بے حد دھیان سے ان کی بات سن رہا تھا بے ساختہ مسکرایا۔

''آپا مان گئی ہیں سکندر بابا!''

''میں خود حیران ہوں جب انہوں نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ناراضی وغیرہ کا خدشہ مجھے ان کی طرف سے تھا''

''کشمیر سے تعلق بندھا ہوا ہے۔ وہ انکار کیسے کر سکتی تھیں سکندر بابا! یہاں کے لوگ جہاد کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ ہیں''

ابنِ زید نے ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔

''تو اسوہ کا تعلق بھی تو کشمیر سے ہے نا ابنِ زید!''

''ابھی نئی شادی ہوئی ہے نا۔ وہ تمہیں کھونے سے خائف ہو گی''

ابن زید نے اب کے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ خجل سا ہو کر سر کھجانے لگا۔

''میں تو جیسے وہاں جاتے ہی مارا جاؤں گا نا۔ اتنے اچھے نصیب نہیں ہیں کہ شہادت کے درجے پر فائز ہو جاؤں''

''تم خود سے اور نصیب سے اکثر شاکی رہتے ہو سکندر بابا اور یہ بے حد بری بات ہے۔ تمہاری قسمت کے اچھا ہونے کے لیے اس سے بڑھ کر بھی کوئی دلیل ہے کہ تم مسلمان ہو۔ قرآن پاک میں خدا فرماتا ہے۔ ''اور بہت کم ہیں انسانوں میں سے شکر ادا کرنے والے'' میری جان ہمیں اس بات پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ خدا نے ہمیں انسان بنایا اور ہمیں مسلمان پیدا کیا۔ ہمیں آخری نبی ﷺ کے اُمتی ہونے کا شرف بخشا اور ہمیں اہلِ تشیع نہیں بنایا''

سکندر بے حد خفت زدہ نظر آنے لگا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں ابن زید! میں نے ان پوائنٹس پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ خدا مجھے معاف فرمائے اور شاکر ہونے، شاکر رہنے کی توفیق بھی آمین! آپ مجھے محبت کے بارے میں اس دن کچھ بتا رہے تھے نا؟''

''کیا؟'' ابن زید نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''یہی کہ وہ کسی سے ملتا نہیں ہے۔ میری بہت شدید خواہش تھی کہ میں ایک بار تو ضرور اسے دیکھتا''

''کچھ خواہشیں اتنے غیر محسوس انداز میں پوری ہو جاتی ہیں کہ انسان ان کی اہمیت کا احساس تک نہیں کر پاتا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کبھی کسی بھی حوالے سے دوسروں کو خود سے کمتر نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ تکبر دنیاوی و آخروی نقصان کا باعث بن سکتا ہے''

ابن زید کے فلسفیانہ جواب نے سکندر کو صحیح معنوں میں الجھا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا مطلب میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں ابن زید!''

جواباً ابن زید نے مبہم سی مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا پھر شانے جھٹک دیئے تھے ''اس بات کو وقت پر چھوڑ دو، وقت اس کا جواب خود تمہیں دے دے گا''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

سکندر نے منہ پھلا لیا تھا۔ پھر وہ ان سے مسلسل اصرار کرتا رہا مگر انہوں نے کچھ اگل کر نہیں دیا تو سکندر کو ہی ہار تسلیم کرنی پڑی تھی۔

☆☆☆

غموں کی جو فصیل ہے
وہ اس قدر طویل ہے
غضب تو یہ ہے کہ اک نہیں
فصیل در فصیل ہے
تم اس کی ہر منڈیر پر
آرزوؤں کے تیل سے
چراغِ دل جلاؤ نا
ذرا سا مسکراؤ نا

وہ اس وقت کشمیر کی خوبصورت برف پوش پہاڑیوں پر کھڑا تھا۔ یہ لداخ کا علاقہ تھا۔ لداخ کو چھوٹا تبت بھی کہا جاتا ہے۔ چاند کی سرزمین سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ ''شنگریلا'' بھی کہتے ہیں۔ ''شنگریلا'' پاکستان کا وہ خوبصورت اور شاندار تفریحی مقام ہے جو بلوچستان کے دارالحکومت ''سکردو'' میں واقع ہے۔ اس قدرتی حسن کی وجہ سے لداخ کو بھی شنگریلا کہا جاتا ہے۔ یہ ''کوہ ہمالیہ'' میں ہے اور اس کا دارالحکومت ''لیہ'' ہے۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سری نگر سے کارگل تک سڑک کارپٹ ہے جو تقریباً تیس فٹ چوڑی ہے۔ سری نگر اور کارگل کے درمیان زوجیلہ پہاڑی ہے اور اس کے بعد ''تورتک اور بٹالک'' کی چوٹیاں ہیں اور اس وقت وہ اپنے دیگر مجاہدین ساتھیوں کے ہمراہ انہی چوٹیوں پر کھڑا تھا۔ وہ جنگی تربیت یافتہ تھا جبھی یہاں اسے تربیت کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کی ٹانگ کی وجہ سے اسے مشکل مشن پر ساتھ نہیں لے جایا جاتا تھا مگر ابنِ زید ہر کام میں اپنے آپ کو پیش پیش رکھا کرتا تھا۔ جذبۂ جہاد اور شہادت سے سرشار وہ ایک خاموش طبع نوجوان تھا جس نے بہت جلد اپنی عادات کی وجہ سے اپنے امیر اسد اللہ کے دل میں خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ انہیں غیر معمولی حسن کا مالک یہ نوجوان جس کی کشادہ پیشانی سے روشنیاں سی نکلتی محسوس ہوتی تھیں اور شہادت کی خواہش اور آرزو ہمہ وقت جس کی آنکھوں میں مچلتی نظر آتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک عجب سحر تھا اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ پیشانی پر سجدہ کا نشان اس کی شب بیداریوں کا گواہ تھا۔ وہ ''اسرہ

استقامت'' میں تہجد کی نماز کے لیے سب سے پہلے اٹھتا تھا۔ ایک ٹانگ سے معذوری کے باوجود اس کے جسم میں گویا پارہ بھرا تھا ہر لحہ بے قرار مضطرب۔ کیمپ کی سخت ٹریننگ کے دوران ایک بار بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں دیکھی گئی تھی۔ اپنے ملک سے میلوں دور وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے یہاں کھینچ لایا تھا وہ کون سا رشتہ تھا جس میں وہ سب مجاہدین بندھے تھے۔ اسلام کا رشتہ، جس نے سب کو بنا رنگ و نسل اور زبان کے ایک رسی میں باندھ دیا تھا تین ماہ کی اس ٹریننگ کے دوران سب کچھ ہی انہیں سکھایا گیا تھا۔ گوریلا وار کے بنیادی اصول و ہارڈ کراسنگ، جنگی چالیں، کیمو ملاجمنٹ و فرسٹ ایڈ کی مکمل تربیت پریکٹیکل اور تھیوری کے ساتھ اسلحے کے استعمال اور تربیت اور اس کے ساتھ ہی روحانی تربیت بھی جاری تھی۔

تہجد کی نماز بھی سب مجاہدین باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد تلاوت ہوتی اور احادیث بیان کی جاتیں۔ اسلام کا ترانہ ہوتا و بزم شہدا ہوتی۔ نماز کی پابندی نہ کرنے اور غلطی کرنے والے مجاہدین کو سزا بھی دی جاتی اب یہ ٹریننگ ختم ہو چکی تھی اور اس دوران جیسے وہ اپنے تمام سابقہ دکھ بھول گیا تھا یاد رہ گیا تھا تو بس یہ کہ وہ ایک مجاہد تھا جسے ظلم کے خلاف نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے اللہ کی خاطر لڑنا تھا۔ سرحدوں کی حد بندی کیے بغیر، وہ مسلمان تھا اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں کے مقابل میدان میں اتر آیا تھا۔ اس نے افغانستان اور کشمیر دونوں محاذوں پر جانے کی کوشش کی تھی اور اس کی قسمت اسے اس کی ماں کی سرزمین پر کھینچ لائی تھی جو لہو رنگ تھی۔ ہزاروں ماؤں و بہنوں کی آنکھیں ان جیسے مجاہدین کی منتظر تھیں اور وہ ان پکاروں پر لبیک کہتا وہاں پہنچا تھا۔ اپنے دیگر کچھ ساتھیوں کے ساتھ وہ ایک اہم مشن پر نکلا تھا یہ اس کا یہاں پہلا مشن تھا جبھی وہ بے حد پرجوش تھا۔ ان کے پاس کچھ عسکری سامان تھا اور ضروری دستاویزات اور کاغذات تھے جو حضرت بل میں کمانڈر احسان تک انہیں پہنچانے تھے۔ کتنے دنوں سے ان کے کچھ ساتھی حضرت بل درگاہ میں پھنسے ہوئے تھے اور انہیں کسی بھی طرح وہاں پہنچنا تھا۔ مگر جو حالات تھے آگے پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ حضرت ''بل درگاہ'' کا بھارتی ٹاسک فوج نے محاصرہ کیا ہوا تھا اور اہم علاقوں میں بھی آج کل بھارتی فوج کی کاروائیاں تیز ہو گئی تھیں اس لیے وہ بے حد محتاط تھے اور رات کے اندھیروں میں سفر کرتے تھے۔ مزید دو دن سفر کر کے وہ چھپتے چھپاتے اس ہائیڈ آؤٹ میں آ گئے تھے۔ ''کپواڑہ سیوہ'' اس اہم مشن کی تکمیل کے لیے نکلے تھے۔ لیکن راستے میں خریزو پانزلہ، بارہ مولا وغیرہ میں کئی دن قیام کرنا پڑا اس اثناء میں ٹاسک فورج سے جھڑپیں بھی ہوئیں اور اس نے اپنے ساتھیوں سمیت انہیں خاصا نقصان بھی پہنچایا تھا اور اپنے ایک ساتھی

کی شہادت کے بعد وہ اس ہائیڈ آوٹ میں پہنچ گئے تھے۔ایسے ہائیڈ آوٹ مجاہدین نے کئی جگہوں پر بنا رکھے تھے جو بھارتیوں کی نظر میں نہیں آتے تھے۔کبھی کبھار کوئی ہائیڈ آوٹ انہیں اچانک خالی بھی کرنا پڑتا۔یہ ہائیڈ آوٹ جس میں وہ اس وقت مقیم تھے ایک پہاڑی غار سا تھا۔اردگرد گھنے درختوں کا جنگل تھا اور اس غار کے اندر ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔باہر سے بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا کہ یہاں اس طرح کوئی غار بھی ہے نیچے اتر کر کچھ فاصلے پر بکروالوں کے خیمے لگے تھے ان بکروالوں میں ہی ایک ان کا ساتھی بکروال کے روپ میں موجود تھا۔ان کا ایک ساتھی شدید زخمی تھا۔اس کی مرہم پٹی کے باوجود اس پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی۔بھارتی فوج کی رائفل سے نکلی گولیوں کے برسٹ سے چار گولیاں سلطان شاہ کے سینے میں پیوست ہو گئی تھیں۔

''ابن زید اگر مجھے کچھ ہو گیا تو امیر سفر تم ہو گے۔حضرت بل درگاہ کے باہر بھارتی فوج کا پہرا بہت سخت ہے۔

جتنے وردی میں ہیں اس سے کہیں زیادہ عام لباس میں۔''

''سلطان شاہ کے سینے کے زخم سے خون مسلسل بہہ کر ان کے لباس کو رنگین کرتا پتھریلی زمین کو نم کرنے لگا''

ابن زید نے ان کا سرد ہوتا ہاتھ تھام لیا اور نم آنکھوں سے بہت عقیدت بھرے انداز میں چوما!

''آپ کو کچھ نہیں ہو گا آپ ٹھیک ہو جائیں گے''

اس کا گلا بھرانے لگا تھا۔وہ سلطان شاہ کے بے حد نزدیک تھا مگر وہ ٹھیک نہیں ہوئے تھے انہوں نے الوداعی نگاہ ان سب پر ڈالی تھی اور بھرپور آسودگی سے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند کر بلند آواز سے کلمہ پڑھا تھا۔کتنی دیر تو ابن زید کو یقین نہیں آسکا ان کی روح ان کے وجود سے آزاد ہو گئی ہے جب وہ حواسوں میں لوٹا تھا تو بے اختیار سسک اٹھا تھا۔اسلم ڈار نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور نرمی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''شہیدوں کی شہادت پر آنسو نہیں بہایا کرتے ابن زید! میرے آقا و مولا ﷺ نے فرمایا جو شخص جنت میں چلا جائے پھر اس کو دنیا میں آنے کی آرزو نہ رہے گی اگرچہ اس کو ساری دنیا کی چیزیں دے دی جائیں مگر شہید پھر آنے اور دس بار آنے کی آرزو کرے گا کیونکہ وہ شہادت کے درجے کو دیکھ چکا ہو گا''

انہوں نے ٹھہراؤ بھرے انداز میں کہتے ابن زید کا آنسوؤں سے بھیگا چہرا صاف کیا

تھا۔ابن زید نے ہچکی بھرتے ہوئے سلطان شاہ کو دیکھا تھا۔ان کے سینے کے زخم سے ابھی تک خون بہہ بہہ کر زمین کو لہو رنگ کر رہا تھا۔ان کی پیشانی سے روشنی کی کرنیں سی پھوٹتی تھیں اور ان کے بے جان جسم سے انوکھی خوشبو آتی تھی۔ان کے مطمئن روشن چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا انہوں نے اپنی منزل پالی تھی۔وہ رات انہیں وہیں گزارنی تھی اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہیں پتھریلی زمین میں گڑھا کھود کر سلطان شاہ کے اپنے ہی خون میں غسل کیئے وجود کو نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد سپرد خاک کر دیا تھا۔اس رات وہ اپنی آنکھوں کو یہ سوچ کر نم ہونے سے بچاتا رہا کہ شہید مرا نہیں کرتے لیکن بادل اس ساری رات روئے تھے اور اسلم ڈار بار بار گنگناتے تھے۔

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
یہ سرخی ہے آزادی کے افسانے کی

اور اس کا دل ہر مرتبہ صدق دل سے آمین کہنا نہ بھولتا۔

☆☆☆

اس روز موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے تھے۔یہ جولائی کا اواخر تھا۔دھوپ نے بادلوں کی وجہ سے اپنی تمازت کھونا شروع کر دی تھی۔سائے لمبے اور گہرے ہوتے گئے اور بالآخر بادلوں کے شریر ٹکڑوں نے ایک دوجے کو پکڑ لیا اور آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے اٹ گیا۔وہ دھلے ہوئے کپڑے اتارنے چھت پر آئی تو پہلی بوند نے اس کے گال کو بے تابی سے لپک کر چوم لیا۔اس نے تیزی سے کپڑے اتارے اور بھاگ کر لکڑی کے ستونوں اور ٹین کی چھت والے برآمدے کے نیچے بچھی چارپائی پر سوکھے کپڑے ڈال آئی۔ٹین کی چھت پر بوندوں کا سرگم بولنے لگا اور فضا سرسراتی ہواؤں کے باوجود اسی موسیقی سے بھرنے لگی۔پھر یکا یک بوندھوں نے موسلا دھار بارش کا روپ دھار لیا تھا۔اس نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا محلے میں بچے بڑے تیزی سے ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دیئے۔بادل زور سے گرجا اور بوچھاڑ کا ایک تیز ریلا ہوا کے شدید جھونکے کے ساتھ اسے سرتاپا بھگو گیا۔مکان کے عقب میں دو رویہ درختوں کی قطاروں میں گھری سڑک کے اختتام پر نہر کا کنارہ تھا۔بارش کی وجہ سے ہر سو ناٹا تھا وہ سرعت سے نیچے اتری تو کچھ اور بھی بھیگ گئی۔صحن میں موجود پرنالوں سے بارش کا مٹیالا پانی پوری رفتار سے نیچے گر رہا تھا اور اینٹوں سے بنے سرخ فرش پر بہتا کیاریوں میں جا رہا تھا۔فضا میں بادلوں کی گونج کے علاوہ پانی کے گرنے کی آواز تھی۔اماں اور زارا یقیناً اپنے کمرے میں تھیں وہ بھاگ کر صحن عبور کرتی اپنے

کمرے میں آئی تو لائٹ بند ہونے کی وجہ سے ہی کمرے میں سکندر نے شمع جلا دی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تھا تو چند ثانیوں کو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ دفعتاً بادل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے پل بھر کے لیے سب کچھ روشن کر دیا۔ طاق میں رکھی شمع کا شعلہ زور سے پھڑکا۔ باہر کی تیز بارش کی آواز ایک سرتال کی صورت گونجتی تھی۔ خنک ہوا کے تھپیڑے اسے چھو کر گزرنے لگے تو وہ کپکپا کر دروازے سے اندر آ گئی۔

''اسوہ''

سکندر نے وہیں کرسی پر بیٹھے اسے پکارا تھا مگر وہ ان سنی کیے کپڑوں کی الماری سے اپنے لیے لباس نکالنے میں مصروف ہو گئی۔ سکندر اٹھ کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

''ابھی تک خفا ہو؟''

''آپ کو میری خفگی کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ آپ نے اپنی اماں کو بھی منا لیا ہے میری فکر کرنے کی کیا ضرورت۔

''کیوں ضرورت نہیں۔ سوچو تو سہی مجھے کتنا خیال ہے تمہارا! تمہیں دل بہلاوے کی خاطر ایک بہترین مصروفیت مل گئی ہے''

اس کا اشارہ اس کی پریگنینسی کی جانب تھا۔ اسوہ کا دل بھر اسا گیا۔ وہ ہونٹ بھینچے ساکن کھڑی رہی۔ ان کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور اس سے پھولوں سے لدی بیلیں اور شاخیں نظر آ رہی تھیں جو بارش سے دھل کر نکھری کچھ اور بھی شاداب ہو چکی تھیں۔ بارش کی آواز بادل کی گرج اور ہوا سے ہلتے درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ پر وہ زیادہ دھیان دے رہی تھی بہ نسبت سکندر کی بات کے۔

''ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم امنگوں اور خواہشوں کے ساتھ سفر کر سکیں۔ صرف رنگین خواب ہی ہم اپنی آنکھوں میں نہیں سجا سکتے۔ ان خوابوں کو پانے کے لیے اس حقیقت سے منہ نہیں موڑا جا سکتا جو ہمارا نصب العین ہے۔ ہم کشمیری ہیں آزاد یا جموں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہمیں بس یہ یاد رہنا چاہیے کہ ہماری سرزمین کا ایک حصہ لہو رنگ ہے۔ وہاں چنار سلگتے ہیں اور ظلم وستم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ہر روز جانے کتنی بیویاں اپنے سہاگ کھو رہی ہیں۔ کتنی ماؤں کی گود اجاڑی جاتی ہے اور کتنی مظلوم لڑکیاں اپنی عصمت گنوا رہی ہیں۔ کیا یہ دکھ صرف ان کا دکھ ہے؟ میرے اندر یہ احساس بہت تاخیر سے جاگا ہے اسوہ میں تو اسی بات پر شرمندہ ہوں مجھے مزید شرمندہ نہ کرو، ہمیں اپنی پاک ارض کو پامال ہونے سے بچانا ہے۔ دشمنوں سے پاک رکھنے کے

لیے مسلسل جدوجہد کرنی ہے۔

اس کی آنکھیں جانے کس کس جذبے سے لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ باہر ہوائیں ایک دم تیز ہو گئیں گویا اس کے کرب میں شامل ہوں۔

ہر قوم اور ہر فرد کی زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے ہمارا مشن آزادی ہے۔ دشمنوں سے ہمیں اس سرزمین کو پاک کرنا ہے۔ اس قوم کے ہر فرد کو اس آزادی کے حصول کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہی ہوگا جیسے 1947ء کی تحریک آزادی میں سب نے اپنا کردار نبھایا تبھی تو آزادی مقدر بنی تھی''

سکندر نے اسے کاندھوں سے تھاما اور رخ اپنی جانب پھیر لیا۔ اسوہ کے چہرے پر صرف بارش کی نہیں آنسوؤں کی بھی نمی تھی۔ سکندر نے کچھ کہے بغیر اسے گلے سے لگا لیا تھا اور اس کے مہکتے نم بالوں کو چوما۔

کچھ دیر بعد جب وہ خود اس کے لیے کھانا گرم کر کے لایا تو اسوہ کپڑے بدل چکی تھی۔

میری پیاری!
میرے سامنے بیٹھو
اور مجھے اجازت دو
کہ میں تمہیں دیکھوں
اور تمہیں اپنے دل میں چھپا لوں
تمہارا خوبصورت چہرا
تمہاری آنکھیں
شاید میں دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا
لیکن جس لمحے موت میرے قریب ہوگی

اس نے نوالہ اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈالا تھا اور اس کے تمام آنسو نہایت ملائمت کے ساتھ اپنی پوروں پر سمیٹ لیے تھے۔ اسوہ کے آنسو ٹپ ٹپ بہے تھے اس نے جھک کر سکندر کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے چوم لیا تھا کچھ کہے بغیر وہ اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور شدتوں سے روتی چلی گئی تھی سکندر جان گیا تھا اس کی وہ ضد ٹوٹ چکی ہے۔ وہ مان گئی تھی۔

''میں ناراض نہیں ہوں، آپ کو خدا کے حوالے کیا اور خود کو ان ہزاروں کشمیری عورتوں کی صف میں کھڑا کر لیا جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے شوہروں کے جسموں پر ہتھیار سجائے۔''

وہ سسکتی ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

حاکم شہر بتا؟
وقت کے شکنجوں نے، خواہشوں کے پھولوں کو
نوچ نوچ توڑا ہے
کیا یہ ظلم تھوڑا ہے
درد کے جزیروں نے آرزو کے جیون کو
مقبروں میں ڈالا ہے
ظلمتوں کے دریا ہیں
لوگ سب لٹیرے ہیں
موت روٹھی بیٹھی ہے
ذات ریزہ ریزہ ہے
تار تار آنچل ہے
درد درد جیون ہے
شبنمی سی پلکیں ہیں
قرب ہے نہ دوری ہے
زندگی ادھوری ہے
اب یقین آیا ہے
موت بھی ضروری ہے

سویٹی والے منصوبے کے بعد اس کی پیشی بگ باس کے پاس ہوئی تھی۔ وہ غلیظ لوگ تھے اور گندی زبان میں بات کرتے تھے۔ بگ باس جو نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے ان مقاصد سے باز آجانے کو فورس کرتا رہا تھا۔ اس کی خاموشی اور لاتعلقی کے مظاہرے پر وہ بھڑک اٹھا تھا اور پھر محب عبدالقدوس کو اس نے انگریزی زبان میں موٹی گندی گالیوں سے نوازنے کے بعد پھولے ہوئے سانسوں کے بیچ کہا تھا۔

''شاید یہ ملک ابھی تک اسی لیے پوری طرح تباہ نہیں ہوا کہ تم جیسے لوگ ختم ہونے میں نہیں آرہے۔ جانے کسی کونے کھدرے سے اچانک نمودار ہو کر تہلکہ مچا ڈالتے ہو۔ خیر کب تک؟''

''جانتے ہو تم کیوں تمہیں یہاں بلوایا ہے؟''

انداز سوالیہ تھا مگر محب عبدالقدوس نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا تھا۔

''تمہارے ساتھی کا عبرتناک انجام دکھانے کو اور یہ جتلانے کو کہ تم بہر حال ہماری پہنچ سے دور نہیں ہو''

محب عبدالقدوس کے تاثرات میں سر مو فرق نہیں آیا تھا۔

''کیا خیال ہے چھوڑ دیں تمہیں یا تھوڑا سا سبق سکھا دیں؟ اس جرأت کلامی کا جو تم قلم کی حرمت بچانے کو دکھاتے رہے ہو۔ یہ قوم مردہ ہو چکی ہے۔ ہمارے پروپیگنڈے اتنے کمزور ہرگز نہیں ہیں کہ وہ تمہاری اس معمولی اور چھوٹی سی کوشش سے ناکامی کا شکار ہو جائیں۔ محب عبدالقدوس کے بارے میں جا کر لوگوں سے سوال کرو اور ہماری موویز اور سانگز کے بارے میں بھی۔ تمہیں جاننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور ہماری موویز، ڈراموں کی تفصیلات تمہیں ہر ایج گروپ میں ملے گی''

محب عبدالقدوس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں اور پیشانی کی شکنوں کو طنزیہ نظروں سے دیکھتا کہہ کہ وہ ہنسا تھا۔

''کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟ جوان ہو، خوبصورت ہو پھر تمہاری فیملی بھی تو ہے۔ مت بھولو کہ ہم اپنے دشمن پر کڑی نظر رکھا کرتے ہیں۔ سو بہتر یہی ہے کہ باز آجاؤ ورنہ......''

''ورنہ کیا؟''

محب عبدالقدوس ایک دم بپھر کر بولا اور مشتعل انداز میں اس کے چہرے پر جھپٹ کر اسے بے نقاب کرنا چاہا تھا مگر نقاب پوش بگ باس بندر کی طرح اچھل کر اس کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ اس سے قبل کہ محب دوبارہ اس پر حملہ آور ہوتا آس پاس چوکنے انداز میں کھڑے اس کے محافظ بے دردی سے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نقاب پوش کے حلق سے ایک بار پھر غلیظ گالیوں کا طوفان ابل پڑا تھا۔

''لے جاؤ اسے اور اچھی طرح سے بتانا اس قسم کی گستاخی کی معمولی سزا بھی کتنی کڑی ہے''

نقاب پوش نے غراتے ہوئے کہا اور اگلے لمحے وہ اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے مگر وہ ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ گویا برق سی چمک رہی تھی اس نے پلاسٹک کے کھلونوں کی طرح ان چاروں کو لمحوں میں اٹھا اٹھا کر پٹخ ڈالا تھا۔ پھر وہ چیتے کی سی پھرتی سے واپس اندر آیا تھا اور لپک کر نقاب پوش بگ باس کے گراؤنڈیل وجود کو کسی بے وزن شے کی طرح اٹھا کر دوسری سمت اچھال دیا تھا۔

''خبردار جو تم نے گا ... سے کھینچ لوں گا۔ یاد رکھنا!''

گرجانے والے بدحواس بگ باس کے پہلو میں اپنے وزنی جوتے کی ٹھوکر لگاتے ہوئے وہ حلق کے بل غرایا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سب کے سب چکرا کر رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ اپنا دفاع تک کرنا انہیں یاد نہ رہ سکا۔ یا شاید انہیں گمان تک نہ تھا کہ وہ سرے سے نہتا شخص ایسی بہادری اور طوفانی طاقت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں تھا کہ ان کا پالا پہلی بار کسی ایسے آہنی اور آتشی مزاج سے پڑا تھا ورنہ اس سے قبل تو انہوں نے اپنی غنڈہ گردی کی بنا پر مردانگی کے آہن کو بھی موم بن کر اپنے سامنے ڈھلتے ہی دیکھا تھا۔ وہ سب کے سب ہونق سہمے ہوئے اور ششدر نظر آ رہے تھے۔ نقاب پوش بگ باس جس کا نقاب سرک چکا تھا سب سے پہلے حواسوں میں لوٹا اور فٹ بال کی طرح اچھل کر اچانک کھڑا ہوا اور کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال کر محب عبدالقدوس کو نشانہ بناتے ہوئے بے دریغ گندی گالیوں سے اپنے وفاداروں کو نوازتے ہوئے محب کو وہاں سے لے جانے کا حکم دیا تھا۔

''اس کے ہاتھ کس کنجر لچے نے کھولے تھے؟''

وہ یقیناً بات بات پر گالی دینے کا عادی تھا۔ اس کے چاروں ساتھی سنبھل کر اٹھ چکے تھے وہ صحیح معنوں میں ''محب عبدالقدوس'' سے خائف نظر آ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب آئے محب عبدالقدوس نے ایک کو پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا تھا وہ وہیں کمر پکڑ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا البتہ باقی تینوں نے کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پا لیا تھا اور پوری قوت سے اسے کھینچتے باہر دھکیل رہے تھے اور وہ ان سے دھکیلا نہیں جا رہا تھا اور نقاب پوش کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

لوگ کہتے ہیں ہم پاگل ہیں
جو ہر روز اپنے پیاروں کو
خون کے دریا میں ڈوبتے دیکھتے ہیں
اور سبق حاصل نہیں کرتے
بلکہ خود بھی خون کے دریا میں کودنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں
ہاں ہم پاگل ہیں، دیوانے ہیں
لیکن آزادی کی دیوی
دیوانوں کے قدموں پر ہی جھکتی ہے

اور اس راہِ جنوں کے مسافر ہی
آزادی کے حسن سے ہم آغوش ہوتے ہیں
آؤ تم بھی اس راہ کے مسافر بن جاؤ
اگر تمہیں آزادی کے وصل کی خواہش ہے تو
آؤ راہِ جنوں کے متوالو
آؤ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھو
اور اس حسین پری کو پالو
راہِ جنوں کے متوالو
آؤ آزادی کی پری کو پانے کے لیے نکلیں
اور پھر اس کے وصل سے سرشار ہو جائیں

وہ ساکن کھڑا تھا پتھرایا ہوا۔ آفاق حسن اس کا کتنا پیارا دوست تھا۔ جس کے بابا اور چاچو ہمیشہ سے جدوجہد آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ مجاہدین میں شامل تھے اور اکثر اسے آفاق اس جماعت میں شمولیت کا مشورہ دیا کرتا تھا جسے وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔

''میرے ہاتھ تم نے کبھی غور سے دیکھے ہیں آفاق!''

وہ اس کی بات کے جواب میں کہا کرتا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' آفاق نے حیران ہو کر پوچھا تھا

''یہ بہت نازک اور حسین ہیں یہ بھاری مشین گنوں اور رائفلوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے۔ یہ قلم کا بوجھ سہتے ہیں اور خوبصورت نغمے تراشتے ہیں۔ مجھے ڈل جھیل کی خوبصورتی بھاتی ہے۔ اس میں تیرتے بجروں پر پھولوں کی آرائش ہوگی میں ان پر گیت لکھوں گا۔ زعفران کے کھیت میں جب ہماری خوبصورت کشمیری لڑکیاں پھول چنیں گی تو میں ان کی رنگوں سے تصویریں بناؤں گا۔ مجھے بارود کی بو سے بھی خوف آتا ہے آفاق!''

پھر وہ اسے اپنی نظمیں سنایا کرتا اپنے خیالی اسکیچز دکھایا کرتا۔ اور آفاق مسکرا دیتا۔

''نظم تو میں نے بھی لکھی ہے۔ سنو گے؟''

اور پھر وہ اسے نظم سنانے بیٹھ جاتا

اے آزادی کی دیوی
تو بہت خوبصورت ہے

اور جب وہ نظم مکمل کرتا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوتی تھیں۔

''ہمیں صرف نظمیں نہیں لکھنی ہیں ابن زید! ہمیں اپنے حصے کی قربانی بھی دینی ہے اور جدوجہد بھی کرنی ہے۔ سمجھ لو یہ فرض ہے ہم پر''

مگر وہ کبھی اس کی بات کو سنجیدگی سے ہی نہ لے سکا تھا اور رات جانے کونسا پہر تھا جب گلی میں شور سنائی دیا تھا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں اور پھر مسلسل فائرنگ! وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو روشنی کے ساتھ اس کی ماں بھی جاگ چکی تھی اور بے چین نظر آتی تھی۔ باہر گلی میں گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے جا رہے تھے۔ شاید کسی نے مخبری کر دی تھی۔ وہ لوگ کمانڈر کو تلاش کر رہے تھے۔ کمانڈر آفاق کے بابا تھے اور آج شام ہی بہت طویل عرصے بعد اپنے گھر والوں سے ملنے آئے تھے۔

روشنی اور اپنی ماں کے ساتھ وہ بھی آفاق کے بابا کے ساتھ پوری فیملی کی حفاظت کی دعا مانگنے لگا تھا۔ تبھی زوردار آواز سے دروازہ بجا یہ آفاق کے گھر کے دروازے کی آواز تھی۔ روشنی لپک کر بیرونی دروازے تک آئی اور جھری سے باہر جھانکا یہ ایک تنگ گلی تھی جس میں اندھیرا تھا پوری گلی بھارتی فوجیوں سے بھری ہوئی تھی اور ان کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی کے دائرے بے تابی سے ہر سو زبانیں نکالے لپکتے تھے۔ تبھی آفاق کے گھر کا دروازہ کھلا تھا ایک بھارتی فوجی نے لات مار کر دروازہ کھولنے والے کو سر کے بل پیچھے گرایا اور رائفلیں سنبھالے دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ پھر وہ آفاق اور اس کے چھوٹے بھائی کو لاتیں اور ٹھوکریں مارتے باہر لے آئے تھے۔ آفاق کی ماں اس بدسلوکی پر چیخی تھی اور اپنے بیٹے کو بچانے کو ان کی سمت جھپٹی تو بھارتی فوجی نے ان کے سر پر بے دردی سے بندوق کا بٹ مارا تھا خون کا فوارہ ابل پڑا۔

''بولو کمانڈر کو کہاں چھپایا ہے؟''

بھارتی فوجی بار بار چیختے تھے اور ساری گلی کے دروازے کھلواتے یونہی نوجوانوں اور بوڑھوں کو مارتے پیٹتے گلی میں لا کر کھڑا کر دیتے تھے۔ ابن زید نے اندازہ کیا تھا کہ آفاق کے بابا گرفتار نہیں ہو سکے تھے۔ اسے انوکھی سی خوشی محسوس ہوئی۔

''کمانڈر جہاں بھی چھپے ہو باہر نکلو۔ نہیں تو ان سب کو بھون دیا جائے گا''

بھارتی فوجی بہت دیر تک اعلان کرتے اور چند ایک نوجوانوں کو پکڑ کر مارتے ہوئے اپنی جیپوں میں ڈالتے گئے تھے۔ پھر جاتے ہوئے انہوں نے جو فائرنگ کی تھی اس سے آفاق شہید ہو گیا تھا۔ ابن زید کے حلق سے کربناک چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ وہ پاگل بنا چیختا ہوا باہر آیا تھا۔ آفاق بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی سفید قمیض تیزی سے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ کسی نے

آگے بڑھ کر اس کی لاش کو چارپائی پر ڈال دیا۔ پھر ایک نسبتاً کھلی گلی میں لے آئے۔ جہاں دو لاشیں اور پڑی تھیں۔ عورتیں رو رہی تھیں مرد ضبط اور حوصلوں کی ٹوٹتی طنابوں کو سنبھالے تدفین کے انتظام میں مشغول ہو چکے تھے جو حالات تھے اب یہ انہونی نہیں رہی تھی روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن کب تک؟ کب تک یہ چیخیں گونجتی رہیں گی؟ گھر جلتے رہیں گے؟ سہاگنیں بیوہ ہوتی رہیں گی۔ گودیں اجڑتی رہیں گی۔ کب ملے گی آزادی، ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔ آزادی کی صبح طلوع نہ ہوتی تھی۔ اس ساری رات وادی میں آسمان برستا رہا اور ابن زید آفاق کے بے جان جسم سے لپٹ کر روتا رہا۔ آفاق کی آواز بازگشت بن بن کر اس کی سماعتوں میں سرسراتی رہی تھی۔ اسے لگا وہ پھر کہہ رہا ہو۔

ہم دیوانے ہیں
اور آزادی کی دیوی
دیوانوں کے قدموں پر ہی جھکتی ہے
یہ راہِ جنوں ہے
لیکن اس راہ پر چل کر
بالآخر دیوانوں کو
وصل نصیب ہوگا
اے آزادی کی دیوی
ہم تجھے نہ پا سکے لیکن
ہمارے بعد آنے والے
اسی راہ کے مسافر
تجھے ایک روز ضرور پا لیں گے

آفاق کی تدفین کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اپنا بے حد قیمتی پارکر کا قلم دو ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا اور وہ ریوالور اٹھا کر اپنے قمیض کی جیب میں رکھ لیا جو اس کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر آفاق نے اسے تحفہ دیا تھا۔

☆☆☆

ہمیں تو چھوٹا سا پودا لگا کے جانا تھا
شجر پر آتا ہے ثمر دیکھنا بھی کس کو تھا

اسے بس اتنا یاد رہا تھا کہ وہ جب کسی طور بھی ان کے قابو میں نہیں آیا تو پیچھے سے کسی

نے اس کے سر پر وزنی شے سے ضرب لگائی تھی اور اس کے حواس یکلخت کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔

شدید درد اور تڑپ سے بھی زوردار احساس غفلت کا تھا یا پھر اسی درد کی ناقابل برداشت حد پر جا کر غفلت اس پر چھائی تھی کہ وہ ہر احساس سے ماورا ہو گیا تھا۔ دوبارہ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس کے وجود پر رسیوں کی بندش تھی۔ وہ چاروں وحشی بھیانک تأثرات چہروں پر سجائے اس کے اطراف جمع تھے۔ ان کے مطالبات بھی ان کی طرح سے مکروہ تھے جنہیں اس نے ماننے سے انکار کیا تھا اور جواب میں اسے اپنی زندگی کا بدترین تشدد سہنا پڑا تھا وہ صحافی تھا اور متعدد بار سچ لکھنے کے جرم میں سزا کاٹ چکا تھا۔ اپنے پانچ سالہ کیریئر میں اسے تین مرتبہ جیل ہوئی تھی جبکہ دو مرتبہ اسے کڈنیپ کیا گیا تھا تو وہاں اسے پھولوں کی سیج پر نہیں سلایا گیا تھا مگر کوئی بھی سختی اور صعوبت اسے اس کے سچ اور حق سے ہٹنے پر مجبور نہ کر سکی تھی اور وہ جرأت مندانہ ہمت استقلال کی کڑی سزا بھگت کر بھی اپنے کام سے لگا رہا تھا مگر ان لوگوں کا تشدد کا طریقہ کچھ الگ تھا محبّ عبدالقدوس کے انکار اور استقامت نے انہیں طیش واشتعال سے پاگل کر دیا تھا اور پھر اس کے پیروں کے دس کے دس ناخن پلاس کی مدد سے اتنی بے رحمی اور سنگدلی سے جڑ سے کھینچ کر نکال دیئے گئے تھے کہ محبّ عبدالقدوس جیسا باعزم اور بلند حوصلے کا مالک بھی اس تکلیف کو برداشت نہ کر پایا تھا اور اس کے حلق سے اذیت کربناک اور دلخراش چیخیں وقفے وقفے سے اس وسیع عمارت کے درودیوار کو لرزاتی رہی تھیں اور جانے کب وہ درد کی شدتوں سے لڑتا نڈھال ہو کر حواس کھو گیا تھا۔

ماہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشا سرِ راہ گزر ہیں
حسرت سی برستی ہے در و بام پر ہر سو
روتی ہوئی گلیاں ہیں، سسکتے ہوئے گھر ہیں
آتے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند، وہ سورج، وہ شب و روز کدھر ہیں
بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سر بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہی لال و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہت ماہتاب ہیں ہم نورِ سحر ہیں

دوبارہ اس کی آنکھ کتنے پہروں کے بعد کھلی اسے قطعی اندازہ نہیں ہو پایا تھا اس کا سر

کوئی بھاری پتھر تھا جیسے اور دماغ گویا فضاؤں میں کہیں ریزہ ریزہ بکھرا ہوا محسوس ہوتا تھا آنکھوں کے آگے لال پیلے دائرے ناچتے پھرتے تھے۔ جانے کتنی دیر مزید وہ اس کرب میں مبتلا رہا تھا معاً لاشعور کا تعلق پوری طرح شعور سے جڑا تھا اور دھیرے دھیرے دماغ پر گرے دبیز پردے ہٹتے چلے گئے، سب کچھ یاد آ گیا تھا تو جسم ایک بار پھر درد کا پھوڑا بن کر پھٹنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچے اور تمام ہاری ہوئی ہمتوں کو مجتمع کر کے ذرا سا سر اونچا کیا تو اسے اندازہ ہو سکا وہ پختہ فرش پر منہ کے بل گرا ہوا ہے۔ تکلیف اس قدر شدید تھی کہ اس کے لیے کسی بھی زاویئے سے ہلنا بھی محال تھا۔ ذرا سی جنبش کا نتیجہ تھا کہ اس کے سر میں از سرِ نو دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ بے ساختہ کراہ کر اس نے سر دوبارہ پختہ فرش پر ٹکا دیا۔ ہاتھ سے ٹٹول کر اس نے سر کی پشت کو سہلایا۔ سر کا گومڑ اب قدرے کم ہو چکا تھا جما ہوا خون گاڑھے سیال مادے کی صورت اس کی انگلیوں سے چپکا۔ اس نے دانت بھینچے اور اپنی تمام ہمتوں کو مجتمع کرتے ہوئے پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر ایک جھٹکے سے زاویہ بدلا تھا اور ہزار ہا ضبط کے باوجود دبی دبی چیخیں کراہوں کی صورت اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی تھیں۔ پیروں کی انگلیوں کے سروں سے درد کی بھڑکیلی آگ نے اٹھ کر پورے وجود کو اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا۔ کچھ دیر ساکن لیٹا وہ اپنا ضبط آزماتا رہا تھا پھر ہمت بحال کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب اس کا جسم بندشوں سے آزاد تھا۔ اس نے دھندآلود نظروں سے اپنے پیروں کی جانب نگاہ کی تو ہونٹوں پر زخمی مسکان بکھر گئی تھی۔

ناخنوں کے بغیر انگلیاں متاثرہ جگہ سے جمے ہوئے خون پر تازہ خون کی بوندیں تیزی سے رسنا شروع کر چکی تھیں۔

وطن کی اے عظیم مٹی!
تو روزِ حشر میرے حق میں کوئی گواہی مت دینا
کہ میں نے تیرا حق ابھی ذرے کے برابر بھی نہیں ادا کیا
تو گواہی دینا تو صالح کی دینا
جس نے اپنے وجود کی پور پور کو تجھ پر قربان کر دیا
تو گواہی دینا تو سپاہی مقبول حسین کی دینا
جو سالہا سال ہندوستان کی قید میں بند رہ کر ہر سختی کو برداشت کر گیا اور حرفِ حق کو زبان پر جاری رکھا۔
اے وطن کی عظیم مٹی تو میرے حق میں گواہی مت دینا

آنکھیں موندے وہ کسی اور ہی دنیا میں گم تھا جب کسی احساس کے تحت چونک اٹھا تھا وہ سویٹی تھی جو اپنے نرم و نازک ہاتھ سے اس کے خاک و خون میں لتھڑے وجود کو نرمی و حلاوت اور محبت سے سہلا رہی تھی۔ اس نے اپنے پیر سمیٹے اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ شاید اس میں بولنے کی ہمت ناپید تھی۔

حق اچھا پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پر چڑھو خاموش رہو
ان کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر سورج ہی کو گھومنے دو خاموش رہو

آج خلافِ معمول اس کے ہونٹوں پر دعوتِ دیتی ہوئی مسکراہٹ نہیں تھی اس کی آنکھوں کی دھندلی سطح پر آنسو تیرتے تھے۔ کیوں؟ محبِ عبدالقدوس جانتا تھا نہ جاننا چاہتا تھا۔

''کیوں نہیں ضد چھوڑ دیتے تم! ابھی بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا۔ دنیا اتنی ہی حسین ہے۔ بس ذرا سی غفلت اور ہاتھ بڑھا کر رنگوں کو چھونا''

اپنے ساتھ لایا مرہم اس کے زخموں پر لگاتے ہوئے وہ اس دلگیری سے بولی تو محبِ عبدالقدوس کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

''تم اپنی غیر معمولی شخصیت اور بہادری کی وجہ سے انہیں پسند آ گئے ہو۔ یہ تمہیں زندہ رکھنا اور تم سے اپنا مقصد نکالنا چاہتے ہیں اور یہ سودہ کچھ اتنا برا بھی نہیں ہے اگر تم اپنی نام نہاد ضد اور انا کو پسِ پشت ڈال دو۔ ابھی وقت ہے تم تھوڑا سا سمجھوتہ کر لو۔ زندگی ایک بار ملتی ہے''

''شیرِ میسور'' ''ٹیپو سلطان'' کا مشہور زمانہ قول ہے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تمہیں''

وہ نخوت زدہ آواز میں کہہ کر دوسری جانب تکنے لگا۔ سویٹی کے ہاتھ سے مرہم لے کر اس نے دور پھینک دیا تھا

اسے مرگ زرد کا خوف کیا
جو کفن بدوش رہا سدا
سو میرے فہیم نہ بھول تو
کہ ستم کی شب کو زوال ہے

باب 7

تیرا ظلم و جبر بلا سہی
میرا حوصلہ بھی کمال ہے
مجھے جوش گزند پر ناز ہے
مجھے ناز زخمِ بدن پر ہے

اس کے زخموں سے اٹے چہرے پر طمانیت آمیز تبسم تھا۔ جسے سویٹی نے جھلا کر دیکھا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا کہوں میں تمہیں سوائے اس کے کہ احمق اعظم ہو۔ سنو...... میری یہ آفر یہیں تک نہیں ہے تم جب چاہو جہاں چاہو میں دل و جان تم پر فدا کرنے کو تیار ملوں گی بس اک اشارہ کرنا''

وہ جاتے جاتے اسے پھر ورغلانے کو بولی تھی۔ محبِ عبدالقدوس نے منہ پھیر لیا تھا۔

''کیا کہہ سکتی ہوں تمہاری اس بے اعتنائی کے مظاہرے پر سوائے اس کے کہ محبت جیسے لطیف احساسات تمہیں چھو کر بھی نہیں گزرے۔ تمہارے وجود کو دیکھ کر سیسہ پلائی دیوار کی سختی کا خیال آتا ہے اب مجھے معلوم ہوا تم صرف وجود ہی نہیں دل بھی پتھر کا رکھتے ہو''

وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی اور محبِ عبدالقدوس کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

لباس تن سے اتار دینا
کسی کو بانہوں کے ہار دینا
پھر اس کے جذبوں کو مار دینا
اگر محبت یہی ہے تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
گناہ کرنے کا سوچ لینا حسین پریاں دبوچ لینا
پھر اس کی آنکھیں ہی نوچ لینا

اگر محبت یہی ہے تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
کسی کو لفظوں کا جال دینا
کسی کو جذبوں کی ڈھال دینا
پھر اس کی عزت اچھال دینا
اگر محبت یہی ہے تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے
اندھیری نگری میں چلتے جانا
حسین کلیاں مسلتے جانا
اور اپنی فطرت پر مسکرانا
اگر محبت یہی ہے تو معاف کرنا مجھے نہیں ہے

☆☆☆

سماسی سیکٹر پر مجاہدین کے ہمراہ پاکستانی سرحد کی بلند و بالا چوٹی پر کھڑا اسکندر طمانیت سے مسکراتا تھا۔ اس کی آنکھیں دوربین کی مدد سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے ذرا سا آگے جھک کر پہاڑوں کو سجدہ کرتی سرسبز ڈھلوانوں اور سبزے سے پھوٹتے چشمے پر نگاہ ڈالی تو محسوس ہوا جیسے وہ بھی جدوجہد آزادی سے نبرد آزما اپنے حوصلہ کی آزمائش کر رہے ہوں۔ سرحد کی حد بندی کرتے پہاڑوں کے اس طرف جنت نظیر مقبوضہ کشمیر کا حسن پھیلا ہوا تھا۔ شدید دھند اور کہر میں لپٹا جموں کشمیر خود پر سبزے کی چادر اوڑھے بے بسی کی بکل مارے ہوئے تھا۔ ظلم کی ایک آگ تھی جو اس کے مرغزاروں میں دہک رہی تھی۔ فضاؤں میں گویا بلا کا اضطراب تھا۔ وادئ لولاب کے مسحور کن مناظر نے اسے مسحور کیا تھا اسے شدت سے اسوہ کی یاد آئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”کیا کبھی ایسا ہوا ہے جذبۂ جہاد پر موت کا خوف غالب آ گیا ہو؟ کیا کسی نے پڑھا کہ حریت کی خوشبو کو جیل کی دیواروں نے قید کرنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ بلاشبہ زبان قلم کو قید کرنے کا چلن تو رہا ہے۔ لیکن ذہن دل ضمیر اور جذبے کبھی پابند سلاسل نہیں کئے جا سکے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حریت و آزادی کے ابھرتے سورج کو سوچ کی رسیوں سے باندھنے کی کوشش کرنے والے تاریخ سے بے خبر اور مستقبل کے ادراک سے تہی دامن ہیں۔ جہالت کی یلغار سے کبھی نور کی کرنیں نہیں مرا کرتیں۔ آپ کا راستہ ہی صراطِ مستقیم کا راستہ ہے۔ خدا مجھے معاف فرمائے کہ میں اس راستے پر چلنے میں آڑ بنتی رہی“ اور سکندر کے اندر یکا یک ڈھیروں طمانیت اتر آئی تھی۔ حالانکہ جب اسوہ نہیں مان رہی تھی تو وہ ابن زید کے سامنے کتنا جذباتی ہو گیا تھا۔

”آپ نے کہا تھا قلم کے زور سے سوئے ہوئے ضمیروں کو جگاؤں لیکن شاید میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں تھی یا پھر لوگوں کے ضمیر اندھے و گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں اس لیے میں بندوق اٹھانا چاہتا ہوں تو مجھے یہ کام بھی نہیں کرنے دیا جا رہا ہے۔ آپ اسوہ کو سمجھائیں ورنہ میں ٹینشن میں پتا نہیں کیا کر گزروں گا“

اور وہ مرحلہ جو بہت کٹھن اور دشوار لگتا تھا خدا نے کتنی آسانی سے اسے حل کر دیا تھا۔ وہ یہاں آیا تھا تو اس کے وجود پر، دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا اب اسے آگے کے مراحل بہت آسان لگنے لگے تھے۔

☆☆☆

فاصلہ ضرور ہے
منزلوں سے دور ہے
حوصلہ مگر دکھانا چاہئے
سانس ہے تو آس ہے
آس ہے تو پیاس ہے
پیاس ہے تو پھر بجھانا چاہئے
جھکی جھکی نہ ہو نظر
جھکے نہ سر
جیو تو ایسے
سہا سہا نہ ہو دل
نہ ہو کوئی ڈر
جیو تو ایسے
آئے جو غم تو مسکراؤ
مسکرا کے گلے لگاؤ
آگے آگے بڑھتے جاؤ
جیو تو ایسے جیو تو ایسے

کشمیر کی سرسبز وادیاں پہاڑوں کے دامن میں پھیلی پورے ماحول میں اپنا حسن پھیلائے آباد تھیں۔ قدرت کا لازوال حسن یہاں سمٹا ہوا ہے۔ سرگوشیاں کرتی یہ وادیاں بے حد

اٹریکٹ کر رہی تھیں۔ اس کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی اب وہ کچھ دنوں کے لیے اپنی ماں سے ملنے گھر آیا تھا تو یکسر بدلا ہوا تھا۔ سرخ دہکتے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں تو آنکھوں میں ہر دم بسی رہنے والی شوخی اور شرارت کی جگہ سنجیدگی اور ایک مبہم سی خاموشی نے بسیرا کر لیا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ وہ کچھ بے زار سا مسلسل ٹہلتے ہوئے بارش تھمنے کا انتظار کر رہا تھا تب ہی روشنی نے اندر قدم رکھا، اس کے ہاتھ میں لکڑی کی ٹرے تھی جس پر ثمر کا نقشہ تھا یہ ٹرے ابن زید کی بہت پسندیدہ تھی وہ ہمیشہ ناشتہ اسی ٹرے میں رکھ کر کیا کرتا تھا اس وقت روشنی اس میں اس کے لیے گڑ کے پکوڑے اور چائے رکھ کے لائی تھی۔ جسے ابن زید نے بے دلی سے اس کے بہت اصرار کے بعد تھوڑا سا کھایا تھا اور چائے کا مگ اٹھا لیا۔

"کچھ سناؤ نا ابن زید؟"

روشنی کی فرمائش پر وہ چونک گیا تھا۔

"کیا سناؤں؟ درد، اذیت اور المناک کرب کی وہ داستانیں جو یہاں ہر روز دہرائی جاتی ہیں۔ پامال ہونے والی عزتوں کا نوحہ سناؤں۔ اس موت کی وادی میں سے لوگوں کے خون اور آگ کے شعلوں میں لپٹے وجودوں کی کہانی سناؤں، جو روز اک نئی موت سے آشنا ہو رہے ہیں"

وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ روشنی نے جواباً سنجیدگی کی نگاہ سے اسے دیکھا تھا پھر آہستگی سے مسکرا دی

"تم واقعی بہت بدل گئے ہو ابن زید! یہ تبدیلی مثبت ہے مگر لفظوں سے اپنا تعلق ختم نہ کرو"

"مجھے کچھ سناؤ نا"

اس فرمائش پر ابن زید کچھ دیر اسی کیفیت کے زیر اثر سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا تھا اور جب روشنی مایوس ہو کر اٹھنے لگی تب وہ بوجھل آواز میں اپنی تازہ نظم اس کے گوش گزار نے لگا تھا۔

اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوبصورت ہے
لیکن بہت ظالم ہے
تیرے رخساروں کا غازہ
ہمارے بیٹوں کے کفن سے تیار ہوا ہے
اور تیری مانگ میں ہم نے

اپنے سہاگ کے خون سے سندور بھرا ہے
تیرے ہونٹوں کی سرخی نے
ہمارے لہو سے جلا پائی ہے
اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوب صورت ہے
لیکن تو نے ہم سے بڑی بھاری قیمت لی ہے
اے آزادی کی دلہن
تو بہت خوب صورت ہے
اور تجھ تک پہنچنے کے لیے ابھی
جانے کتنے پل صراط طے کرنے ہیں
اور کتنے کشٹ اٹھانے ہیں
اے آزادی کی دلہن
میں نے اپنے پیاروں کا نذرانہ تجھے دیا ہے
تو اسے قبول کر
اور اپنا حسین مکھڑا مجھے دکھا
کہ تجھے پانے کی بہت چاہ ہے

نظم کے اختتام تک ابن زید کی آواز بھراہٹ کا شکار ہو چکی تھی جبھی وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ پہلے کی نسبت بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا البتہ بوندا باندی ہنوز جاری تھی۔ اس کے جلتے چہرے پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ بارش کی نمی بھی اس کا چہرا بھگونے لگی۔ سرد ہوا کے جھونکے اس سے ٹکرانے لگے۔ بارش میں بھیگی وادی کا حسن کچھ اور بھی گہرا ہو چکا تھا۔ چہار اطراف گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا وجود بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ سڑک کنارے ڈھلوان سے نیچے جاتا راستہ دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر احتیاط سے اس راستے پر نیچے اترنے لگا۔ یہ راستہ پہاڑوں کے دامن سے وادی سے درختوں کے بیچ سے باہر مین سڑک تک جاتا تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی سے اوپر مین سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کے شیشے چمک مارتے اور دور افتادہ ہارن بھی سنائی دیتے تھے۔ راستہ کچا تھا اور بارش کی وجہ سے کیچڑ بھی ہو رہی تھی ساتھ پھسلن بھی، وہ جب باہر آ رہا تھا تو روشنی نے پیچھے سے پکار کر اسے زیادہ دور جانے سے منع کیا تھا مگر اس وقت وہ ہر احتیاط بھلائے

ہوئے تھا۔اپنے دھیان میں چلتے اچانک ہونے والی فائرنگ نے اسے چونکا دیا۔اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔کچھ فاصلے پر دو بھارتی فوجی سڑک کنارے ہوائی فائر کرتے نظر آئے۔اس کے رک کر اوپر دیکھنے پر انہوں نے اس کی طرف پراسرار مسکراہٹ اچھالی۔درمیانی فاصلہ زیادہ ہونے کی بنا پر وہ ان کی بات سننے سے قاصر رہا تھا۔ان کی خباثت سے مسکراتی تمسخر اڑاتی آنکھیں خود پر جمی دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی البتہ اس نے دانستہ اپنا راستہ بدل لیا۔ابھی اس کے مجاہدین میں شامل ہونے کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ورنہ وہ اتنی آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔اسے روشنی کی ہدایت یاد آئی تھی جو اسے یوں باہر نکلتے دیکھ کر اس نے تشویش میں مبتلا ہو کر کی تھی۔اس نے گہرا سانس بھرا اور واپسی کو پلٹ گیا۔اب جن راستوں کا وہ مسافر تھا اس طرح میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں جان ہار جانے میں بہت فرق تھا۔وہ اپنی دھرتی ماں کو غلامی سے نجاتِ دلانے کے لیے اپنے وجود کی طاقت کا بھرپور استعمال کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

میرے سوا مرے مقتل مقام کس کا تھا
کہو کہ اب لبِ قاتل پر نام کس کا تھا
ہماری لاش پر ڈھونڈو نہ انگلیوں کے نشاں
ہمیں خبر ہے عزیزو یہ کام کس کا ہے
وہ مطمئن تھے بہت قتل کر کے محسن کو
مگر یہ ذکرِ وفا صبح و شام کس کا ہے
یہ تخت و تاج سب انہیں مبارک ہوں
مگر یہ نوکِ سناں احترام کس کا ہے
فنا کے ہانپتے جھونکے ہوا سے پوچھتے ہیں
جبینِ وقت پر نقشِ دوام کس کا ہے
تمہاری بات تو حرفِ غلط تھی مٹ بھی گئی
اتر گیا جو دلوں میں کلام کس کا ہے

اس کی نگاہ ٹھٹکی تھی پھر بہت سرعت سے سطروں پر بکھرتی چلی گئی جیسے جیسے پڑھتا گیا ویسے ویسے پیشانی پر ناگواری کی شکنیں گہری ہوتی چلی گئی تھیں۔لبوں کو سختی سے باہم بھینچے وہ ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھا اور جھپٹ کر اخبار اٹھاتا ہوا دندناتا عبدالرحیم کے کیبن میں آ گیا اور اسی شدید

تند انداز میں اخبار اس کے سامنے ٹیبل پر پٹخ دیا تھا۔

"واٹ از دس؟"

غیض سے بھری ہوئی بھینچی ہوئی سرد آواز پر عبدالرحیم جو اسے آندھی طوفان کی طرح آتے دیکھ چکا تھا اخبار پر ایک نگاہ ڈال کر اسی اطمینان سے ٹائپنگ میں مصروف رہ کر بے نیازی سے بولا تھا۔

"دس از نیوز پیپر" ربشس اتنا بھی نہیں جانتے؟

انداز کی غیر سنجیدگی نے محب کے غصے اور طیش کو ہوا دی تھی۔محب عبدالقدوس نے انگاروں کی مانند دہکتی آنکھوں کو اس کے مطمئن چہرے پر ٹکا کر اس کے ٹائپنگ میں مصروف ہاتھ اپنے فولادی ہاتھ میں دبوچ کر بے دردی سے مروڑ دیئے۔

"اُف ظالم لڑکے! کچھ ہوش کے ناخن لو۔میں تمہاری وہ گرل فرینڈ نہیں ہوں جو اس مہم کے دوران تمہیں ملی اور تم پر فریفتہ ہو بیٹھی"

عبدالرحیم ہنوز غیر سنجیدہ تھا البتہ بلبلاہٹ میں حقیقت کا رنگ ضرور تھا۔

"شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ! میں پوچھ رہا ہوں یہ کیا حرکت ہے؟ کیوں کیا تم نے یہ سارا کچھ؟ کیا میں سمجھوں کہ تم سے شیئر کر کے میں نے غلط کیا، تمہیں یہ من و عن تو نہیں چھاپنا چاہئے تھا"

محب کی برہمی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔"ایک گمنام سپاہی" کے نام سے چھپے عبدالرحیم کے کالم پہ اس کی نگاہ ایک مرتبہ پھر جا کے ٹھہری تو اس کا فشار خون بڑھنے لگا تھا۔

"یار تم تو یوں آپے سے باہر ہو رہے ہو جیسے میں نے کوئی جرم کر دیا ہے خراجِ تحسین پیش کیا ہے تمہاری شجاعت کو عوام کے سامنے ہیرو بنایا ہے، کیا حرج ہے اس میں آخر......؟"

عبدالرحیم پر اس کی سنجیدگی کا رتی برابر اثر نہیں تھا۔

"حرج ہے عبدالرحیم! حرج ہے۔تم جانتے ہو میں ہاٹ ٹاپک نہیں بننا چاہتا۔میرا مقصد شہرت نہیں ہے، میں اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہوں اینڈ ڈیٹ سیک!"

وہ دانت پیس کر بولتا چلا گیا۔تب عبدالرحیم نے ٹھنڈا سانس کھینچا تھا۔

"ہاٹ ٹاپک تو تمہاری پرسنالٹی کب کی بن چکی ہے محب! پھر اب اس میں کیا حرج ہے؟ سپاہی مقبول حسین بہت پسند کرتی ہے عوام انہیں مگر کب سے......؟ محض چند مہینے قبل سے نا......وہ بھی اس طرح کہ ٹی وی پر ان کا ڈرامہ آیا۔آج کے دور میں لوگوں کو اویرنیس دینا پڑتی

ہے۔تب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ کون کتنا گریٹ ہے۔کیا سمجھے؟''

عبدالرحیم کے مسکرا مسکرا کر دی گئی وضاحت اور صفائی پر بھی محب نے دانت بھینچے رکھے تھے۔

''تو تم باز نہیں آؤ گے؟''

''نہیں!!!''

عبدالرحیم نے ڈھٹائی کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے فی الفور صاف جواب دیا تھا۔پھر تیز ہو کر کسی قدر رشاکی انداز میں بولا تھا۔

''تم مانتے تھے میری بات! گئے تھے نا وہاں۔موت کو چھو کر لوٹے ہو۔اگر تمہیں کچھ ہو جاتا محب پھر......''

محب نے دیکھا عبدالرحیم کی آنکھوں میں ہراس دیکھا تو سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

''تو یہ انتقامی کاروائی تھی؟''

اس نے تپتی ہوئی نظروں سے عبدالرحیم کو دیکھا

''نو! یہ خراج تحسین تھا''

''باس''

محب عبدالقدوس اسے ٹوکتے ہوئے چیخ پڑا۔تو عبدالرحیم ہنسنے لگا تھا۔

''کیوں نہیں آشکار کرنا چاہتے اپنی شخصیت کو ہاں بولو؟ ڈرتے ہو نا؟''

''میں کسی سے نہیں ڈرتا''

وہ حلق کے بل چیخا! عبدالرحیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دربارِ وطن میں سب ایک دن جب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو! وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

اس نے کراہ کی آنکھیں کھولیں تھیں۔اس کا ذہن دھند سے بھرا ہوا تھا تو پورے وجود میں جیسے کسی نے میخیں گاڑھ دی تھیں۔اس کے کراہنے کی آواز پر ہی یقیناً کوئی اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔ابن زید نے پہلے چار پائی کے چرچرانے کی آواز سنی تھی پھر قدموں کی نزدیک ہوتی

آہٹ۔اس کے بعد ایک ہیولہ اس کے اوپر جھک آیا تھا۔

''کیسا محسوس کر رہے ہو بیٹے اب خود کو؟''

وہ نحیف آواز بوڑھے آدمی کی تھی۔ابن زید نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھولی تھیں۔

باریش سفید لباس میں ایک بزرگ اس کے اوپر جھکے اس کی پیشانی چھو کر دیکھ رہے تھے۔

''میں کہاں ہوں؟''

وہ کراہا۔اور کمزور آواز میں دریافت کیا تھا۔

''بیٹے آپ کپواڑہ کے نزدیک ایک گاؤں میں ہو۔ہم جانتے ہیں آپ مجاہد ہیں۔آپ پریشان نہ ہوں یہاں آپ کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے''

اسے مضطرب اور پریشان دیکھ کر بزرگ نے بے اپنائیت آمیز انداز میں تسلی دی۔

ابن زید نے بے اختیار پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔یہ بات وہ بھی اچھی طرح سے جان گیا تھا کشمیری ''مجاہدین'' کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جاتے تھے۔یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے۔اس کا نام کیا ہے۔کہاں سے آیا ہے؟ وہ اس سے بہت سارے رشتے جوڑ لیتے تھے۔بھائی و بھتیجا و بیٹا! وہ حیران ہوا کرتا کہ اتنے جذبات اتنی قربانیوں کے باوجود اب تک کشمیری قوم کو آزادی کیوں نہیں مل رہی۔یہ جذبے تو زنجیریں کاٹ دیتے ہیں اور حوصلے پتھروں کو پانی کر دیتے ہیں۔وہ خود دو بار شدید زخمی ہو گیا تھا۔ایک بار اودھم پور میں فوجی کیمپ پر راکٹ حملہ کر کے واپس آتے ہوئے وہ ایک نالے میں گر گیا تھا جو سوکھا ہوا تھا۔پہاڑوں پر برف پگھلتی تو نالہ پانی سے بھر جاتا۔اور ایک بار جب وہ خود کیموفلاج کر کے پسپائی اختیار کر رہے تھے۔بھارتی فوجیوں کی کارپٹ فائرنگ سے اس کا شانہ زخمی ہو گیا تھا۔اور اس مرتبہ وہ حادثاتی طور پر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا اور بھارتی فوج کے ہتھے لگتے لگتے رہ گیا تھا۔اتنے عرصے سے ''مجاہدین'' کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑی تھی کہ اب تک تو وہ بھارتیوں کی رگ رگ سے واقف ہو گیا تھا۔وہ لوگ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچنا چاہتے تھے مگر راستے میں چھپتے چھپاتے بھی انہیں جگہ جگہ بھارتی فوج سے ٹکراؤ کا خطرہ تھا۔کل وہ جس گاؤں کے مکان میں چھپے تھے اس سے اگلی صبح تازہ دم ہو کر انہیں اپنا سفر پھر سے شروع کرنا تھا مگر گاؤں میں مقیم ان کے مخبر کی اطلاع پر وہ کچھ اور بھی محتاط ہو گئے تھے۔بھارتی آرمی کے ٹرکوں کی آمد خطرے سے خالی نہیں تھی۔اب انہیں جتنی جلدی ممکن ہوتا یہاں سے نکلنا تھا۔یقیناً بھارتی آرمی کو شبہ ہو گیا تھا کہ کپگام کیمپ جانے والے فوجیوں پر حملہ کرنے والے مجاہد گاؤں میں چھپ گئے ہیں اور اب گاؤں والوں کی شامت آنے والی تھی۔ابن

زید نے اپنی مجاہدانہ تین سالہ زندگی میں کتنی بار ایسے مظالم دیکھے تھے کہ اچانک ہی بھارتی فوجی کسی قبیلے کسی گاؤں میں گھس جاتے اور وہاں کے مکینوں کو پکڑ کر گھر سے باہر نکلنے کا حکم دیتے اور تلاشی لینے کے بہانے لوٹ مار کرتے اور گھروں کو جلا دیتے۔ نوجوانوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ عورتوں کو بے عزت کرتے، بوڑھوں اور بچوں کو بلاوجہ زدوکوب کرتے اور کشمیری بہت حوصلے سے یہ سب برداشت کرتے اور مجاہد کے متعلق کوئی خبر نہ دیتے۔ ابن زید کی جماعت کے اس مہم کے کمانڈر ''سالار احمد'' تھے انہی کے حکم پر انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر اپنی اس عارضی پناہ گاہ کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ جب وہ لوگ نکلے تو بازار کھل گئے تھے اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی کمانڈر سالار احمد کو اس تاخیر سے تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ مختلف گلیوں سے ہوتے گزر رہے تھے جب کمانڈر ایک دم رک گئے تھے ان کا انداز بے حد چوکنا تھا۔

''یہ فوجی گاڑیوں کی آواز ہے۔ بکھر جائیں سب!''

انہوں نے سرگوشی کی اور ابھی وہ سب ادھر ادھر ہو ہی رہے تھے کہ کلاشنکوف کی گولیوں کی آواز آئی ابن زید نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا تھا۔ سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا تھا ایک بوڑھی خاتون نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ابن زید نے اندر داخل ہونے سے قبل مڑ کے دیکھا کمانڈر اور اس کے دوسرے ساتھی گلی میں نہیں تھے۔ بہت دیر تک فائرنگ کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ فائرنگ جس میں چیخیں اس نے کئی بار باہر جانے کو قدم بڑھائے مگر خاتون خانہ نے ہر بار اسے روک دیا تھا۔

''نہیں بیٹے! آپ کا باہر جانا خطرناک ہے''

ابن زید ہر بار دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان سنا تھا بھارتی فوج سب کو باہر آنے کا کہہ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے اگر کسی نے کسی مجاہد کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے تو خود ہی فوج کے حوالے کر دے نہیں تو معلوم ہونے پر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے ابن زید نے مضطرب ہو کر دیکھا۔ خاتونِ خانہ بہت اطمینان سے کھڑی تھیں۔ پھر اس نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دوسرے کمرے میں آ کر مکان کی پچھلی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا پھر اسے جانے کا اشارہ کیا تھا۔ ابن زید تیزی سے آگے بڑھا تھا جب نیم تاریک کمرے کے کسی کونے سے کوئی سرعت سے آگے بڑھا اور ایک دم سے اس کی کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

''ابن زید تم!''

ابن زید کو صحیح معنوں میں جھٹکا لگا تھا۔ اس نے تھرا کر پلٹ کر دیکھا اور جیسے زمین آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ اس کے سامنے کوئی اور نہیں ضویا کھڑی تھی۔

''مجھے اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے ابن زید کہ تم واقعی میرے سامنے کھڑے ہو''

پتا نہیں کن کن احساسات کے ہمراہ اس کی آواز پر لرزش طاری تھی۔ ابن زید ہنوز ساکن کھڑا تھا۔

''مجھے معاف کر دو ابن زید! تمہیں کھونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنی غلط تھی میں تمہاری قدر نہیں کر سکی تھی۔ تبھی سزا کے طور پر میں برباد ہو گئی ہوں''

وہ رو رہی تھی سسک رہی تھی۔ ابن زید جیسے حواسوں میں لوٹ آیا۔ خاتون خانہ کا ضویا سے کیا تعلق تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ ابن زید نے ایک نظر خاتونِ خانہ کو دیکھا جو ششدر نظر آ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر ادھ کھلی کھڑکی کی جانب لپکا تھا جبھی ضویا نے یقیناً اس کا ارادہ بھانپا تھا اور تڑپ کر اس کے راستے میں آ گئی۔

''ابھی مت جاؤ ابن زید! کم از کم مجھے معافی مانگنے کی مہلت تو دو۔ مجھے اپنے جرم کا اعتراف تو کرنے دو''

ابن زید نے ان سنی کر دی تھی اگلے لمحے وہ کھڑکی سے کود کر تاریک گلی میں اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا، ابن زید کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ ضویا کا یہ غیر متوقع سامنا اور اس کی ذہنی شدید کیفیت ابن زید کو مضطرب کر چکی تھی۔ وہ ہرگز نہیں جانتا تھا اس پر کیا بیتی تھی نہ وہ اس کے متعلق کچھ جاننا چاہتا تھا، وہ مسلمان تھا جو ایک سوراخ سے دوسری مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ وہ ڈسٹرب ہوا تھا جبھی کیموفلاج کرنے کی بجائے سیدھا چلتا گیا تھا اور جانے کس سمت سے گولیوں کا ریلا آیا تھا جو اس کے وجود میں آگ بھرتا چلا گیا ابن زید کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

☆☆☆

میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی جب پاس تم نہیں ہوتے
خود کو کتنا اداس پاتا ہوں
گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا۔ دھن سمائی رہتی ہے
اک خاموشی سی چھائی رہتی ہے

دل سے بھی گفتگو نہیں ہوئی
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات سوچتا ہوں میں
تیری ہر بات سوچتا ہوں میں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھو سا جاتا ہوں تیری جنت میں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن
پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
جس کو ہر درجہ چاہتا ہوں میں
اس میں تیرے سی کوئی بات میں
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن

اس نے گہرا سانس کھینچا اور غلام حسین کی انلارج شدہ فوٹو سے نظریں ہٹالیں اسے گئے چار ماہ ہو گئے تھے وہ لوٹا ہی نہ تھا، پتا نہیں خفا تھا یا مصروف کہ اب تو اسے فون کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کتنی عجیب بات تھی جب تک دیا نے اس کی پرواہ نہیں کی وہ اس کی ہر دم توجہ چاہتا رہا اور پھر اس کے دل میں لو جگا کر خود غافل ہو گیا۔ وہ سوچتی تو آنکھیں بھیگنے لگتیں۔ غلام حسین کی بے حسی پر تاؤ آنے لگتا، خواہ مخواہ جھنجلائے جاتی۔ دل کی گھبراہٹ اس پل بھی حد سے تجاوز کرنے لگی تو وضو کی نیت سے اٹھ گئی۔ اللہ کی یاد سے بڑھ کر دلوں کا اطمینان کسی شے میں پوشیدہ نہیں وہ اچھی طرح سے جانتی تھی وضو کر کے باہر آئی تو سیل فون مسلسل وائبریٹ کر رہا تھا وہ بے دلی سے فون تک آئی تھی مگر اسکرین پر غلام حسین کا نمبر بلنک کرتا دیکھ کر اس کا دل ایک دم بہت بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! جیتی رہیے خوش رہیے“

جواباً وہ چہکا تھا۔ دیا کے ہونٹوں پر حجاب آلود مسکان بکھر گئی۔

”کیسی ہیں زوجہ!“

”آپ کو کیا؟“

وہ جواباً نروٹھے پن سے بولی تو غلام حسین نے سرد آہ بھری تھی۔

ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پر روٹھا نہ کرو

”فضول کی باتیں چھوڑیں۔ جو کہنا ہے وہ کہیں“ غلام حسین کے بے ساختہ پڑھے گئے شعر پر وہ اسی شدید موڈ میں بولی تھی۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی اور اس ستمگر کی چارہ گری کی بھی خواہاں تھی۔

”دیا کیا تم کبھی بھی مجھ سے محبت نہیں کرو گی؟“

گھمبیر لہجے میں کیا گیا سوال دیا کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکانے لگا۔ اس نے بے اختیار ہونٹ کا نچلا کنارہ دانتوں تلے دابا تھا۔ دل میں آئی اسے بتا دے مگر وہ ہرگز بھی دل کی ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ ہار بھلے بہت حسین تھی مگر تھی تو ہار ہی نا۔

”کوئی بات کرو نا یار! اتنے عرصے بعد فون کر رہا ہوں“

اس کی خاموشی پر غلام حسین ٹوک گیا تھا۔ دیا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”کیا بات کروں؟“

”ارے...... یہی پوچھ لو کب آؤں گا؟“

وہ ہنسا جبکہ دیا کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

”میں کیوں پوچھوں؟ جب عیاشی ختم ہو گی خود تشریف لے آئیں گے“

اس کے طنزیہ لہجے پر غلام حسین نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

”ہمیشہ نیگیٹو کیوں سوچتی ہو تم؟“

”آپ کے کام میں اصلاح کا پہلو نکالنا بھی چاہیں تو ناکامی ہی ہوتی ہے“

وہ پھر زہرخند ہوئی۔

”یہ موضوع متنازع ہے ہم کسی اور ٹاپک پر بھی تو بات کر سکتے ہیں“

غلام حسین نے نرمی و حلاوت سے بات بدلنا چاہی۔

”مثلاً اور کون سا موضوع؟“

دیا نے نخوت سے سوال کیا تھا جبکہ غلام حسین شرارت کے موڈ میں آ گیا۔

''ہم اپنے ہونے والے بچے کی بھی تو بات کر سکتے ہیں دیا! او کے تم بتاؤ کیا نام رکھنا چاہیے، ہمیں اپنے بچے کا؟''

دیا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر را تھا۔

مجھے نہیں پتا جو رکھنا ہوا خود رکھ لیجیے گا۔

''مجھے ''اسامہ'' نام بہت پسند ہے دیا! ہمارے بیٹے کا نام تم اسامہ رکھنا او کے؟''

''ضروری تو نہیں ہے بیٹا ہی ہو؟''

وہ پتا نہیں کیوں جھنجلانے لگی۔

''چلو اگر بیٹی ہوئی تو تم اپنی پسند کا نام رکھ دینا''

''اس عنایت کا بہت شکریہ'' وہ پھر طنزیہ ہوئی۔ غلام حسین ہنسنے لگا۔

''بیگم صاحبہ ہم تو ایسی بہت سی عنایتیں کرنے کو تیار ہیں مگر آپ موقع بھی تو دیں''

دیا کا چہرا سرخ پڑ گیا۔

''کب آ رہے ہیں آپ؟''

وہ سٹپٹائی تھی اور اسی سٹپٹاہٹ میں ایک بے حد غلط سوال کر دیا۔ غلام حسین کا جتلاتا ہوا جاندار قہقہہ اسے خفت سے روہانسا کر گیا تھا۔

''ثابت ہو گیا بیوی تم محض اکڑ دکھا رہی ہو اب ورنہ حقیقت کچھ اور ہے''

وہ چھیڑنے اور جتلانے سے باز نہیں آیا۔ انداز کی سرمستی بے حد واضح تھی۔

''زیادہ فرینک اور خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے آپ؟ میں نے اس لیے پوچھا کہ اب ہم مستقیم بھائی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ زینی کے ساتھ۔ آپ کی یہاں موجودگی تو ضروری ہوگی نا؟''

وہ بے حد چڑ کر وضاحتیں اور صفائیاں پیش کرنے لگی۔ غلام حسین نے بہ مشکل ہنسی روکی تھی۔

''بہت ظالم ہو بیوی! خوش فہمی کو ہی قائم رہنے دیا ہوتا''

وہ مصنوعی تاسف سے بولا تو دیا نے اسے ٹوکا تھا۔

''اچھا ادھر ادھر کی باتوں میں ٹائم ضائع نہ کریں۔ پپا اور دادو آئے تھے یہاں پھپھو سے رشتے کی بات کرنے۔ معاملہ طے ہی ہے۔ بتایا ہوگا پھپھو نے آپ کو؟ آ جائیں تا کہ رسم کی جا سکے''

''او کے جناب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر''

وہ مؤدب ہو کر بولا تھا اور پھر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

خونِ جگر دے کر نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

بالآخر وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ حزب کے دفتر سے چند مجاہدین عازمِ سفر ہوئے تو وہ بھی ساتھ تھا۔ شام ڈھلے وہ مظفر آباد پہنچے تھے اور وہاں حزب کے آفس الکرم میں اپنا نام درج کرا کے سکندر نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا تھا۔ چاروں طرف شہداء کی تصاویر سجی ہوئی تھیں اور تصویروں کے نیچے ان کے جہادی نام لکھے ہوئے تھے۔

خوش قبائے شہادت عطا ہوتی ہے تجھے
تو بارگاہِ رسالت ﷺ میں بازیاب ہوا

وہ بے اختیار آگے بڑھ آیا۔ اور ایک ایک تصویر کو بغور تکتے ہوئے اپنی آنکھوں کو بھیگتا محسوس کرنے لگا۔ یہ آزادی کے متوالوں کی داستان تھی۔ یہ کیسی داستان تھی جس کا عنوان ''امید'' تھا جو ہر روز ایک امید سے شروع ہوتی تھی اور اگلے دن پھر نئی امید سج جاتی تھی اگر یہ سفر تھا تو درد سے بھرا ہوا جس منزل کی جانب رواں تھا اسے جانے کب ملنا تھا۔ کون جانتا تھا۔ شدت جذبات سے اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''اے شہیدو کی روحو! ''رب العزت'' کی بارگاہ میں دعا کرو کہ تمہاری قوم کے بیٹوں میں آزادی کا جذبہ اور عزم زندہ رہے کہ وہ اس خاک کی تقدیس کو بھول نہ جائیں جس پر تمہارا خون گرا ہے''

اسے خبر تک نہ ہوئی اور آنسو اس کی پلکوں کی دہلیز پھلانگ کر رخساروں پر اتر آئے۔

''مجاہد رویا نہیں کرتے''

اس کے نزدیک آ کھڑے ہونے والے کمانڈر نے اس کا کاندھا تھپک کر نرمی سے کہا تھا وہ تب چونکا۔

''یہ شکرانے کے آنسو ہیں۔ ان عظیم شہداء کے حضور نذرانہ عقیدت ہے۔ جنہوں نے اللہ کے پیغام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا اور اپنے آنسو پونچھ دیئے تھے۔ اور وہیں انہیں

کشمیر سے چند مجاہدین کی ایک معرکہ میں شہادت کی خبر ملی تھی تو اس کے دل کی سوگواری میں یکلخت اضافہ ہو گیا۔

''ان کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ کشمیر اپنی منزل پائے گا انشاء اللہ! اس نیلے آسمان تلے وہ صبح ضرور طلوع ہو گی۔ جب کوئی غلام نہ ہو گا۔ جب کشمیر کی صبحیں اور شامیں خوش رنگ ہوں گی۔ جب چناروں کی سرزمین پر کسی کا لہو بے گناہ نہیں بہے گا۔

اس نے ایک عزم سے سوچا تھا اور پھر سسکتے دل کے ساتھ ''رب العزت'' کی بارگاہ میں اپنی گزارش پہنچانے لگا۔

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
خدا کرے نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن!
اور اس کے حسن کو تشویش و ماہ وسال نہ ہو
ہر ایک شخص ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ میرے ایک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو
خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

☆☆☆

پھپھو کے ساتھ وہ ویکلی چیک اپ کے بعد لوٹی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ دیا نے آتے ہی وضو کیا تھا اور نماز کی ادائیگی کو جائے نماز پر آ کھڑی ہوئی۔ دعاؤں میں طوالت اور عاجزی ان دنوں کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ جائے نماز تہہ کر کے رکھ رہی تھی جب گیٹ پر غلام حسین کی گاڑی کا ہارن مخصوص انداز میں بجا تھا۔ اس کی بے ترتیب دھڑکنیں کچھ اور بھی انتشار کا شکار ہو

کر رہ گئیں۔ اس کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اس کا جسم لرزنے لگا تو وجود میں ایک انوکھا سا خمار چھاتا چلا گیا۔ وہ اپنی کیفیت پر خود حیران ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد غلام حسین کے قدموں کی آواز دروازے کے پاس آتی محسوس ہوئی تو اس کا دل دھڑک دھڑک کر باؤلا ہو رہا تھا اور چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اگلے لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر آ چکا تھا۔ دیا دل کی خواہش کے باوجود نگاہ اٹھانے کی تاب نہیں لا سکی۔

''السلام علیکم! کیسی ہو؟''

وہ پل کی پل اس کے پاس رکا تھا پھر آگے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دیا نے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ جواباً اس پر سلامتی بھیجی اور مزید خود پر جبر کیے بنا نگاہ بھر کے اسے دیکھا۔ غلام حسین کی سرخ وسفید رنگت ماند پڑ رہی تھی تو آنکھوں کی چمک بھی قدرے کم تھی۔ آرمی کٹ ہیئر اسٹائل میں فریش شیو کی نیلاہٹوں کے باوجود وہ اتنا فریش اور بھرپور نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسا کہ عموماً نظر آیا کرتا تھا۔

''مما پپا گھر پر نہیں ہیں کیا؟''

وہ اپنے دھیان میں کوٹ اتارنے کے بعد کلائی سے رسٹ واچ کو الگ کرتے ہوئے بولا اور ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ مگر اگلے لمحے اس کی اتنی توجہ پا کے چونک اٹھا۔ اور اسے چونکانے کو کس قدر شرارتی انداز میں کھانسا۔

''خیریت بیوی! آپ اور ہمیں اتنے دھیان سے دیکھیں! ناممکن!''

دیا جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ ٹپٹا کر نہ صرف نظریں چرائیں بلکہ رخ بھی پھیر لیا تھا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ، حیا آمیز خفت اتنی انوکھی اتنی نئی نویلی تھی کہ غلام حسین تو جیسے اپنی جگہ پر ساکن ہو کر رہ گیا وہ تو ہمیشہ اس کی جسارتوں پر آگ بگولہ ہی ہوئی تھی۔ اس کی شوخی اور استحقاق دیا کو کبھی بھی جھینپنے نہیں دیتا تھا بلکہ موڈ آف کر دیا کرتا تھا۔ یہ اب کے نیا انداز اپنے اندر ایسی دلربائی لیے تھا کہ غلام حسین گنگ ہونے لگا۔ معاً وہ سنبھلا تھا اور گلا کنکھار کر کسی قدر شوخی سے بولا تھا۔

''بیوی یہ آپ کی قائم کی گئی حد بندیاں ہیں کہ ہم اپنے اختیارات کے باوجود محدود ہو چکے ہیں ورنہ اس ہجر وفراق کے بعد ملن کے اس موقع کو ایسا یادگار بناتے کہ آپ کبھی بھول نہ پاتیں۔''

وہ اس کے نزدیک آ گیا اور اس کے ہاتھ نرمی سے تھام کر مسکرایا تھا۔ دیا کی کیفیات متضاد ہو رہی تھیں۔ یہ التفات بھا بھی رہا تھا مگر اس سے شاکی اور خفا بھی تھی جبھی ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے نکل گئی۔ غلام حسین نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

جب کوئی پیار سے بلائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا
جب کوئی ستارہ ٹمٹمائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا

دیا نے خفگی سے اسے گھورنا چاہا مگر وہ بدستور شرارت کے موڈ میں تھا۔

لذتِ غم سے آشنا ہو کر
اپنے محبوب سے جدا ہو کر
جب دل کہیں سکوں نہ پائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا۔

"پلیز غلام حسین چپ ہو جائیں"

وہ سخت عاجز ہو کر ٹوک گئی تھی۔ غلام حسین نے منہ لٹکا لیا۔

"نہیں پسند آیا یہ گانا؟ اٹس او کے دوسرا سناتا ہوں"

اس سے پہلے کہ وہ اسے ٹوکتی وہ پھر سے شروع ہو چکا تھا۔

پل ہن سانواں دے نے تھوڑے
جان لئی نہ جان وچھوڑے
جند ہوگئی کملی تیرے ہجر رلی
ہوگئی مجبور حیاتی نیندر نئیں آندی

پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ اسے دیا نے بے اختیار دہل کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے غلام حسین! فار گاڈ سیک ایسی باتیں نہ کریں"

وہ روہانسی ہو گئی تھی جبکہ غلام حسین ہنستا چلا گیا تھا۔

"افوہ بیوی! تم کیا سمجھیں اس طرح کے گانے گانے سے کوئی سچ مچ مر بھی جاتا ہے؟"

وہ یونہی ہنستے ہوئے سوال کر رہا تھا۔ دیا نے جھلملاتی آنکھوں سے ہونٹ باہم بھینچ کر اسے خفگی سے دیکھا۔

"کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟"

اس نے بھیگتی آواز میں سوال کیا تھا۔

"اس لیے کہ تمہیں کچھ کہنے پر اکسا سکوں" گویا میرا اندازہ درست تھا؟"

"کون سا اندازہ؟"

دیا نے حیرانی سے دیکھا۔

"یہی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے"

وہ اسے بغور تک رہا تھا۔ دیا بے ساختہ اسے گھورنے لگی پھر کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے مڑ کر چلی گئی۔ غلام حسین ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

درِ فنا میں میں نقشِ بقا چھوڑ جاؤں گا
میں اپنے بعد اپنی صدا چھوڑ جاؤں گا
ہیں اور بھی چمن میری خوشبو کے منتظر
میں اس چمن کو مثالِ صبا چھوڑ جاؤں گا
لے جاؤں گا میں اپنی وفاؤں کو اپنے ساتھ
اور ان کے پاس یادِ وفا چھوڑ جاؤں گا
جو میرے دل پر زخم لگاتے رہے سدا
میں ان کے واسطے بھی دعا چھوڑ جاؤں گا

"کیوں ملنا چاہتی تھی آخر تم مجھ سے! ایسی کون سی ضروری اور خاص بات ہے جو تم فون پر نہیں کر سکتی تھیں"

محب عبدالقدوس بے حد جھنجلاہٹ کا شکار ہوا اس کے سامنے تھا۔ سویٹی نے پیاسی، بے تاب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ یہ ایک غیر معروف ہوٹل تھا۔ بلکہ اسے چھپر ہوٹل کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ وہاں زیادہ تر تعداد مزدور پیشہ لوگوں کی تھی جن کی توجہ ان دونوں کی بجائے ٹی وی پر چلتی کسی انڈین موی کے رومینٹک سین میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود محب بے حد بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

مخمل پہن کے بھی میری قیمت نہ بڑھ سکی
کھدر بھی اس کے جسم پر مہنگا لگا بہت

وہ اس کی بات کے جواب میں بولی تھی اور بولی تھی تو کیا......؟ محب عبدالقدوس کا دماغ گویا غصے کی زیادتی سے آؤٹ ہونے لگا۔ وہ اس وقت بھی اپنے مخصوص حلیے میں تھا۔ بد رنگ گھسی ہوئی جینز پر بلیک ٹی شرٹ جس کا رنگ کئی جگہ سے اڑ چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریشمی داڑھی اور

شانوں پر جھولتے بے حد گھنے مگر سلکی بال، جن میں آوارہ گردی کی دھول اڑتی تھی۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ لڑکی اس پر فریفتہ ہو بیٹھی تھی تو محبّ اسے اس کی بے باکی اور سطحی سوچ سے بڑھ کر کیا نام دے سکتا تھا۔

’’واٹ ربش! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کسی سے عام طور پر ملتا نہیں ہوں۔ تم سے ملنے پر بھی صرف اس صورت آمادہ ہوا تھا کہ تم بقول تمہارے مجھ پر کچھ اہم انکشاف کرنے والی ہو‘‘

ماتھے پر تیوریاں لیے وہ بڑے جتلانے والے انداز میں بولا تھا۔ سوئٹی کا رنگ پھیکا پڑا۔

’’ہاں! میں جانتی ہوں۔ اس کے بغیر تم مجھے کسی صورت ملنے نہ آتے‘‘

وہ اس وقت سیاہ عبایا میں ملبوس تھی چہرہ تک چھپائے۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ محبّ نے تو اسے پہچانا تک نہیں تھا۔ وہ کبھی اس سے ملنے پر آمادہ نہ ہوتا اگر وہ عجیب لڑکی اپنی عجیب حرکتوں کی وجہ سے اس پر حیرتوں کے در وانہ کرتی وہاں قید کے دوران! اس نے اگر اپنا امیج خراب کیا تھا اور پھر جس طرح اس کو اہمیت دی تھی اور اپنا ریوالور چپکے سے اسے ضرورت پڑنے پر استعمال کرنے کو دیا تھا اور پھر اس کی ششدر صورت دیکھ کر ہنسی تھی۔

’’حیران مت ہو۔ میں بھی انسان ہوں محبّ! اور سمجھو تمہاری خاطر کوئی رسک لینا چاہ رہی ہوں‘‘

’’تم میری خاطر یہ رسک نہ لو‘‘

اس نے نخوت سے کہہ کر ریوالور لوٹانا چاہا تھا۔

’’میں تم پر یہ احسان نہیں کر رہی ہوں محبّ! بلکہ تم یہ رکھ کر مجھ پر احسان کرو گے۔ یہ بہت سفاک لوگ ہیں۔ زندگی لینا ان کے نزدیک معمولی سا کام ہے۔ جبکہ میں چاہتی ہوں ابھی تمہیں کچھ نہ ہو۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس لیے کہ اس ملک کو تم جیسے لوگوں کی بہت اشد ضرورت ہے گو کہ میرا ضمیر مردہ ہو چکا ہے مگر تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا ہے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے‘‘

اس نے آہستگی سے کہا تھا اور پسٹل اس کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ محبّ وہاں سے واپس آ جانے کے بعد بھی اس کے اس عمل پر اکثر حیران ہوا کرتا تھا۔ پھر جب سوئٹی نے خود اس سے رابطہ کر کے ملنے اور کچھ انکشاف کرنے کا کہا تو محبّ کسی طرح بھی خود کو باز نہیں رکھ سکا تھا۔ جانے کیوں اسے لگتا تھا اس طرح شاید اسے کچھ نہ کچھ کلیو ضرور ملے گا۔

’’تمہیں اندازہ ہے محبّ کہ تم کس درجہ خوبصورت ہو؟ بلیو می جب میں نے تمہیں پہلی

بار دیکھا میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے‘‘

محبّ کی آنکھیں ایک دم سے دہک کر رہ گئیں۔ اس کی دھاڑ نے سوئٹی کو دبک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کتنی دیر اسے ڈانٹنے اور شرم و حیا پر لیکچر دینے کے بعد اٹھنے لگا تو سوئٹی نے گھبرا کر سٹپٹا کر اسے روکا تھا۔ تو وہ بھڑک اٹھا۔

’’دیکھو تمہارے عورت ہونے کی وجہ سے میں تمہارا بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ مگر تمہیں خود اپنی عزت کروانا نہیں آتی‘‘

محبّ کا موڈ جس حد تک بگڑا ہوا تھا اسی لحاظ سے وہ اس پر برس پڑا تھا۔

’’مرد کو مغرور نہیں ہونا چاہئے۔ حسین تو بالکل نہیں ورنہ وہ تمہارے جیسے عجیب و غریب ہو جاتے ہیں‘‘

وہ جواباً اسی اطمینان سے مگر سرد آہ بھرے بولی تو محبّ عبدالقدوس نے جھلستی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

’’آخر تم چاہتی کیا ہو؟‘‘

’’تمہیں صرف تمہیں؟‘‘

جواب برجستگی اور بے ساختگی لیے ہوئے تھا۔ مگر محبّ کو ہتھے سے اکھاڑ کر رکھ گیا۔

’’شٹ یور ماؤتھ۔ اب اگر تم نے ایسی فضول بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا‘‘

’’وہ تو اب بھی نہیں‘‘

سوئٹی نے جواباً سرد آہ بھری تھی۔ محبّ نے ہونٹ بھینچے اور اسے وہیں چھوڑتا لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

نسیم باغ جھیل ڈل کے کنارے حضرت بل درگاہ کے پہلو میں واقع ہے جھیل ڈل کے وسط میں چناروں سے گھرا جزیرہ ہے اور دوسرے کنارے پر نشاط اور شالیمار باغ ہیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی نسیم باغ پہنچا تھا۔ سورج کی رخصت ہوتی کرنوں نے چناروں کے بلند قد درختوں میں جو جزیرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے گویا آگ لگا رکھی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ یہ حسین منظر دیکھ کر مبہوت رہ گیا جھیل ڈل کے پانیوں میں چند کشتیاں کھڑی تھیں اور کچھ ملاح آنے والوں کی طرف لپک کر آتے تھے۔ ابن زید کا دل ملول ہونے لگا۔

’’یہاں کتنا حسن ہے۔ چنار کتنے خوبصورت ہیں۔ ساری وادی ہی حسین ہے مگر یہاں

کے حسن کو گھنلگا ہوا تھا۔ بہت دن پہلے ایک گاؤں میں ایک مجاہدہ نے اسے چنار کے پتے دیئے تھے۔اور کشمیر میں چنار کے پتے دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے ''ہم نے اپنی محبت تمہیں دی'' ابن زید یہاں اپنے مجاہد ساتھیوں کے لیے اہم پیغام لے کر آیا تھا اس وقت اس کا حلیہ عام کشمیری جیسا تھا جو کسی بکروال جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ یہاں اس کی ملاقات بہت راز دارانہ انداز میں ہونا تھی۔ اس کی محتاط نظریں بے تابی سے اپنے ساتھی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں جب وہ ایک دم ساکن ہو گیا تھا۔ سیاہ کشمیری شال اوڑھے چھوٹی بے حد خوبصورت بچی کا ہاتھ تھامے وہ ضویا ہی تھی۔ یہ دوسرا موقع تھا جب کشمیر میں ہی اس کا غیر متوقع طور پر سامنا ضویا سے ہوا تھا اس کا مطلب تھا وہ مستقل کشمیر آ بسی تھی۔ ابنِ زید نے فی الفور نگاہ کا زاویہ ہی نہیں بدلا رخ بھی پھیر لیا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کی یاسیت اور ویرانی جیسے ابن زید کی نگاہوں میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ جبھی سر جھٹک دیا مگر اگلے کئی دن تک وہ لاشعوری طور پر بار بار اسے یاد آتی رہی تھی۔

☆☆☆

دنیا کی لمبی راہوں پر ہم یوں تو چلتے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو یاد ہمیشہ آتے ہیں
ایسے ہی سفر کرتے کرتے اک شخص ملا ہم کو بھی کہیں
دنیا میں اچھے لوگ بہت، لیکن اس کی سی بات نہیں
نہ لاگ تھی اس کی باتوں کی، کی بات نہ کوئی لگاوٹ کی
اس کے فقرے ٹوٹے ٹوٹے اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی
کہہ کر ہی نہ دے جو ہم چاہیں سوچا ہی کئے بیٹھے بیٹھے
پر دیکھے ایسی نرمی سے اک بار تو ہو جائے دھوکہ
گو ساتھ ہمارا خوب رہا اس کو نہ ہوئی پہچان بہت
گر بد بوجھے دل کی بات کبھی ہو جاتا تھا حیران بہت
اور ہم اس کی حیرانی پر شرمندہ ہو کر رہ جاتے
کچھ اور ہمارا مطلب تھا کچھ دیر تلک یہ سمجھاتے
اب چہرا اس کا اجلا ہو یا آنکھیں اس کی ہوں گہری
یا اس کے پیارے ہونٹوں کی ہر بات لگے ٹھہری ٹھہری
کچھ لوگ جو اچھے ہوتے ہیں، اور راہوں میں مل جاتے ہیں

ہیں ان کو اپنے کام بہت کب اپنا وقت گنواتے ہیں
کب پیاسے پیاسے رہتے ہیں کب جی کو روگ لگاتے ہیں

وہ چلتے ہوئے ٹھٹھک کر تھم گئی تھی۔ وہ سامنے تھا جس کے متعلق وہ اس پل پوری شدتوں سے سوچ رہی تھی۔ اپنے مخصوص لاپرواہ حلیئے میں، ہاتھ میں پکڑے کافی کے مگ سے سپ لیتا ہوا گلاس وال کے پار سڑک پر رواں ٹریفک کے اژدھام کو تکتے وہ یقیناً کسی کا منتظر تھا۔ سویٹی کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔

''ہیلو! محبّ! ہاؤ آر یو؟''

محبّ اپنے دھیان میں تھا۔ حیرانی سے مڑا اور اسے روبرو پا کے جیسے ایک دم بدمزا ہو کر رہ گیا۔ پیازی شفیون کے نفیس کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس گنگھریالے بالوں کی گالوں کو چھوتی لٹیں شانوں پر دوپٹہ پھیلائے ہر قسم کی آرائش سے مبرا چہرے پر قدرتی نکھار لئے۔ وہ یکسر بدلے ہوئے روپ کے باوجود محبّ کے لیے کوفت اور بے زاری کا باعث تھی۔

''بیٹھ سکتی ہوں؟''

وہ مسکرائی، محبّ کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ پھر اس کی واضح ناگواری کے باوجود وہ کرسی سنبھال چکی تھی۔

''پلیز محبّ بیٹھ جاؤ، کھانے سے تو رہی تمہیں''

اسے تنفرزدہ انداز میں اٹھتے دیکھ کر وہ لجاجت پر اتر آئی۔ محبّ نے اس کی بات جیسے سنی نہیں اور وہ ٹیبل چھوڑ کر قدرے فاصلے پر دوسری ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ سویٹی نیم باز آنکھوں سے اسے تکتی رہی۔ محبّ کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ نگاہیں بار بار داخلی دروازے کی جانب اٹھتی تھیں، یقیناً وہ کسی کا منتظر تھا۔

''وہ نہیں آئے گا محبّ جس کے تم منتظر ہو''

معاً وہ اچانک اسے مخاطب کر کے اہم اطلاع دے چکی تھی۔ محبّ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تو وہ ناز سے مسکرائی اور کاندھے اچکا کر بولی تھی۔

''تم جیسے لوگ جان ہتھیلی پر لے کر پھرا کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اندھی گولی کا شکار......''

''شٹ اپ! بند کرو اپنی یہ بکواس''

وہ بھڑک کر چیخا تھا۔ کچھ اس درجہ تلخی سے کہ آس پاس موجود لوگ چونک کر کسی قدر

ناگواری سے انہیں تکنے لگے۔محب نے ہونٹ بھینچ کر سرخ آنکھوں سے پہلے اطراف کا جائزہ لیا پھر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے اس کے پاس آ کر رک گیا۔

''کیوں پیچھے پڑ گئی ہو تم میرے؟''

''بتایا تو تھا کہ تم سے محبت کرنے لگی ہوں''

''جسٹ شٹ اپ! دفع ہو جاؤ یہاں سے''

وہ غرایا۔سویٹی کچھ دیر بے حد عجیب نظروں سے اسے تکتی رہی پھر گہرا سانس کھینچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوکے چلتی ہوں، حالانکہ میں تو تمہارے بھلے......''

''نہیں چاہیے مجھے تمہاری یہ بھلائی''

وہ چلایا۔سویٹی نے کاندھے اچکائے اور پلٹ کر چلی گئی۔اس کی ہیل کی سریلی ٹک ٹک ماربل کے فرش پر بہت سروں میں گونجی تھی۔محب عبدالقدوس نے شل ہوتے اعصاب کے ساتھ سر جھکا لیا تھا۔دس منٹ بہ مشکل گزرے ہوں گے جب اس نے حیران کن منظر دیکھا تھا۔سویٹی ہاتھ میں جوتے پکڑے بنا آہٹ کے اس تک آئی تھی اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ کر اپنی حیرت کا اظہار کرتا سویٹی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے حد پراسرار مسکان تھی تو ساتھ میں ایک التجا بھی۔وہ اس کی بات ماننے کا پابند نہیں تھا مگر اس کی قوتِ گویائی گویا اس پل سلب ہو کر رہ گئی تھی۔سویٹی اسی پراسراریت سمیت اس کے نزدیک جھکی اور محب کی کلائی پر بندھی رسٹ واچ اتارنے لگی۔محب عبدالقدوس جرأت کے اس مظاہرے پر ششدر ہوا تھا اور اسی ناگواریت سمیت اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتا تھا مگر جانے کیوں اپنا ارادہ موقوف کر دیا۔محب کے چہرے کے زاویوں کے تناؤ میں تلخی اور نخوت کی جگہ حیرت اور کھوج نے لے لی تھی۔سویٹی نے اس کی رسٹ واچ کو اتارنے کے بعد آہستگی سے ٹیبل پر رکھ دینے کے بعد اسی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔محب کے اندر بے چینی سرایت کر گئی تھی۔رسٹ واچ پر الجھن زدہ نگاہ ڈالتا ہوا وہ بے آواز قدموں کے ساتھ اس کی تقلید میں اٹھ کر باہر آیا تھا۔

''تم جانتے ہو محب میں نے ایسا کیوں کیا؟''

''یہ مجھے تم بتاؤ گی۔اور سنو ٹو دی پوائنٹ بات کرو''

محب نے جواباً سرد مہری سے کہہ کر سویٹی کا چہرہ چند لمحوں کو پھیکا کر دیا۔

''یہ رسٹ واچ تمہیں یقیناً کہیں سے گفٹ ملی ہو گی؟''

وہ سوال کر رہی تھی یا اطلاع پہنچا رہی تھی محب سمجھ نہیں سکا۔البتہ سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''اور وہ ایک پولیس آفیسر ہے۔جسے تم اپنے لیے اور اس ملک کے لیے مخلص سمجھتے ہو''

اب کے اس کا لہجہ کچھ طنز سمیٹ لایا تھا جبکہ اس کے متضاد محب عبدالقدوس کے اعصاب پر جیسے بم گرا تھا۔یہ رسٹ واچ اس کی برتھ ڈے کے موقع پر ''ایچ ایچ او الیاس بھٹی'' نے اسے تحفے میں دی تھی۔جو صالح کا جونیئر تھا اور صالح کی وجہ سے محب سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔وہ اپنے پیشے اور ملک کے لیے بہت جذباتی تھا۔محب اس کی اسی حب الوطنی کے جذبے کی وجہ سے اس کا قدردان تھا۔

''سیانوں کی بات تجربوں کا نچوڑ ہوا کرتی ہے محب! بلاشبہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں کیا سمجھے؟ الیاس بھٹی کی طرح کیا صالح نے بھی کبھی جذباتی تقریریں کی تھیں؟ نہیں نا۔اس لیے کہ وہ کچھ کر گزرنے کے جذبے سے معمور تھا۔جبکہ یہ الیاس بھٹی یہ تو وردی میں چھپا بھیڑیا ہے۔جس کی اصلیت بھی عیاں نہیں۔دھوکہ دے رہا ہے وہ تم جیسے ذہین لوگوں کو بھی، اگر میں تمہیں بتاؤں کو وہ ہمارے گینگ کا ایک معمولی پرزہ ہے اور بہت عرصے سے ہے تو تم یقین کر لو گے؟ میں اب بھی تمہیں سمجھا رہی ہوں محب کہ تم اکیلے یا چند تم جیسے لوگ تیزی سے بگڑ جانے والے حالات کو سدھارنے کی ہمت نہیں رکھتے۔صالح چلا گیا۔احد مرتضیٰ نہیں رہا۔اب تمہاری باری ہے...... وہ تمہیں مہلت دے رہے ہیں۔صرف اس لیے کہ تمہارے پاس ان کی کمزوری ہے۔فارگاڈ سیک محب ہر کسی پر اتنی آسانی سے اعتماد نہ کر لیا کرو''

''ہاں جیسے تم پر''

محب اس جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔تمسخرانہ انداز میں ہنسا تو سویٹی کا چہرہ ایک دم سے پھیکا پڑ گیا۔

''یہ وقت ثابت کرے گا محب کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔میں کوئی بھی دعویٰ نہیں کر رہی بس اتنا کہوں گی۔کبھی اگر تم نے رات کی گھور تاریکی سے اجالے کو جنم لیتے دیکھا ہو تو جان لینا کہ میرے لیے تم گناہوں کی اس اندھیر نگری میں ایسی ہی صبح نوخیز اور چمکیلی روشنی کا جگنو بن کر آئے ہو۔اور میں نے ہر انجام سے بے نیاز ہو کر تمہیں اپنی مٹھی میں قید کرنا چاہا ہے۔اس کے باوجود کہ یہ خواہش محض سراب ہے۔میں جانتی ہوں تم کسی اور سے محبت کرتے ہو۔میں یہ بھی

جانتی ہوں تم مجھے کبھی نہیں مل سکتے مگر محبت محبت ایسی ہی دیوانگی اور پاگل کا نام ہے''اس نے جیسے تھک کر توقف کیا چند گہرے سانس بھرے پھر دلگیری اور آہستگی سے مزید گویا ہوئی تھی۔

''جانے سے قبل ٹیبل سے اپنی رسٹ واچ لے لینا۔ اسے چیک کرا لینا اس میں ایک ایسا آلہ فٹ کیا گیا ہے جو تمہاری ہر آواز کو کیچ کر کے وہاں ہیڈ کوارٹر تک پہنچاتا رہا ہے۔ جبھی تمہاری کوئی بھی پلاننگ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی''

اپنی بات کے مکمل ہونے کے بعد وہ رکی نہیں تھی۔ پلٹ کر چلی گئی۔ اور محبت عبدالقدوس اپنی جگہ پر پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

میرے وطن کے اداس لوگو
نہ خود کو اتنا حقیر سمجھو
کہ کوئی تم سے حساب مانگے
خواہشوں کی کتاب مانگے
نہ خود کو اتنا قلیل سمجھو
کہ کوئی اٹھ کر کہے یہ تم سے
وفائیں اپنی ہمیں لوٹا دو
وطن کو اپنے ہمیں تھما دو
اٹھو اور اٹھ کے بتادو ان کو
کہ ہم ہیں اہل ایمان سارے
نہ ہم میں کوئی صنم کدہ ہے
ہمارے دل میں تو اک خدا ہے
جھکے سروں کو اٹھا کے دیکھو
ہے ایک طاقت تمہارے سر پر
کرے کی سایہ جو ان سروں پر
قدم قدم پر جو ساتھ دے گی
اگر گرے تو سنبھال دے گی
میرے وطن کے اداس لوگو!

اس نے زیر لب دہرایا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کی نمی کو رگڑ کر پونچھنے لگا۔ پہاڑی نالے کے کنارے پتھر پر بیٹھے اس نے گردن موڑ کر دیکھا جہاں خیمے لگے تھے یہ خیمے درخت کاٹ کر ہموار جگہ پر لگائے گئے تھے ان خیموں کے پیچھے ایک پہاڑی درہ تھا۔ دو پہاڑ آپس میں اس طرح جڑ گئے تھے کہ درہ سا بن گیا تھا یہاں ''حزب المجاہدین'' کا ٹریننگ کیمپ تھا۔ سکندر کو یہاں اس کیمپ میں آئے تین ماہ ہو گئے تھے اور ان تین مہینوں میں اس نے ابتدائی ٹریننگ کے علاوہ ''ایس' ٹی' ایف بھی مکمل کر لی تھی اور اب اگلی منزل جانے کہاں تھی۔ آج صبح ہی انہیں بتایا گیا تھا کہ ٹریننگ مکمل ہو چکی ہے۔ اس نے نالے کے مدھم شور کو سنتے ہوئے گہرا سانس بھر کے سوچا۔ یہاں نالے پر بیٹھنا اسے بہت پسند تھا۔ نالے سے دائیں طرف اوپر ایک چشمہ تھا جس کے گرنے کی آواز اسے اچھی لگتی تھی۔ جب بھی وہ فارغ ہوتا یہاں آبیٹھتا۔

''میرے وطن میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن
میرے وطن میرے وطن

کیمپ میں موجود کسی مجاہد نے اپنی پرسوز آواز میں ترانہ پڑھنا شروع کیا تب سکندر اپنے خیالات سے چونکا تھا۔ کمانڈر کا کیمپ اوپر تھا تقریباً چار سو فٹ بلند ایک چٹان پر۔ سکندر جب خیمے میں پہنچا تو وہ زمین پر نقشہ پھیلائے کچھ دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر اپنے پاس بلایا۔

''آیئے! سکندر آپ کو سری نگر جانا ہے''

کمانڈر سے مکمل ہدایات لے کر جب وہ کیمپ سے نکلا تو چاند پورا درختوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور چاندنی راتوں میں یہاں کا منظر بہت حسین ہوا کرتا ہے۔ مجاہدین باہر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ بھی ان کے پاس آ گیا تو فضا میں ایک بار پھر نغمہ گونجنے لگا۔

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
یہ سرخی ہے آزادی کے افسانے کی

سکندر نے بھی اپنی آواز اس آواز میں شامل کر دی تھی۔ وادئ لولاب میں معرکہ زن کشمیری بہن بھائیوں کے پرعزم چہرے اس کے تصور میں آئے۔

''آزادی کی منزل دور نہیں۔ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ کاٹنا پڑھتی ہیں کیونکہ زنجیریں خود بخود ٹوٹ کر نہیں گرا کرتیں''

آج صبح ہی امیر کیمپ نے اسمبلی کے بزم شہدا کے شروع ہونے سے پہلے تقریر کی تھی۔ اس کے ساتھ چار اور مجاہدوں نے بھی ٹریننگ مکمل کی تھی۔ وہ منزل اب بے حد نزدیک تھی جس کی

لگن نے اس سے سب کچھ چھڑوا دیا تھا، یہاں تک کہ اسوہ تک بھی۔ جب دل میں آگ لگی ہو تو قدم پھر روکے نہیں رکتے۔ امیر کیمپ نے اسے چند دنوں کے لیے اپنے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر آگے کشمیر جانے کا مگر سکندر نے منع کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں چلے جانا چاہتا تھا۔ جذبہء شوق اور لگن ہی ایسی تھی۔ وہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہو جانا چاہتا تھا۔ زمین جن کے قدموں کی چاپ سن کر اتراتی ہے۔ اور موت جن کو گلے لگا کر فخر کرتی ہے۔ امیر کیمپ نے کہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے جہاد کرنا ''اللہ'' کی خاطر اپنے دین کی خاطر فرض ہے اور اس کے لیے ملکوں اور سرحدوں کی قید نہیں۔ جس جگہ وہ جا رہا تھا وہاں موت کا رقص جاری تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کب اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔ اس نے اسوہ سے بچھڑتے سمے جو آخری بات اسے یہی کہی تھی۔

''کبھی ایسا ہوتا ہے اسوہ جنہوں نے ہمیشہ ساتھ دینا ہوتا ہے وہ اچانک بچھڑ جاتے ہمیں اگر کبھی ایسا ہو جائے تو تم رونا مت۔ تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف دیں گے۔ ہمارے لیے دعا کرنا۔ خدا ہمیں ہماری نیتوں کا اجر عطا فرمائے اور ہمیں اس فضیلت سے نوازے جو جہاد کرنے والوں کو عطا ہوتی ہے اور اللہ میرے وطن کو آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمائے اور بھارتیوں کو نیست و نابود کرے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ دنیا کی آنکھیں بند ہیں اور اقوام متحدہ ہم مسلمانوں کی تباہی کا تماشہ دیکھ رہی ہے''

پھر وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ اسی شام کشمیر کے سبزہ زاروں میں اتر گیا تھا۔ اس کا جذبہ، اس کی لگن اسے ہر پل متحرک رکھتا تھا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی وہ ایک لڑائی میں زخمی ہو کر بیس کیمپ آیا تو کچھ عرصہ کے لیے راولپنڈی آ گیا تھا اور تب ایک عرصے کے بعد اس کا اسوہ سے فون پر رابطہ ہوا تھا۔ اور اتنے عرصے بعد اس سے بات کرتے ہوئے بھی وہ اس سے وہیں کی اذیتیں شیئر کرتا رہا تھا۔

''وہاں برف زاروں پر خون کی سرخی ہے۔ میں اس سرخی میں اپنا لہو بھی شامل کر دینا چاہتا ہوں اسوہ! مجھے لگتا ہے میں زندگی میں کبھی کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکا۔ میں اپنی زندگی کو کسی خاص کام میں صرف کرنا چاہتا ہوں''

پھر وہ کتنی بار لولاب گیا اور لوٹ آیا۔ جموں، ڈوڈا، اودھم پور، کشتوڑا، بانیال، ریاسی اور پونچھ کی وادیوں نے کتنی بار اس مجاہد کو اپنے دامن میں پناہ دی اور وہاں کے باسیوں نے کتنی بار اس کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائیں اور ہر بار اپنے مشن میں کامیاب ہو کر لوٹا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی ''مشن'' تھا جس کی کامیابی کا اسے سو فیصد یقین تھا۔ مگر سب کچھ ضروری نہیں حسب منشا ہو۔

حضرت علیؓ نے فرمایا تھا ''میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پہچانا'' ان کا سارا پروگرام بھی بھارتی بنیا کے اچانک مڈبھیڑ سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ یہ سب اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ نہ صرف اس کا گروپ درہم برہم ہو گیا بلکہ وہ شدید زخمی بھی ہو گیا تھا حواس مکمل طور پر گنوانے سے قبل اس نے خود کو ایک گھر کی دہلیز کے باہر گرتے دیکھا تھا اور خود کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے کلمہ پڑھ لیا۔ جانے کیوں اسے یقین ہو گیا تھا اس کی زندگی کا اسی طرح اختتام ہو جائے گا یا پھر اگر وہ کسی بھارتی فوجی کے ہتھے چڑھ گیا تو ٹارچر سیل میں باقی ماندہ سانسیں سسک کر گزارنا پڑیں گی مگر یہ خدا کا کرم ہوا تھا کہ وہ کسی بھارتی فوجی کی بجائے رحم دل کشمیریوں کے ہتھے لگا تھا مگر آج کل حالات جس درجے نازک تھے اب کشمیریوں پر بھی مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میر صادق جیسے ضمیر فروش لوگ یہاں بھی جنم لے چکے تھے ایسی ہی کالی بھیڑوں کی وجہ سے مسلمان مجاہد مسلسل جدوجہد میں جان کے نذرانے پیش کرنے کے باوجود آزادی کی نعمت سے فیض یاب نہیں ہو پا رہے تھے کہ کشمیر کے کچھ مفاد پرست لوگ اس سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے میں مشغول تھے۔ مجاہدین اب بے حد محتاط ہو چکے تھے اور آنکھیں بند کر کے ہر کشمیری پر بھروسہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکندر اپنے زخموں اور تکلیف کی پرواہ کیے بغیر ہی مکمل ہوش میں آتے ہی وہاں سے جانے پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ خاتون خانہ کے روکنے کے باوجود وہ وہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''مگر بیٹے آپ ابھی شدید زخمی ہو۔ چند قدم چلنا بھی محال ہے آپ اپنے کسی محفوظ ٹھکانے تک کیسے پہنچو گے؟''

''اس کی فکر نہ کریں۔ ہم عادی ہیں ایسے حالات کے''

سکندر نے رسانیت سے پُرآواز میں کہا تو خاتونِ خانہ اسے کچھ خاموشی سے تکنے لگی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے آپ محتاط ہیں۔ یہ احتیاط اچھی بات ہے مگر آپ ہمارے لیے بے حد قابلِ احترام اور اہم ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہاں اس گھر میں آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے ہم اپنی جانیں دے دیں گے۔ آپ کے اور دشمن کے درمیان اپنے وجود کی دیوار تان دیں گے۔ ہم اپنے مجاہد بھائیوں کے جوتوں کی ایڑیوں سے اٹھنے والی خاک کو اپنی پیشانی پر بہت عقیدت سے سجاتے ہیں۔ آپ یہاں سے اس حالت میں نہیں جائیں گے ہم آپ کو ایسے جانے ہی نہیں دیں گے؟''

تب سے کونے میں کھڑی وہ خاموش اور بے حد دلکش لڑکی جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خواب ناک سی تھیں اور جس کے تراشیدہ لبوں کی رنگت یاقوت کی طرح تھی اور جس کے

کھڑے ہونے کا انداز انوکھا سا وقار لیے ہوئے تھا۔ وہ مخصوص کشمیری لباس پر بہت اسٹائلش سی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی تھی۔ اس کے لہجے میں دھونس زور زبردستی نہیں قائل کرنے کا بہت دلربا انداز تھا۔ سکندر نے کچھ پل اسے دیکھا تھا پھر گہرا سانس بھرا اور مدھم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا تھا وہ بہرحال غلط لوگوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ پھر وہ ایک ہفتہ وہاں مقیم رہا تھا۔ خاتونِ خانہ بیمار رہتی تھیں اور لڑکی جس کا نام روشنی تھا وہی اس کی تیمارداری پر اور خدمت پر مامور تھی اسی نے اسے بتایا تھا کہ اس کا بھائی بھی ''مجاہد'' ہے اور وہ کشمیر پر نظمیں لکھتا ہے۔ اس نے سکندر کو اپنے بھائی کی نظمیں بھی پڑھ کر سنائی تھیں اور جس روز سکندر کو وہاں سے چلے جانا تھا روشنی کی ماں اس دن بہت مضطرب محسوس ہوتی تھی۔ وہ بار بار سکندر کو پھر وہاں آنے کی تاکید کرتی رہی تھی اور جس پل سکندر جا رہا تھا جانے کیسے سکندر کے کرتے کی جیب میں اس کا والٹ نکل کر گر گیا تھا۔ اس سے قبل کہ سکندر جھک کر اپنا والٹ اٹھاتا خاتون خانہ نے اس کا پرس اٹھا لیا تھا اور اس سے سرک کر بکھر جانے والے کچھ اہم کاغذ اکٹھے کرتے وہ ایک دم ٹھٹھک گئی تھی۔ سکندر نے ان کے چہرے کو پہلے ساکن پھر متغیر ہوتے دیکھا تھا۔

''یہ...... یہ...... تصویر......''

ان کے ہاتھ میں ابن زید کی کے آئی ڈی کارڈ کی فوٹو کاپی تھی جو اب لرز کر زمین بوس ہوئی تھی۔ سکندر ان کے تاثرات پر ششدر تھا۔

''یہ ابن زید ہیں۔ میرے دوست۔ آپ جانتی ہیں انہیں''

سکندر کے سوال نے خاتونِ خانہ کے چہرے پر یکلخت زرد رنگ مل دیا تھا۔

☆☆☆

وہ مسکرا کے ہر درد ٹال دیتا ہے
کسی کسی کو خدا یہ کمال دیتا ہے
نظر اٹھا کے وہ جس کو دیکھ لے اک بار
یقیں کرو اسے مشکل میں ڈال دیتا ہے

اس نے پوری آمادگی کے ساتھ شکست تسلیم کر لی تھی وہ ہار گئی تھی۔ اس محبت کے شاہزادے! عشق کے شہنشاہ کے سامنے۔ اور اب بہت فرصت اور دلی آمادگی کے ساتھ اسے سوچا کرتی تو کس قدر آسودگی دل و جاں میں اتر جاتی تھی۔ مگر اس کے سامنے پھر بھی انا کا پرچم بلند رکھا ہوا تھا۔ اب اسے آنے میں دیر ہو چکی تھی۔ پپا مما سمیت سب کھانا کھانے کے بعد اپنے کمروں

میں جا چکے تھے ایک وہی تھی جسے اس کے انتظار میں کسی پل قرار نہیں تھا۔ کھانا تو سرے سے کھایا ہی نہ جا سکا۔ ایک بے چینی مستقل اس کے ہمراہ تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد زیر لب درود شریف کا ورد کرتے ہوئے وہ ٹیرس پر آ گئی۔ ریلنگ پر جھک کر کتنی مرتبہ گیٹ کو دیکھ چکی تھی۔ مگر غلام حسین کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بے قراری کچھ مزید بڑھی تو واپس کمرے میں آ کر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا مگر کوئی رسپانس نہیں ملا۔ پریشانی کے ساتھ غصہ بھی شامل ہونے لگا۔ وال کلاک کی جانب دیکھا۔ گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ اپریل کے مہینے کی یہ آخری تاریخیں تھیں۔ رات کے اس پہر چلتی ٹھنڈی ہوائیں جسم و جاں کو انوکھا سرور بخش رہی تھیں۔ آسمان پر ستاروں کا آنچل بچھا ہوا تھا چاند غائب تھا۔ کہیں کہیں کوئی بادل کا آوارہ ٹکڑا بھی ہوا کی اٹھکیلیوں سے مسکراتا جھینپتا یہاں سے وہاں تک بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا۔ بہت خوبصورت رات تھی۔ مگر اسے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تبھی گیٹ پر اس کی گاڑی رکی تھی۔ دیا نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ فینسی لائٹ کی روشنی میں کھلے گیٹ سے اس کی گاڑی سست روی سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ دیا کا جانے کب کا رکا سانس بحال ہوا۔ وہ پلٹ کر ٹیرس سے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ٹھیک پانچ منٹ بعد غلام حسین نے بھی دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا مگر اس پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی دیا کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی تھی۔ غلام حسین نے چونک کر اسے دیکھا جو فق چہرے کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی خون آلود شرٹ کو دیکھ کر بے جان ہونے لگی تھی۔

''دیا! افوہ یار کچھ نہیں ہوا مجھے۔ معمولی زخم ہے''

ہاتھ میں موجود کوٹ بستر پر اچھال کر وہ اس تک آیا اور کندھوں سے تھام کر تسلی دینا چاہی مگر وہ تو جیسے حواس کھو رہی تھی۔

''یہ کیا ہوا ہے آپ کو غلام حسین!...... اتنا خون!!!!''

وہ لمحوں میں زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے حلق سے ہراساں آواز نکلی تھی۔

''دیا! ٹیک اٹ ایزی پلیز!''

غلام حسین کو سب کچھ بھول کر اس کی پڑ گئی۔ وہ ہر لمحہ بے جان ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کو ہوا کیا ہے؟ کسی سے جھگڑا کیا ہے کیا؟ ایسے ہی تو میرا دل نہیں ڈوب رہا تھا''

وہ سراسیمہ سی ہو کر بولی'' آنکھیں تیزی سے چھلکنے کو تیار تھیں۔

''افوہ! میں کیوں جھگڑوں گا۔ شہر کے حالات کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ بنا قصور کے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ میں تو معمولی زخمی ہوا ہوں۔ یہ نئی صدی کی کرامات ہیں کہ ہر جگہ دہشت

گردی کا بازار گرم ہے اور دہشت گرد دندناتے پھر رہے ہیں۔ دنیا کو زبردستی ایک ایسی جہنم میں جھونکا جا رہا ہے جس کا آغاز کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں جو اس کے خاتمے کے لیے علاج اور تجاویز دینے میں پیش پیش ہیں۔ خود ہمارا ملک پاکستان بھی اب اسی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ امن پسند لوگوں کے ماتھے پر بھی زبردستی دہشت گردی کے ٹیگ لگا دیئے گئے ہیں جس کی بناء پر پورا ملک ہی آگ اور خون کی ہولی کھیلنے لگا ہے''

شرٹ کے بٹن کھولتے، شرٹ اتارتے اور دوسری پہنتے، پتا نہیں وہ کس جذبے کے تحت جھلا کر بولتا چلا گیا۔ دیا نے چونک کر کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا تھا اس نے آج تک کبھی اس کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔ اسے بے حد عجیب لگا تھا۔

''یہ لو اس شرٹ کو تو فوری طور پر ٹھکانے لگاؤ۔ مما پپا کی نظر میں نہیں آنی چاہئے پتا ہے نا کتنے فکر مند ہو جائیں گے''

خون آلود شرٹ گول مول کر کے اس کی جانب بڑھاتے وہ اس کے ساکن وجود اور حیران کن نظروں کو محسوس کر کے خفیف سا چونکا۔

''خیریت، ایسے کیا دیکھ رہی ہو'' وہ ایک دم سنبھلی۔

''تھنک! آپ نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی نا۔ مجھے لگا میں محب عبدالقدوس کو سن رہی ہوں''

وہ آہستگی سے مسکرائی تو غلام حسین کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''مجھے نانو سے پتا چلا تھا کہ تم ''محب عبدالقدوس'' کو بہت لائیک کرتی ہو''

''افوہ اُسے نہیں اس کے الفاظ کو، اس کے جذبوں کو''

دیا نے فی الفور تصحیح ضروری سمجھی تو غلام حسین نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''ایک ہی بات ہے۔ میں کسی ٹیپیکل شوہر کی طرح اس بات کا برا نہیں مانوں گا کہ تم اسے کیوں پسند کرتی ہو''

''یہ ہرگز بھی ایک ہی بات نہیں ہے مائینڈ اٹ! وہ میرے لیے غیر محرم ہے میں کیوں خوامخواہ اسے لائیک کروں؟''

وہ پتا نہیں کیوں چڑ گئی تھی۔

''یار آپ مجھے بھی لائیک نہیں کرتیں۔ میں [redacted] آپ کا''

غلام حسین نے جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا اور دیا نے منہ سے کچھ پھسل جانے

کے خوف سے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔ غلام حسین یقیناً اس کی وضاحت یا صفائی کا منتظر تھا مگر اس خاموشی پر سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

''اب سوئیے گا نہیں۔ میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔ کھانے کے بعد پی لیجئے گا''

اس کی شرٹ واش روم میں سرف میں بھگونے کے بعد باہر آ کر وہ اسے مخاطب کر کے بولی تھی۔ غلام حسین نے اس کا ہاتھ تھام کر باہر جانے سے روک دیا۔

''ان کاموں کو چھوڑو بیوی! مجھے یہ بتاؤ تمہارا دل کیوں ڈوب رہا تھا بھلا۔ آئی تھنک یہ تو دل کے معاملے ہوا کرتے ہیں۔ اور آپ جناب تو اس قسم کی خرافات سے کوسوں دور ہیں نا''

غلام حسین کے شاکی لہجے میں ٹوٹتے کانچ کی چبھن تھی۔ دیا ایک دم خفت زدہ ہوگئی۔

''آپ لیٹیں میں دیکھتی ہوں زخم زیادہ گہرے تو نہیں؟''

''ان کی فکر چھوڑو، جسمانی گھاؤ بھرنے کی خاطر ہی ہوتے ہیں۔ روح کے زخموں کی فکر کرو اگر کرنی ہے تو''

وہ پھر اپنے مقصد کی جانب لوٹا۔ دیا کترا کر اس کے لیے کھانا لانے کے بہانے باہر نکل گئی۔ پندرہ منٹ بعد ٹرے سمیت واپس لوٹی تو اسے جینز کے پائینچے فولڈ کیے سر پر رومال باندھے جائے نماز پر نماز کی ادائیگی میں خشوع و خضوع سے مشغول دیکھ کر چند ثانیوں کو ساکن و سامت رہ گئی تھی۔

''دو کشتیوں پر پیر ٹکانے والے ہمیشہ منجدھار میں ڈوبتے ہیں''

غلام حسین دعا مانگ کر جائے نماز تہہ کر رہا تھا۔ جب دیا نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا۔ غلام حسین یوں چونک کر متوجہ ہوا جیسے ابھی ابھی اس کی موجودگی سے آگاہ ہوا ہو۔ پھر محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے گہرے نوکیلے طنز کو وہ صاف نظر انداز کر گیا تھا۔

''گانا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ یہ دوغلی زندگی اللہ کو پسند نہیں ہے''

وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئی اور جائے نماز اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے نماز پڑھتے دیکھنا اتنا اچھا لگا تھا کہ بے اختیار اس سے لپٹ جانے کو اور تمام خفگی مٹانے کو جی چاہا تھا۔

''غلام حسین میں کچھ کہہ رہی ہوں''

وہ اتنا چڑی تھی کہ دبے ہوئے لہجے میں چیخ اٹھی۔ غلام حسین نے گہرا سانس بھر کے اسے ایک نظر دیکھا پھر اسی رسانیت اور آہستگی سے بولا تھا۔

''میں گانا چھوڑ چکا ہوں دیا!''

ٹرے اپنے آگے گھسیٹ کر کھانا شروع کرتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں انکشاف کیا تھا۔ دیا ششدر رہ گئی۔

''کب؟''

وہ ٹھٹکی اور پھٹی پھٹی آنکھوں میں استعجاب لیے اسے تکنے گئی۔

''جب تم نے شرط رکھی تھی۔ یہ میرا شوق تھا پروفیشن نہیں''

وہ اسی طرح پرسکون تھا۔

''اور......نماز......نماز کب سے پڑھنا شروع کی؟''

وہ حق دق تھی اور جیسے کسی حد تک غیر یقین تھی۔

''دیا آئی تھینک یہ خالصتاً بندے اور اس کے رب کا ذاتی معاملہ ہے''

اب کہ وہ کسی قدر خفا نظر آیا تھا۔ دیا کے چہرے پر تغیر امڈ آیا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر پنجوں کے بل نیچے بیٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ کر بے ساختہ ملتجی ہوئی تھی۔

''غلام حسین پلیز ٹیل می! دل کی تسلی ہو جائے گی میری''

''بہت سال نہیں ہوئے مگر بہر حال کچھ عرصے سے پڑھنا شروع کی ہے''

گہرا سانس بھر کے وہ جیسے بے حد عاجز ہو کر کہہ رہا تھا۔ جواب واضح نہیں تھا کسی حد تک گول مول تھا۔

دیا اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''اب اگر انٹرویو ختم ہو گیا ہو تو میں آرام کر لوں؟''

ٹرے پرے سرکا کر اس نے کسی قدر سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ دیا اسے تکتے ہوئے چونکی اور بے ساختہ سر کو نفی میں ہلا دیا۔

''نہیں میرا جی آپ سے باتیں کرنے کا ہے غلام حسین''

اس نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ کر جس استحقاق سے کہا تھا غلام حسین گنگ ہو کر رہ گیا۔

''کون سی باتیں جناب! حالات مکمل طور پر بدلے ہوئے لگ رہے ہیں خیریت ہے نا؟''

وہ سنبھلا تو ایک شوخ کھنک اس کے لہجے میں خود بخود جھلک آئی تھی۔ دیا کے چہرے پر حجاب آلود مسکان کی رنگینی پھیل گئی۔ جسے تکتے ہوئے غلام حسین گنگنایا تھا۔

وہ اک شخص جو کم کم میسر ہے ہم کو
آرزو ہے کسی روز وہ سارا مل جائے

اسے کہنا ملاقات ادھوری ہے وہ
اسے کہنا کبھی آ کے دوبارہ مل جائے

دیا کے چہرے پر جو مسکراہٹ بکھری تھی اس میں صرف حیا کی دلکشی نہیں تھی آسودگی اور آمادگی کا رنگ بھی جھلک آیا تھا۔ زندگی ایک دم بے حد مکمل اور حسین ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ گرم بستر پر لیٹا تھا مگر اسے سکون میسر نہیں تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے اطلاع ملی تھی کنٹرول لائن پر بھارتی فوج سے جھڑپ میں ان کے دو مجاہد شہید ہو گئے تھے۔ یعنی دو کشمیری اور کم ہو گئے تھے صرف وہی نہیں اس کے باقی ساتھی بھی افسردہ تھے۔

''شاید کپگام کیمپ جانے والے فوجیوں پر ہمارا حملہ اور ان کے نقصان پر کرنل رامندر سنگھ تو اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔ اسے یقیناً یہ آگ بجھانا تھی''

اس کے ایک ساتھی آفاق وسیم نے کہا تھا۔ جو بنگلہ دیشی تھا اور جہاد کی خاطر کشمیر آیا تھا۔ ابن زید نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ بے حد اداس اور ملول ہو رہا تھا۔ ابن زید کو اپنا گھر چھوڑے کئی ماہ ہو چکے تھے اس دوران کتنی بار اسے وہاں کی خبریں ملی تھی۔ بھارتی فوج نے اس کی تلاش کے بہانے کئی بار ان کے گھر کی تلاشی لی تھی اور اس کی ماں اور بہن کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا اس کے باپ کو گرفتار کر کے لے گئے تھے کہ مجاہد کو حاضر کرو۔ پھر ایک روز ان کی لاش دروازے پر پھینک گئے تھے۔ ایسے واقعات کشمیر میں روز کا معمول تھے۔ بھارتی فوجی ہر روز کسی نہ کسی گھر کی تلاشی لیتے اور مجاہدین کو ڈھونڈنے کے بہانے کسی نہ کسی فرد کو پکڑ کر پوچھ گچھ کو لے جاتے اور یہ تفتیش کے لیے جانے والے افراد پھر زندہ واپس نہیں آتے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی پشت پر دیوار میں موجود کھڑکی کو اٹھ کر کھولا۔ سامنے پہاڑ تھے اور پہاڑ پر چیر اور کاؤ کے درخت تھے۔ اور کہیں کہیں ان چوٹیوں پر سفیدی تھی۔ شاید برف تھی۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ اسے سورج سمیت سارا منظر اداسی میں محصور محسوس ہوا۔ کشمیر میں کھیلے جانے والی خون کی ہولی نے ہر منظر اداس کر دیا تھا۔ دو پہاڑیوں کے دامن میں بہت بلندی پر چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جو چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھا۔ لکڑی کی تکونی چھتوں والے گھر اندر سے بہت گرم تھے۔ وہ کچھ دن وہاں ٹھہرے تھے۔ ان کے کچھ ساتھی زخمی تھے۔ پہاڑوں کے نیچے انہیں کچھ چرواہے ملے تھے۔ جنہوں نے انہیں دودھ پیش کیا تھا اور باجرے کی روٹی کھانے کو دی تھی۔

''مجاہد؟''

اس نے پوچھا تھا۔ اور ابن زید نے سر اثبات میں ہلا کر جواب دیا تو چرواہے ایک دم ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ سب کی آنکھوں میں ان کے لیے عقیدت تھی محبت تھی۔ نیک جذبوں کا ایک جہان پوشیدہ تھا۔

"میرا بیٹا بھی شہید ہوا تھا مگر اس نے شہادت سے پہلے گیارہ بھارتیوں کو مارا تھا"

ایک بوڑھے چرواہے نے بڑے فخر سے بتایا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں اس پل کتنی چمک تھی۔

"ابن زید کو کچھ بھی عجیب اور انوکھا نہیں لگا۔ یہ سفر کیسا سفر ہے۔ یہ احساس کیسا احساس ہے اب وہ بھی اچھی طرح جان گیا تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

وہ جان چکا تھا کہ دنیا میں اس عمل سے بڑھ کر کوئی اور سرور بخش کام نہیں کہ انسان اپنی زندگی اللہ کے لیے وقف کر دے۔ ایمانی قوت اور جذبات سے لبریز مجاہدین جنہیں دیکھ کر ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ ملت اسلامیہ کے اصل ہیروز جو چٹانی پہاڑوں اور برف زاروں پر جیتے تھے۔ جنہیں طلب دنیا کی رغبت نہ تھی نہ غرض۔ نور سے جگمگاتی روشن پیشانیاں۔ بارشِ سنتِ مصطفیٰ ﷺ سے مزین چہرے۔ ٹخنوں سے اونچی شلواریں۔ سادگی کا مظہر لبادے، معمولی غذا کھا کر بھی باہمت اور جوان...... اسے ہر چہرا "اسامہ بن لادن" کا چہرا لگتا تھا "اسامہ" جو اس کا آئیڈیل اور ہیروز تھے۔ وہ اتنی چھوٹی عمر میں مجاہدین میں شامل ہو گیا تھا مگر اس کا جذبہ اور قوت ایمانی اسے ہر دم متحرک رکھتی تھی۔ وہ خطرات سے گھبراتا تھا نہ خوفزدہ ہوتا بلکہ کٹھن سے کٹھن مہم پر بھی سینہ سپر کیے سب سے آگے ہوتا اور جب وہ کامیاب لوٹتا تو اپنے کسی نہ کسی مجاہد کی شہادت کا زخم اس کے سینے کا ناسور بنا ہوا ہوتا اور وہ اس رات آنسوؤں کے چراغ جلاتے ہوئے بار بار زیر لب آزادی کی دیوی آزادی کی دلہن نظم کو گنگنایا کرتا۔

☆☆☆

دیا ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی اپنے نم سلکی بال سلجھا رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں غلام حسین کا عکس بھی جھلملاتا تھا۔ جو بیڈ پر کراؤن سے ٹیک لگائے گود میں تکیہ رکھے بظاہر اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا مگر اس کی آنکھوں میں جو احساس تھا وہ بے خیالی کا مظہر تھا۔ دیا نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کیا تھا پھر بال پشت پر گرا کر دوپٹہ اٹھا کر شانے پر پھیلایا اور

اس کی جانب آ گئی۔

"کیا بات ہے غلام حسین؟ آپ اتنے چپ کیوں ہیں؟"

اس سوال پر وہ چونکا تھا اور جیسے ایک دم سنبھلا۔

"نہیں تو"

مجھے تو پریشان بھی لگ رہے ہیں۔ اپنی پرابلم؟"

دیا کی تشویش بجائے کم ہونے کے بڑھنے لگی۔

"نو نیور جناب! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم تو بہت خوش ہیں۔ آپ کا دل فتح کیا ہے۔ کوئی چھوٹا معرکہ ہے یہ؟"

وہ ہنسنے لگا۔ صاف لگتا تھا اسے بہلانا چاہ رہا ہے۔ دیا نے اسے دھیان سے دیکھا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے پھر ناشتہ کر لیں اور پپا کے ساتھ آفس جایا کریں۔ بہت پریشان رہتے ہیں وہ آپ کی لاتعلقی کے باعث"

وہ نصیحت کر کے پلٹنے کو تھی جب غلام حسین نے سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلکے سے جھٹکے سے اپنے پہلو میں گرا لیا۔

یہ کیسی تلاش ہے کہ
تجھ سے مل کر بھی تیری آرزو ہے

وہ اس پر جھک کر گنگنایا تو دیا جھینپ گئی تھی

"یہ محض آپ کے بہانے ہیں پاس بلانے کے"

وہ اس کے رومینٹک موڈ سے خائف ہو کر بولی تو غلام حسین مزید گویا ہوا تھا۔

کہتے ہیں لوگ تجھ کو مسیحا نفس مگر
اک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

اس کے نم بال بکھیرتے ہوئے وہ مکمل طور پر اس میں گم ہونے کو تھا جب دیا نے سٹپٹا کر اسے نرمی سے دور دھکیلا۔

"کیا کرتے ہیں۔ چھوڑیں بھی"

مگر وہ تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسی سرمستی اور سرشاری کی کیفیت میں گم رہ کر بولا۔

فرصت نہیں یقیں مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری آنکھیں تیرا چہرہ بہت مصروف رکھتا ہے

وہ اک دیوانگی کے عالم میں بار بار اس کی آنکھوں کو چوم رہا تھا۔ دیا شرم سے دوہری ہونے لگی اور غلام حسین ہنستا چلا گیا۔

تمہیں معلوم ہے تم ہو مقدس کتنے
دیکھتے ہیں تو عقیدت سے تجھے دیکھتے ہیں

☆☆☆

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
جب بستی بستی صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ زخمی خواب تھے آنکھوں میں
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
ہم خوابوں کے بیوپاری۔ تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا

وہ اس کے سامنے موجود تھی۔ نگاہوں کی اسی بے تابی اور والہانہ چمک کے ساتھ۔ جس سے محبّ عبدالقدوس کو چڑ محسوس ہوا کرتی تھی مگر اس سے ملنا بھی مجبوری تھی اپنے مفاد کی مجبوری۔ وہ خر دماغ لڑکی تھی۔ محبّ نے جانا تھا وہ اس کے کچھ کام آسکتی تھی۔ مگر اس کے انداز و اطوار اس کے لیے شدید خفگی کا باعث تھے۔ اس خفگی کا تاثر جب اس کے چہرے پر بھی چھلکا تو سویٹی ایکدم محتاط ہوگئی تھی۔

"آج کتھارس کا موڈ تھا محبّ! اجازت ہو تو عرض کروں؟"

سوال ہوا تھا اور محبّ نے ہونٹ بھینچ کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی سر کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ تو جیسے اسی اشارے کی منتظر تھی۔ میں نے شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو گھر میں تنگی، ترشی اور معمولی سے معمولی شے کے لیے بھی خواہشوں کو حسرت بنتے دیکھا۔ کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے اور آسائشات کی جتنی قلت تھی ہمارے ہاں افراد کی اسی قدر زیادتی۔ میرے علاوہ آٹھ بہنیں اور تھیں اور پھر چھوٹے چار بھائی اور کمانے والے صرف "ابا"! اور وہ بھی جب ایکسیڈنٹ میں اپاہج ہونے کے بعد بستر سنبھال کر رہ گئے تب روٹی کے حصول کے اصل لالے پڑے تھے۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں ایک فیکٹری میں کام پر لگ گئیں۔ مگر وہاں محنت اور تحقیر زیادہ اور معاوضہ بے حد کم تھا۔ زندگی کی گاڑی چلنا نہیں تو گھسیٹنا ضرور شروع ہوگئی تھی۔ میں تب نویں میں تھی۔

باب 8

پڑھائی میں بہت اچھی ہونے کے باوجود جانتی تھی تعلیم مکمل نہیں کرسکوں گی۔ بے دلی ایسی تھی کہ میں نے تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا اور دو بڑی بہنوں کے ساتھ فیکٹری جانے لگی۔ روزی کا یہ ذریعہ مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ ساری زندگی بھی جان توڑ کر محنت کرنے کے بعد بھی ہم کنویں کے مینڈک ہی بنے رہتے۔ اپنی ایک سہیلی کے مشورے پر میں نے ماڈلنگ کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اور سیانے کہتے ہیں نا کہ ڈھونڈنے سے تو ''خدا'' بھی مل جاتا ہے۔ یہ سچ ہے محبّ کہ انسان جن راستوں پر چلنا چاہتا ہے خدا انہی راستوں کو اس کے لیے کشادہ اور آسان بنا دیا کرتا ہے۔ بھلی سوچ رکھنے والوں کے لیے بھلائی کے راستے اور بُری سوچ کے حامل بُرے راستوں پر چلتے چلے جاتے ہیں۔ سو مجھے وہی ملا جو میری نیت اور مراد تھی۔ میں ماڈلنگ میں آ گئی۔ بظاہر وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ہی تھی مگر دنیا کی نظر میں، حقیقتاً وہ کچھ اور گورکھ دھندا تھا جب تک میری آنکھیں کھلیں میں اس سنہرے جال میں پوری طرح سے پھنس چکی تھی۔ میرے پاس اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کہ میں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی۔ ایسا ہوتا ہے نا محبّ ہم اپنی شامتِ اعمال کو اپنی قسمت کے کھاتے میں ڈال کر خود ہاتھ جھاڑ کر بری ذمہ ہو جاتے ہیں۔ وہ قسمت جو ''اللہ'' نے بنائی ہے اور لکھی ہے اور ''اللہ'' کسی کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی نہیں کرتا مگر ہم اتنے احسان فراموش ہیں، کم ظرف اور لاعلم ہیں کہ ان باتوں پر دھیان دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ بھی زیادتی ہے۔ ہماری خود اپنے ساتھ۔ اللہ نے ہمیں عقل سلیم دی ہے۔ ہم اس سے فیض یاب نہیں ہوتے، ہماری اپنی غلطی ہے نا۔ اللہ نے ہمیں ہاتھ، پیر، زبان ہر قسم کی نعمت عطا فرمائی۔ ہم اس سے صحیح کام نہیں لیتے۔ ہمارا اپنا ہی قصور ہوا نا؟ اسی لیے تو روزِ محشر ہمارے اعضاء ہمارے خلاف گواہی دیں گے''

اس نے چند لمحوں کا توقف کیا اور متاسفانہ گہرا سانس بھر کے سر جھکا لیا۔

''وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جو میں چاہتی تھی۔ زندگی کی چمک دمک۔ اچھا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، بس ایک عزت نہیں تھی۔ جس کا ملال اسے بار بار گنوانے کے بعد جیسے جاتا ہی رہا تھا۔ میں سوچتی اگر یہ دھوکہ دہی ہے تو کیا ہوا؟ گناہ ہے تو کیا فرق پڑتا ہے دنیا نے ہمیں دھوکہ نہیں

دیا، ہمارے خاندان میں صوفی اور علماء تو ویسے بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر جب ہم بھوکے تھے تو کون سے رشتہ دار یا پھر محلے والے نے آ کر پوچھا تھا۔ میرا باپ سڑک کنارے خون میں لت پت ہو کر تڑپتا رہا تھا کون آیا تھا مدد کو''

میرے پاس ضمیر کی ملامت کے جواب میں بہت ساری وضاحتیں اور دلیلیں تھیں۔ ذرا سی بے حسی کو اختیار کر کے میں ان لوگوں کو وہی کچھ لٹانے لگی تھی تو بھلا کیا گناہ کر لیا تھا۔ میں اگر مطمئن نہیں بھی تھی تو بے اطمینان بھی کہیں سے نہیں تھی۔ مگر پھر سب کچھ ایک چھناکے سے بکھر گیا۔ وہ سکون، وہ اندھی ہوس، اور وہ بے حسی، خود غرضی...... میرے پاس بچا تو میرے گھناؤنے چہرے کا عکس۔ میری بے جا خواہشات کی اندھی تکمیل کا تاسف رنج و ملال میں مبتلا کر دینے والا احساس، میرے ضمیر کے کچوکے لگاتا اور ہر ایک لمحہ سسکتا ہوا لو دیتا ہوا میٹھا درد۔ اور تم جانتے ہو محبّ عبدالقدوس مجھے یہ سوغاتیں عنایت کرنے کا سبب خدا نے کس کو بنایا؟ تم!! تمہیں۔ جسے ''رب'' نے روشنی بنا کر میرے پاس بھیجا اور میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ تمہارے نام سے تو اچھی طرح آگاہ تھی۔ کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر میں تمہارا نام مطلوب لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا جو کبھی نہ کبھی بہر حال ہدف بنا لیے جانا تھے۔ میں تمہارے کارناموں سے آگاہ تھی۔ تمہاری وہاں مدد میں نے محض دل کی خواہش پر ''لبیک'' کہتے ہوئے ہی تو نہیں کی تھی۔ میں تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی محبّ! جب تم زخموں سے چور تھے اور میں تمہاری مسیحائی کر رہی تھی۔ پھر جب تم چلے گئے تو یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا کہ تم یہ سب آخر کیوں کر رہے ہو؟ کس کی خاطر؟ بظاہر تو کچھ بھی حاصل وصول نہیں تھا۔ اگر میں اپنی سوچ سے سوچوں تو وہ ذہن اور دل جسے وطن پرستی محبت اور عشق کا سرے سے پتا نہیں تھا لیکن اگر تم سے جواب مانگوں تو اس کا جواب کچھ اور ہو سکتا تھا اور پتا ہے محبّ میں نے اسے اپنے نہیں تمہارے دماغ سے سوچا اور تب میرا ملال میرے پچھتاوے تاسف میں ڈھل گئے۔ میرا شمار میر صادق اور اس جیسے دیگر غداروں میں ہوا اور میں اسی فہرست میں شامل ہو کر مرنا نہیں چاہتی۔ محبّ میں حسینؓ کے لشکر میں حرؓ کے مقام کی متمنی ہوں اگر تم چاہو تو............''

آنکھوں میں نمی لیے وہ آس مندانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ گم صم ساکن تھا۔

''محبّ!!!''

اس نے پھر پکارا اور وہ جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہوا تھا

''کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ تم نے جو کچھ کہا اس کا حرف حرف سچ ہے خاص طور پر

آخری بات......؟'' آف کورس میں ہر کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ اور تم پر تو خاص طور پر''

محب عبدالقدوس کے جواب پر سویٹی کے لبوں پر شکست خوردہ مسکان بکھر گئی۔

''ہاں! ٹھیک کہتے ہو تم محب! چلو جانے دو۔ فیصلہ اور ثبوت وقت پر چھوڑ دیتے ہیں وقت بہترین فیصلہ کرے گا''

وہ اٹھی تھی اور چلتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جبکہ وہ اس کے نشان قدم کو دیکھتا اس کی باتوں پر نئے سرے سے غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ بے کل تھی۔ کیوں؟ خود نہیں جانتی تھی اسے ابنِ زید شدت سے یاد آرہا تھا۔ اس کی ایک بات اور وہ بھی پوری جزائیات کے ساتھ۔ جب سے وہ جہاد پر گیا تھا بہت کم ان سے ملنے آیا تھا۔ وہ بھی گھڑی پلوں کے حساب سے۔ وہ تو اس کی صورت بھی ڈھنگ سے نہیں دیکھ پاتی تھی کہ وہ پھر واپس چلا جاتا تھا۔ دل کی بے چینی بڑھی تو وہ اس کی تصویریں نکال کر بیٹھ گئی۔ کتنے رنگ اس کے سامنے بکھر گئے تھے پھر وہ دل بہلانے کو ان مخصوص جگہوں پر بھی گئی جہاں وہ ابن زید کے ہمراہ کئی مرتبہ گزر چکی تھی۔ دو پہاڑیوں کے درمیان اس طرح راستہ بنا ہوا تھا کہ اوپر ایک مستطیل چٹان تھی اور راستے کے اردگرد جنگلی پودوں اور پھولوں سے ڈھکا ٹیلا تھا۔ اور نیچے بہت گہرائی میں پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ابن زید ہمیشہ یہاں بیٹھ کر اپنی نظمیں لکھا کرتا، اسے جب بھی دیر ہو جاتی تو ماں اسے ابن زید کو تلاش کرنے بھیجتی، روشنی کو اس کی من پسند جگہ کا پتہ ہوتا۔ جبھی سیدھی وہیں آتی اور وہ کاغذ قلم سے تعلق استوار کئے اسے ہمیشہ وہاں ہی ملتا تھا۔ مگر آج وہ وہاں نہیں تھا۔ یہ جگہ خالی تھی۔ روشنی کے دل کو کچھ ہونے لگا وہ واپس لوٹی تو ڈھلتا سورج اس کی طرح بے حد ملول محسوس ہوا پھر گہری ہوتی شام کے ساتھ یہ احساس بڑھتا چلا گیا۔ اسے ابن زید کی سنائی نظم بازگشت بن کر اپنی سماعتوں میں اترتی محسوس ہونے لگی۔

پتا نہیں آج کی رات اتنی بوجھ کیوں ہے
زعفران اور چنار کی خوشبو فضا میں رچی ہے
جس کی مہک بڑی انوکھی ہے
شاید یہ آزادی کی دلہن کے کنوارے جسم کی خوشبو ہے
جس میں ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کا عطر گندھا ہے
اس لیے یہ اتنی بوجھل ہے

اور مجھ پر بھی ایک پر کیف نیند طاری کر رہی ہے
اے آزادی کی دلہن!
اب انتظار کی طنابیں ٹوٹنے والی ہیں
آ کر اپنے خوبصورت ہاتھوں سے
میری بوجھل آنکھیں بند کر دے
اور اپنی دلنشین آواز میں ایسی لوری گا
کہ آج کی رات میں پرسکون نیند سو جاؤں
اے آزادی کی دلہن
اے آزادی کی دلہن
ہمیں تری بہت چاہ ہے
اور ہم نے تیرے خیر مقدم کو
راستے لہو کے گلابوں سے سجا دیئے ہیں
تو کب ہمارے پھولوں کو عزت بخشے گی
اے آزادی کی دلہن
اے آزادی کی دلہن!

وہ گھر لوٹی تو اس کی ماں بہت جوش و خروش سے گڑ کے میٹھے چاول پکانے میں مصروف تھی اس کے کام سے ٹوکنے پر مسکرا کر بولی تھی۔

''صبح ابن زید کا پیغام آیا تھا۔ آج اسے ہم سے ملنے آنا ہے۔ اسے گڑ کے چاول پسند ہیں نا''

اور پتا نہیں کیوں روشنی اس اطلاع کو پا کر بھی خوش ہوئی نہ مسکرائی۔ شاید اس لیے کہ چند گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد ابن زید خود نہیں اس کی شہادت کی خبر پہنچ گئی تھی۔ وہ بھارتی فوجیوں سے زبردست معرکہ آرائی کے بعد جام شہادت نوش کر گیا تھا۔ روشنی کو لگا تھا اس کے وجود میں جان نہیں رہی ہو۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

وہ چلا گیا تھا۔ امن کا متلاشی، معصوم فرشتہ! جسے ڈل جھیل میں تیرتے بجرے اچھے لگتے تھے، جسے پہاڑیوں سے بہہ کر آنے والے چشمے گیت سناتے تھے۔

اس کے برعکس اس کی ماں نے کتنے سکون سے یہ خبر سنی تھی پھر اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

''الحمد اللہ'' میرے بیٹے کو خدا کا شکر ہے اس کی منزل مل گئی۔ اللہ سے دعا ہے اللہ اس

کی شہادت قبول فرمائے"

آنے والے مجاہدین کے واپس لوٹ جانے کے بعد اس کی ماں اس کی سمت متوجہ ہوئی تو اسے آنسو بہاتے دیکھ کرنا گواری سے بولی تھی۔

"ابن زید شہید ہوا ہے۔ شہید زندہ ہوتے ہیں انہیں رویا نہیں جاتا۔ تم نے سنا نہیں ابن زید کتنی جوانمردی سے لڑا ہے۔ وہ خدا کی امانت تھا خدا نے اپنی امانت لے لی تو دکھ کیا؟ اور میں نے تمہاری تربیت ایسی تو نہیں کی تھی کہ تم اس قسم کی خبر سن کر حوصلہ ہار دو"

وہ اسے ڈانٹتی رہی تھی پھر وضو کر کے اندر گئی اور جائے نماز پر جا بیٹھی۔ روشنی بہت دیر بعد خود کو سنبھال کر اندر آئی تو اس کی ماں کی زندگی کی اسی پرسنل ڈائری کا آخری صفحہ کھلا ہوا تھا۔ اور اس پر جو تحریر تھی روشنی اسے دھندلی بصارت سے پڑھنے لگی۔

وہ میرا شیر دل بہادر
پتھریلی زمیں پر یوں پڑا تھا
کہ خون اس کے سینے سے ابل رہا تھا
میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی
اور فخر سے سربلند کر کے آسمان کی طرف
شکر کی نگاہ سے دیکھا
کہ اس نے پیٹھ پر زخم نہیں کھایا تھا

روشنی نے ہاتھ کی پشت سے گیلی آنکھیں رگڑ کر خشک کر دیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان بکھرنے لگی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی اس نے اس ڈائری کو پڑھا تھا تب وہ اپنی ماں سے شاکی ہو گئی تھی مگر آج یہ شکوہ یہ رنج گہرے سکون اور آسودگی میں ڈھل گیا تھا۔ اسے لگا تھا اس کی ماں بالآخر ایک صحیح راستے کا تعین کر چکی تھی۔

☆☆☆

بدن گر کاغذی ہوتا
میں اشکوں کی سیاہی سے
کہانی دل کی لکھ لیتی
ہتھیلی کی لکیروں سے
کئی خانے بنا لیتی

میں آنکھوں میں بسے خوابوں کو
پلکوں سے جدا کر کے ہی شام غم منا لیتی
کوئی سپنا بہا دیتی۔ کوئی سپنا بچا لیتی
جڑیں تجھ سے یہ یادیں سب
کسی ماچس کی تیلی میں چھپا لیتی
کبھی بوجھل جو تو ہوتا
میں چپکے سے وہی تیلی
اپنی سانسوں کی حدت سے
جلا کر خود کو بھڑکاتی
تیری مشکل کو حل کر کے
میں آسانی سے مر جاتی

دیا نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ نہ صرف حد سے زیادہ مصروف بلکہ ہر شے سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مضطرب تھا، وہ پریشان تھا مگر وہ ہر بار اس کے پوچھنے پر ٹال جاتا۔ دیا اس سے ہزار شکوے رکھنے کے باوجود کچھ کہہ نہ پاتی یا شاید وہ اسے موقع ہی نہ دیتا تھا۔

لیٹ نائٹ گھر آتا تو اتنا پژمردہ، نڈھال اور افسردہ ہوتا کہ لیٹتے ہی کروٹ بدل کر سو جاتا۔ بلکہ دیا کو کئی بار لگا وہ محض سونے کی اداکاری کرتا ہے۔ ورنہ ساری رات تو وہ بستر پر پہلو بدلتے گزارتا تھا کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی طرف کی اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ دیا کا دل ہر وقت ہی ملول رہنے لگا۔ جانے کیوں اسے لگتا کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔ غلام حسین کی یہ غفلت، یہ بے نیازی بے وجہ تو نہیں تھی۔ خود اس کے پیچھے بھی تو وہ یونہی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس روز بھی وہ چیک اپ کرانے کو آئی تھی۔ چند ماہ بعد ڈلیوری تھی۔ آج پھپھو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جبھی وہ غلام حسین کا انتظار کئے بغیر خود ہی چلی آئی تھی۔ چیک اپ کے بعد وہ کچھ ضروری چیزوں کی خریداری کے خیال سے مارکیٹ کی جانب جا رہی تھی۔ گاڑی سگنل پر رکی تو کھڑکی سے جھانکتی دیا کو یکدم لگا تھا وہ پتھر کی ہو گئی ہو۔ یہ چرچ روڈ تھا کالج کے سامنے ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ جس کے باہر دیا نے غلام حسین کو ایک طرح دار بے حد حسین لڑکی کے ساتھ کھڑے باتوں میں مگن پایا تھا۔ کتنا رف حلیہ تھا غلام حسین کا۔ دیا کو بے حد حیرت نے آن لیا۔ اچانک اسے جانے کیا ہوا تھا کہ وہ

گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی، گاڑیوں، رکشوں موٹر سائیکلوں کے بیچ سے گزرتی وہ تیزی سے اس کی جانب لپکتی چلی گئی تھی۔ بائیک کی چابی کو انگلی پر گھماتے اس لڑکی کی کسی بات کا جواب دیتے اچانک غلام حسین کی نگاہ بھی دیا پر اٹھی تھی۔ دیا نے اس کی رنگت فق ہوتی محسوس کی۔ اس کی نگاہوں میں ایک لمحے کو تحیر چھلکا تھا۔ دیا نے اس پل اپنے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹتا محسوس کیا۔

''غلام حسین، لسن''

اس سے قبل کہ وہ کترا کر نکلتا دیا نے بے تابی سے اسے پکارا تھا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور یہ کون ہے لڑکی؟''

اس کے نزدیک پہنچ کر وہ طیش اور خفگی کو دبائے بغیر تلخی سے بولی تھی۔ مگر اگلا لمحہ شاکڈ کر دینے والا تھا جب غلام حسین نے اجنبیت بھری نظروں سے اسے دیکھتے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''ایکسکیوز می میم! آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہیں۔ میں غلام حسین نہیں ہوں''

اس نے نخوت سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ دیا کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے رنج سے پھٹ جانے والی نظروں سے اسے خود سے دور ہوتے دیکھا تھا۔ جو اس لڑکی کی ہمراہی میں وہاں سے ہر لمحہ دور ہو رہا تھا اور وہ لڑکی بار بار حیرانی سے پلٹ کر اسے دیکھتی تھی دیا کو شرمندگی کے احساس نے عرق ندامت میں ڈبو دیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی واپس اندھا دھند اپنی گاڑی کی جانب لپکی تھی۔

☆☆☆

خود بخود چھوڑ گیا تو چلو ٹھیک ہوا
اتنے احباب کہاں ہم سے سنبھالے جاتے
ہم بھی غالب کی طرح کوچۂ محبوب سے ساقی
نہ نکلتے تو کسی روز نکالے جاتے

دیا گھر جانے کی بجائے پپا کی طرف آ گئی تھی۔ دکھ اور رنج ایسا تھا کہ خفگی کا احساس ہی بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی تھی آخر غلام حسین نے ایسا کیوں کیا؟ وہ جس قدر سوچتی اسی قدر تکلیف اور اذیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رات کو غلام حسین کے فون پر فون آنے لگے تھے مگر اس نے ایک بھی کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ پھپھو الگ اس کی اس حرکت پر پریشان تھیں اور فون پر اسے نرمی سے سہی مگر ڈانٹا بھی تھا کہ اگر اسے ادھر بھی آنا تھا تو کم از کم بتانا چاہئے تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی تھی۔ رات کا دوسرا پہر تھا جب غلام حسین خود وہاں چلا آیا تھا۔ دیا نے اسے دیکھتے

ہی رخ پھیر لیا۔

''دیا! کیا بات ہے۔ کیوں خفا ہو۔ فون بھی اٹینڈ نہیں کیا اور......''

''آپ مجھ سے بات نہ کریں۔ چلے جائیں یہاں سے''

وہ چیخ پڑی تھی۔ غلام حسین نے ساکن ہو کر اسے دیکھا۔ وہ رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کر چکی تھی۔

غلام حسین کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

وہ کسی قدر تحمل سے بولا تھا۔ دیا نے گھورتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر بپھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیا تھا۔

''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ شیم آن یو۔ خود سے پوچھیں نا میں ایسا کیوں کر رہی ہوں؟''

وہ بھڑک اٹھی تھی۔ غلام حسین نے اسے تھام کر اپنے مقابل کرنا چاہا تو وہ مچل کر دور ہوئی تھی۔

''مت چھوئیں مجھے۔ آپ جانتے نہیں ہیں نا مجھے''

وہ چیخ پڑی۔ غلام حسین کے چہرے پر اذیت رقم ہونے لگی۔ وہ سخت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

''بتائیں ہوٹل کے سامنے اس لڑکی کے ساتھ آپ نہیں تھے۔ بلکہ اب بھی مکر جائیں۔ آپ کا حلیۂ آپ کا لباس بدل چکا ہے نا۔ اب تو آپ غلام حسین ہی ہوں گے''

رنج سے شق ہوتے دل کے ساتھ وہ زور سے چیخی تھی۔ غلام حسین نے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''کیا کہہ رہی ہو دیا! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اچھا بتاؤ تم آج کہیں گئی تھیں؟ دیکھو جو بھی بات ہے کھل کر کرو؟''

دیا اسے گھورنے لگی۔ غلام حسین کے چہرے پر پریشانی استعجاب اور الجھن مترشح تھی۔ دیا کا اپنا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''ہاں میں گئی تھی کہیں۔ اور شاید یہ میری غلطی تھی۔ میں نے ہوٹل کے باہر آپ کی شکل کے ایک لڑکے کو دیکھا تھا اور دھوکے میں اسے اپنا شوہر سمجھ کر بات کر لی۔ جواب میں اس نے مجھے میری اوقات یاد کرا دی''

وہ غصے میں کہتی گئی ساتھ تسلسل سے آنسو بہہ رہے تھے۔ غلام حسین نے آہستگی و نرمی کے ساتھ اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''عین ممکن ہے دیا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔''

وہ اسے تھپک رہا تھا نرمی، حلاوت اور محبت سے۔ دیا پرسکون ہونے لگی۔ ہاں بھلا وہ غلام حسین کیسے ہو سکتا ہے۔ معمولی لباس میں ملبوس۔ وہ اس کا ہم شکل کوئی اور ہوگا۔ دادو بھی تو کہتی ہیں۔ اللہ نے ایک شکل کے کتنے انسانوں کو بنایا ہے۔ وہ غلام حسین کا ہم شکل کوئی اور ہوگا۔ وہ غلام حسین کیسے ہو سکتے ہیں۔''

اس نے خود کو ڈھارس دے لی تھی اور تمام خفگی مٹا کر غلام حسین کے ہمراہ اپنے گھر آئی۔

☆☆☆

اے روحِ قائد آج کے دن ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں
دریا کی تہہ میں اتریں گے رخشندہ گوہر لائیں گے
افلاک کی حد کو چھو لیں گے تارے بھی زمیں پر لائیں گے
کر دیں گے عمل سے بھی ثابت باتیں تو ہمیشہ کرتے ہیں
اے روحِ قائد آج کے دن ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں

سردی کا دھیما ان تپا سورج پردۂ مغرب میں غڑاپ سے ڈوب گیا۔ شفق کے سرخ نارنجی شیڈ۔ دھیرے دھیرے اندھیرے میں بدلے گہرے میں ڈھکی گھاس جیسے سرمئی میدان بن گئی۔ اسوہ نے ملی نغمہ کی گنگناہٹ کو روکا اور دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرمائش دیتے کچن کی جانب آ گئی۔ ابن زید کے کمرے کی روشن لائٹ اس نے کچن سے کھڑکی کے روشن شیشوں سے دیکھ لی تھی۔ بی جان نماز میں مشغول ہوئیں تب وہ ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ وہ ادھر آئی ہوئی تھی۔ سکندر کو گئے اتنے بے شمار دن بیت گئے تھے جب بھی اس کا زیادہ دل اداس ہوتا وہ اماں کو بتا کر ادھر آ جاتی۔ ابن زید سے باتیں کرتی تو دل کا بوجھل پن قدرے کم ہونے لگتا وہ چائے بنا کر ابن زید کے کمرے میں لائی تو ابن زید شاید واش روم میں تھے۔ ٹیبل پر ان کی ڈاک کھلی پڑی تھی جو ان کے ڈھیروں فینز (پرستار) انہیں باقاعدگی سے بھیجتے رہتے تھے۔ اسوہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور یونہی ہاتھ بڑھا کر ایک خط اٹھا لیا۔ یہ پچھتر سالہ آدمی کا خط تھا جس نے ابن زید کے نام اپنی نیک تمنائیں اور خواہشیں کرنے کے بعد لکھا تھا۔

''آپ میرا پیغام میڈیا کو پہنچا دیں کہ میرے ملک میں اتنی مایوسی نہ پھیلائیں۔ ہر

موضوع خاص طور پر اسلام اور پاکستان کے خلاف پروگرام نہ کریں اور روشن خیالی کے نام پر ہر حد پار کرنے والے کو اتنی کوریج نہ دیں۔ کیوں بلاتے ہیں ایسے لوگوں کو روزانہ.....؟ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن روز روز دیکھ کر لگتا ہے یہ بہت زیادہ ہیں ''میڈیا لانچ'' کی اصطلاح اب ہم جیسے بڈھوں کی سمجھ میں بھی آتی ہے۔ کیا صرف متنازعہ باتیں ہی رہ گئی ہیں؟

قائداعظم کی موت کیسے واقع ہوئی؟

وہ سیکولر تھے؟

شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں لوگ ٹی وی پر بیٹھ کر اپنے ملک کے خلاف اتنا بولتے ہوں جتنا ہمارے ملک میں بولا جاتا ہے۔ میڈیا کو آزادی ملی۔ لیکن کیا اس کی قیمت ملک کی غیرت رکھی گئی؟ یہاں کھلے عام کوئی بھی کہہ دیتا ہے کہ ہمیں اسلام کے اندھیرے سے نکل آنا چاہئے۔ جس کا جی چاہتا ہے وہ پاکستان کے خاتمے (خدانخواستہ) کی تاریخ طے کر دیتا ہے۔ یہاں بے حیثیت، بے عہدہ و بے چہرہ و بے بنیاد لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چوراہے میں پاکستان اور اسلام کی دھجیاں اڑا دیں۔ یہاں کوئی بھی دو قومی نظریئے کو تار تار کر دیتا ہے۔ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ٹی وی چینل کے کسی پروگرام میں ٹیبل پر ہاتھ مار مار کر دعویٰ کرتا ہے کہ.....ہم پاکستان کو سیکولر بنا کر دم لیں گے۔ دو قومی نظریہ بکواس ہے۔

کون ہیں یہ لوگ؟ دلوں میں وسوسہ ڈالنے والوں سے تو پناہ مانگی گئی ہے۔ پھر یہ لوگ کون ہیں۔''

اسی پل کھٹکا ہوا اور ابن زید اندر چلے آئے، اسوہ نے سر اونچا کر کے انہیں دیکھا۔ وہ اسے روبرو پا کے خیر مقدمی انداز میں مسکرائے تھے۔ مگر اسوہ ابھی اس گھمبیر سوالنامے میں الجھی تھی۔ جبھی مسکرا نہیں سکی۔

''اچھی تو ہو نا اسوہ! سکندر سے بات ہوتی رہتی ہے تمہاری؟''

''جی ہو جاتی ہے مگر بہت کم!''

ابنِ زید اس کے روبرو آ کے بیٹھے تب اسوہ نے اسی کھوئی کھوئی کیفیت میں جواب دیا تھا۔ پھر خط ان کے سامنے لہرا کر بولی تھی۔

''آپ نے پڑھا اسے''

''پڑھ چکا ہوں''

ابن زید نے گہرا سانس بھر کے جواب دیا تھا۔ پھر اس کے سوالیہ نگاہوں کو پا کر

افسردگی سے مسکرائے۔

''ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ابھی پاکستان میں ایسی سوچ رکھنے والے لوگ موجود ہیں ورنہ بے حسی کی چادر بہت دبیز ہوتی جارہی ہے۔ اندھیرا بہت بڑھ رہا ہے اسوہ! ابھی میں نیٹ پر ایک میگزین کو سرچ کر رہا تھا۔ وہاں کشمیر کے حالات پر ایک سلسلہ وار کہانی شائع ہو رہی ہے۔ سمجھو میں اسی وجہ سے لوگوں کے تاثرات جاننے کو خطوط پڑھتا ہوں مگر بہت مایوسی ہوئی لوگ اس بری طرح سے گمراہی کی دلدل میں دھنسے ہیں کہ ان انہیں اس قسم کی تحریریں جھنجوڑنا تو ایک طرف خواب غفلت سے جگانا تو دور کی بات بس کوفت میں مبتلا کرتی ہیں۔ ایک خاتون نے لکھا کہ کشمیر کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ اب کچھ بھی نیا نہیں لگتا۔ آئی کانٹ بلیواٹ...... اسوہ لوگ اتنے سفاک ہوگئے ہیں۔ مجھے بتاؤ اگر دکھ پرانا ہوجائے تو اپنا احساس ختم کر دیتا ہے؟ درد جتنا پرانا ہوگا اس کی شدت اسی قدر بڑھتی جاتی ہے نا...... یہ کیسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انہیں اس میں نیا پن نظر نہیں آتا۔ وہ نیا پن کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ اس کرب کو کیوں محسوس نہیں کرتے۔ میں وہاں گیا تھا میں وہاں رہا ہوں۔ وہاں کے لوگ پاکستان سے عشق کرتے ہیں وہ پاکستان کی سرزمین کو چھونے کی خواہش میں تڑپ رہے ہیں اور ایک یہاں کے باسی ہیں کہ......''

وہ ایک دم چپ ہوگئے، ان کا گلا بھرا گیا تھا۔ اسوہ نے دیکھا ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں بے تحاشا سرخی تھی۔ وہ دونوں خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے، ان کے درمیان خاموشی دکھ اوڑھے سسکتی رہی۔ چائے کا خیال کسے رہنا تھا جو پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی تھی، اسوہ ان کے کمرے سے اٹھی تو اس کا دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا، باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ اسوہ نے اپنے سیل پر اماں کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں کل آنے کا بتایا تھا۔ بارش کی وجہ سے اب وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ بی جان نے اس کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ کھانا گرم کرنے کے ارادے سے کچن کی سمت آئی تو اسی پل زور و شور سے کال بیل بجنے لگی تھی۔ اس نے کچن کی بجائے بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازہ بنا پوچھے کھولا تھا اگلے لمحے وہ سکندر کو چوکھٹ میں ایستادہ پا کے حیرت غیر یقینی اور مسرت کے احساس سے چیخی تھی پھر آگے بڑھ کر بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔

''آئی ایم ویری مسنگ یو سکندر رئیلی!''

وہ اس کے ساتھ لگی سرشاری کی کیفیت میں بولی۔

''مجھے پتا تھا جبھی دیکھو چلا آیا نا'' وہ جواباً ہنسا تو اسوہ نے کچھ خیال آنے پر ذرا ہٹ کے اسے گھورا تھا۔

''جی ہاں! یہاں آنے کا مقصد۔ سیدھی طرح کہیں مجھ سے زیادہ ابنِ زید سے ملنے کی بے چینی تھی۔ جبھی تو سیدھے ادھر آئے ہیں، اب یہ نہ کہئے گا کہ گھر سے ہو کر آئے ہیں، میں ابھی اماں سے بات کر رہی تھی انہوں نے ہرگز کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ آپ آتے اور وہ مجھے آگاہ نہ کرتیں۔''

سکندر اس کے نان اسٹاپ بولنے پر کھسیا کر ہنسا تھا۔

''میں ایسا کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہاں آنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ ان سے ملو یہ روشنی ہیں''

سکندر نے اپنے پہلو میں کھڑی لڑکی کی سمت اشارہ کیا تو اسوہ ایکدم ساکن ہوگئی تھی۔

''کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے زوجہ! یہ ابنِ زید کی امانت ہیں، انہیں کو سونپنے کی خاطر میں سیدھا یہاں آیا ہوں۔ ارادہ آپ سے مکمل فرصت میں ملنے کا تھا''

اس کی شاکی اور مشکوک نظروں کے جواب میں سکندر نے اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی حفظ ماتقدم کے طور پر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اسوہ ٹھٹکی اور الجھ کر بغور اس بے حد حسین کشمیری لڑکی کو تکنے لگی جو کسی حد تک گھبرائی نظر آئی تھی۔

☆☆☆

''دیا بیٹے غلام حسین نہیں اٹھا ابھی!''

ناشتے کی ٹیبل پر مما نے اسے مخاطب کیا تھا۔

''اٹھے تھے پھپھو نماز پڑھ کر پھر سو گئے۔ شاید آفس نہیں جانا تھا''

''پتا نہیں یہ لڑکا کن الجھنوں میں پڑ گیا ہے۔ میں تو اب اس کی طرف سے فکرمند ہو کر رہ گئی ہوں''

مما نے تشویش ظاہر کی تھی۔ دیا نرمی سے مسکرا دی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے پھپھو! بس ان کی عادت ہے ایسی۔ ڈونٹ وری!''

وہ ان کی تسلی کی خاطر ہی لہجے کو سرسری بنا کر بولی تھی۔ جس سے یقیناً انہیں ڈھارس ملی تھی۔

''اچھا بیٹے تم ایسا کرو اسے جگا دو اب، مجھے کچھ بات بھی کرنی ہے اس سے''

دیا نے سر کو اثبات میں ہلایا اور اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ غلام حسین جہازی سائز بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے پیر کمبل سے باہر تھے۔ دیا کو اسے موزے پہنے دیکھ کر غصہ آگیا۔ کئی مرتبہ وہ اسے سمجھا چکی تھی کہ رات کو موزوں سمیت نہ سویا کرے مگر وہ اس کی بات پر کان ہی نہ دھرتا تھا اس نے کچھ غصے، کچھ جھنجلاہٹ میں آگے بڑھ کر اس کے پیر سے موزے کھینچے تھے۔ اگلا لمحہ اس

کے لیے شاک میں مبتلا کر دینے والا تھا اس کی خوف اور غیر یقینی سے پھٹی نگاہیں غلام حسین کے پیروں پر جمی ہوئی تھی۔ معاً اس پہ سکتہ ٹوٹا تھا۔ اور اس کے حلق سے کربناک چیخیں نکلتی چلی گئی تھیں۔ غلام حسین صورتحال سے بے خبر اس کی ہذیاتی چیخوں پر گھبرا کر اٹھا، اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالتا وہ حواس کھوتی گرتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''آپ کو روشنی کیسی لگی ہے ابن زید؟''

سکندر بہت فرصت سے ان کے سامنے آن کر بیٹھا تھا۔ اور بہت محتاط انداز میں سوال کیا۔ روشنی کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنی عادات و اطوار کی وجہ سے بی جان کو تو بری طرح بھا گئی تھی۔

''اچھی لڑکی ہے مگر سکندر یہ بہت بڑی ذمہ داری نہیں ہے۔ بی جان اس بڑھاپے میں کہاں تک جوان لڑکی کا بوجھ اٹھائیں گی''

ان کے جواب نے سکندر کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ بکھیر دی۔

یہ جموں کشمیر کی رہائشی بے یارومددگار لڑکی ہے ابن زید! ایک بار مجھے شدید زخمی حالت میں روشنی کی ماں نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ روشنی کا بھائی مجاہد شہید ہو چکا ہے باپ کو بھارتی فوجیوں نے تشدد کے دوران مار دیا۔ اور ایک ہفتہ قبل اس کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا ابن زید انہوں نے آپ کے لیے ایک میسج دیا تھا''

''میرے لیے......؟''

ابن زید نے ٹھٹک کر سکندر کو دیکھا تو سکندر مسکرا دیا۔

''جی آپ کے لیے''

''مگر میں تو انہیں جانتا نہیں تو......''

''وہ آپ کو شاید بہت اچھی طرح جانتی تھیں ابن زید! یہ ان کا لیٹر ہے آپ کے لیے''

سکندر نے کرتے کی جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا جسے ابن زید نے حیرت اور کچھ الجھن کے عالم میں اٹھا کر کھولا تھا۔

السلام علیکم!

زندگی کی غلطیوں نے اتنی شرمساری اور خفت جھولی میں ڈالی کہ میں خود کو آپ سے معافی کے قابل بھی نہیں سمجھتی ہوں ابن زید! میں جواب اس آس سے بھی مایوس ہو گئی تھی کہ آپ کے

ساتھ کی گئی زیادتی کا ازالہ کر دوں کہ قدرت کو میرے اوپر رحم آ گیا۔ سکندر کے ذریعے میں آپ سے صرف اتنی گزارش کروں گی ابن زید کہ میری بیٹی کو اپنا لیں۔ میں نے اس کی تربیت ایسی کی ہے کہ آپ اس میں کبھی کوئی چھوٹی سی بھی جھلک ضویا کی نہیں پائیں گے۔ اس دنیا میں ''اللہ'' کے بعد میں اس کا آخری سہارا تھی اور جانے کب یہ سہارا ٹوٹ جائے۔ ابن زید میری بیٹی کا سہارا بن جائیے گا۔ مجھے اعتراف ہے میں آج بھی مطلب پرست ہوں۔ مگر مجھے معاف کر دیں اور میری بیٹی کو قبول کر لیں اور زندگی سے اس تلخی کو کم کرنے کی کوشش کریں جو میری وجہ سے آپ کا نصیب بنی۔

ضویا!

کاغذ کا پرزہ ابن زید کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ ابن زید نے ہاتھوں میں سر تھام لیا تھا۔ سکندر بتا رہا تھا روشنی کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ کیا وہ ایک مر جانے والی عورت کو بھی معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ وہ گم صم بیٹھے تھے۔

☆☆☆

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس کے آس پاس کتنے چہرے تھے۔ سب اپنے تھے اور جوان سب سے زیادہ قریب تھا جس کی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچ گئی تھی پتا نہیں کہاں تھا۔ پتا نہیں وہ غلام حسین تھا یا پھر محب عبدالقدوس!......!

اگر دیا نے عبدالرحیم کا ''اک گمنام سپاہی'' کے نام سے چھپنے والا کالم نہ پڑھا ہوتا تو غلام حسین کے پیروں کے ناخنوں کو جڑ سے اکھڑے پا کر بھی اس اسرار کی تہہ تک نہ پہنچتی۔

جسے غلام حسین نے ان سب سے چھپایا تھا۔ اور کیوں چھپایا تھا۔ یہ وہ جان سکتی تھی۔ محب عبدالقدوس کی جان کو کتنا خطرہ لاحق تھا۔ یہ اس سے متعلق جاننے والا ہر ذی شعور بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور اس بات کو لے کر ہی اس کا باؤلا دل اس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ اس نے ان چند دنوں میں غلام حسین سے اتنی شدت سے محبت کی تھی کہ اس سے جدائی کا خیال بھی سوہان روح تھا کسی بھی صورت وہ اسے کھونے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ بے بسی کے آنسو اس کے بالوں میں سرعت سے جذب ہونے لگے۔ تبھی غلام حسین وہاں چلا آیا تھا۔ اسے روتے پایا تو اسی کی جانب آ گیا۔

''دیا!'' غلام حسین نے بے قراری سے کہتے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

''تھنک گاڈ! کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مما کو بچے کی بہت فکر تھی مگر مجھے صرف تمہاری!''

"دیا ایک دم سے تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

وہ کتنا متفکر تھا کس درجہ پریشان۔ دیا نے چھلکتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اٹھنا چاہا۔ غلام حسین نے اسے سہارا دیا تھا۔ اس کی کمرے کے گرد بازو حمائل کر کے اٹھایا اور پشت پر تکیہ رکھ دیا۔

"اب تم کیا محسوس کر رہی ہو؟"

وہ اس کے بکھر جانے والے بے ترتیب ریشمی بالوں کو سمیٹ رہا تھا۔ دیا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں سے اسے تکتی رہی، عجیب وحشت بھرا انداز تھا۔

"کون ہو آپ"

دیا نے زبردستی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ غلام حسین کا وجیہہ چہرہ پہلے ہونق ہوا۔ پھر جیسے کسی آگاہی کو پا کر اسی قدر متغیر

"کیا مطلب!" وہ گڑبڑا کر بولا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں آپ غلام حسین ہیں یا محب عبدالقدوس!"

وہ ایک دم پھر سے رو پڑی۔ اتنی شدتوں سے کہ غلام حسین شاکڈ رہ گیا۔ دیا نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں۔ گو کے کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اس کے باوجود غلام حسین نے خائف سے انداز میں اطراف میں دیکھا تھا۔

"آپ جھوٹ نہیں بول سکتے غلام حسین! بس یہ بتائیں کیوں چھپایا ہم سے؟"

وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ غلام حسین ہنوز شاکڈ تھا۔ دیا نے اسے زور سے جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ سرد مگر لہو رنگ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ہاں میں غلام حسین ہی محب عبدالقدوس ہوں۔ اگر تم کسی طرح بھی یہ بات جان چکی ہو دیا تو پلیز کسی اور کو نہ بتانا۔ اٹس مائی آرڈر...... او کے؟"

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔ دیا لمحوں میں سرد پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

زندگی توڑ کر ہم کو بکھیرو اب ایسے
نہ پھر سے ٹوٹ پائیں ہم
نہ پھر سے جوڑ پاؤ تم

وہ یقین بھی اگر کرتی تو کیسے؟ یہ وہ غلام حسین تھا ہی نہیں۔ جسے وہ جانتی تھی یہ تو کوئی اور تھا ہاں وہ غلام حسین تھا بھی کب...... وہ تو محب عبدالقدوس تھا۔ جو اپنے ملک و قوم کی بقا اور

سلامتی کے لیے ایک عرصہ ہوا خود کو مٹا چکا تھا۔ وہ تو سر پر کفن باندھ چکا تھا۔ پھر بھلا وہ موت سے ڈرتا بھی تو کیونکر...... ہر حربہ ہی تو اس نے آزما لیا تھا۔ پیار محبت و منت سماجت خفگی، دھمکی، غصہ مگر وہ تو جیسے پتھر تھا۔ جس سے وہ سر پھوڑتی رہی تھی۔

"تو آپ نہیں مانیں گے میری بات؟"

اس کا لہجہ یاسیت زدہ ہو گیا تھا۔ کتنا ہاری ہوئی لگ رہی تھی وہ

"ماننے والی بھی تو ہو؟"

غلام حسین اس کی لاچاری کے جواب میں خود اس سے بڑھ کر لاچار نظر آنے لگا۔

"اگر یہی سب کرنا تھا تو کیوں مجھے اپنی زندگی میں زبردستی شامل کیا۔ کیوں اتنی چاہت، اتنی محبت دی مجھے کہ میں بھی آپ سے محبت کرنے پر مجبور ہو گئی؟"

وہ سسک اٹھی اور غلام حسین خفت زدہ نظر آنے لگا۔

"ہاں یہ غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے دیا! میں نہیں جانتا تھا کہ جس وجہ سے میں نے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کیا وہ وجہ بھی تمہیں مجھے اس راستے پر چلنے سے......"

"غلام حسین!!!" وہ سسک اٹھی۔

"بہت کٹھور ہیں آپ!"

"تم اس سے بہتر الفاظ بھی میرے لیے استعمال کرتی تھیں کہ میں بہت خاص ہوں وغیرہ وغیرہ......"

وہ موڈ بدل کر قدرے شوخی سے بولا۔ وہ ہارنے لگی۔

"کیوں کر رہے ہیں ایسا؟" اور جواباً وہ گہرا سانس کھینچ کر بولا تھا۔

زندگی کی دعا نہیں دیجئے
ضد نہیں کیجئے، ڈوبنے دیجئے
اپنی تشنہ لبی کا تقاضا ہے یہ
پانیوں کے سفر پر چلیں جس گھڑی
ساحلوں پر کوئی بھی ہمارا نہ ہو
اجنبی دیس کی ملگجی شام کے
آسمانوں پر کوئی ستارہ نہ ہو
آخری دم تک کشتی عمر کو

بادبانوں کا کوئی سہارا نہ ہو
اب ہمارا تھا تعاقب نہیں کیجیے
ڈوبنے دیجیے، ڈوبنے دیجیے

"غلام حسین بس کر دیں۔ آپ کو بالکل کوئی خیال نہیں ہے میرا۔ آپ کتنی زیادتی کر چکے ہیں"

وہ خود پر ضبط کھو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور غلام حسین وہ بے چین سا مضطرب نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"آئی ایم سوری دیا! میں واقعی بہت برا ہوں۔ اپنی غرض کا غلام، صرف اپنے لیے سوچنے والا، تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے تم سے اس طرح شادی نہیں کرنی چاہئے تھی، ہو سکے تو مجھے معاف کر دو"

غلام حسین نے صرف دلگیری سے کہا نہیں اس کے سامنے معافی کے انداز میں اپنے ہاتھ بھی جوڑ دیئے تھے، دیا نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور انہیں ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر کچھ اور شدتوں سے رونے لگی۔

"دیا ایسا مت کرو پلیز ایسا مت کرو۔ مجھے یوں احساسِ ندامت میں مبتلا مت کرو"

وہ بے بس سا ہوتا اسے چپ کرانے کی سعی کرنے لگا۔

"آپ کو اس بچے کا بھی خیال نہیں ہے غلام حسین جو ابھی اس دنیا میں بھی نہیں آیا آپ کیوں اس سے اپنی محبت چھیننا چاہتے ہیں؟"

اور غلام حسین اس بات کو سن کر جیسے صدمے سے گنگ ہونے لگا تھا۔

"اگر یہ بات تمہاری جگہ کسی اور نے کہی ہوتی دیا تو مجھے کبھی اتنا تاسف، اتنا دکھ نہ ہوتا۔ تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ چکی ہو۔ موت کا ایک دن متعین ہے۔ دیا حدیث ہے کہ عورت کا انتخاب کرتے وقت اس میں تین چیزوں کو دیکھا جانا چاہئے۔ اس کا حسن، اس کی دولت اور اس کا مذہبی ہونا۔ خدا گواہ ہے دیا میں نے تمہیں تمہارے حسن کی وجہ سے نہیں، تمہارے مذہبی ہونے کی وجہ سے اپنے لیے پسند کیا تھا۔ تم مجھے بہترین انتخاب لگی تھیں۔ دیا مجھے بتاؤ اگر تم مجھے میرے مشن سے الگ کر دو تو کیا تم میری لمبی زندگی کی گارنٹی دے سکتی ہو؟"

وہ سخت متاسف سا پوچھ رہا تھا

دیا ایک لمحے کو خفت سے سرخ پڑ گئی پھر خود کو سنبھال کر لجاجت سے بولی تھی۔

"آپ آخر اتنی خوفناک باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"تاکہ تم حقیقت کا سامنا کرنا سیکھ لو" جواباً وہ رسانیت سے بولا تھا۔

"دیا تمہیں مجھ سے محبت ہے نا؟ اللہ اپنی راہ میں اسی شے کو پسند فرماتا ہے جو آپ کو سب سے زیادہ عزیز ہو۔ اور وگرنہ ہم اس آزمائش اور محبت میں سچے ثابت نہیں ہو سکتے۔ یہ سبق تمہیں بھول کیوں گئے ہیں دیا!"

وہ زچ ہوا تھا اور دیا وہ ساکن رہ گئی تھی کیا وہ واقعی بھول رہی تھی۔ وہ ساری ہدایت وہ سارے اسباق جو اسے مذہب نے دیئے تھے۔ جو اسے کبھی ازبر تھے۔ اسے لگا وہ پوری طرح گمراہ ہونے سے قبل ہی سنبھل گئی ہے۔

☆☆☆

سنا ہے اس محبت میں
بہت نقصان ہوتا ہے
مہکتا جومتا جیون
غموں کے نام ہوتا ہے
سنا ہے چین کھو کر وہ
صبح و شام روتا ہے
محبت جو بھی کرتا ہے
بہت بد نام ہوتا ہے
سنا ہے اس محبت میں
کہیں بھی دل نہیں لگتا
بنا اس کے نگاہوں میں
کوئی موسم نہیں جچتا
خفا جس سے محبت ہو وہ جیون بھر نہیں ہنستا
بہت انمول ہے وہ دل
اجڑ کے پھر نہیں بستا
سنا ہے اس محبت میں بہت نقصان ہوتا ہے

وہ اس کی صلاحیتوں کی معترف تو ہو ہی چکی تھی اسے قائل کرنا بھی آتا تھا اور اپنے حق میں ہموار کرنا بھی۔ اس کی بحث، اس کی گرفت، سب دھری رہ گئیں۔ حوالہ ہی اتنا مضبوط تھا۔

مذہب کا اور وہ اللہ کی حدوں کو پھلانگنے کی جرأت تو نہیں رکھتی تھی۔ وہ غلام حسین کی رضا میں راضی ہونے کی بجائے اپنے رب کی رضا میں راضی ہوگئی تھی تو بے قرار دل کو بھی قرار میسر آ گیا تھا۔ ہاں محبت کو لڑنا تھا امن کی خاطر...... یہ بھی جہاد تھا قلم سے سہی۔ ایک دن حق کو بالآخر باطل پر غالب آ ہی جانا تھا۔ یہ خدا کا مرتب کردہ نظام تھا۔ غلام حسین اس سے ڈھیروں باتیں کیا کرتا۔ اپنی، اپنے بچے کی۔ اس کے مستقبل کی۔ اس کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے۔ اور ہر خواب دوسرے سے زیادہ خوش آئند اور روپہلا تھا۔ وہ اس کے تمام خوابوں کے پورا ہونے کی دعا مانگتی تو آنکھیں بھیگتی چلی جاتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں۔

☆☆☆

بہار رت میں اجاڑ رستے تکا کرو گے تو رو پڑو گے
کسی سے ملنے کو تم جب بھی سجا کرو گے تو رو پڑو گے
تمہارے وعدوں نے یار مجھ کو تباہ کیا ہے کچھ اس طرح سے
کہ زندگی میں جو پھر کسی سے دغا کرو گے تو رو پڑو گے
میں جانتا تھا میری محبت اجاڑ دے گی تمہیں بھی ایسے
برستی بارش میں یاد رکھنا تمہیں ستائیں گی میری یادیں
کسی ولی کے مزار پر جب دعا کرو گے تو رو پڑو گے

ابن زید نے گہرا سانس بھرا اور نگاہ کا زاویہ بدل کر مستعدی سے ملازمہ کو احکامات جاری کرتیں بی جان کو دیکھا۔ آج ایک عرصے بعد پھر اس گھر میں گہما گہمی تھی۔ سکندر اور اسوہ بھی صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اسوہ ابن زید کے نکاح کا سن کر کتنی حیران ہوئی تھی۔ بلکہ ابن زید نے اس کی نگاہوں میں مچلتے شکوے کو بھی دیکھا تھا۔

”کیا روشنی مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے ابن زید؟“

اسے جیسے ہی موقع ملا تھا وہ ابن زید سے سوال کرنے کھڑی ہوگئی تھی۔

”جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں نا اسوہ! پھر کیا تم سکندر کے ساتھ کوئی تشنگی محسوس کرتی ہو؟“

ان کے سوال نے اسوہ کو ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر انہیں تکتی رہی تھی پھر کچھ مزید کہے بغیر وہاں سے چلی گئی تھی۔ ابن زید نے ایک بار پھر سرد آہ بھری۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ضویا کی گزارش رد نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں تو اب کبھی بھولے سے بھی اپنی شادی کا خیال نہیں آتا تھا۔ جبھی تو انہوں نے اپنے طور پر روشنی کے لیے میرج بیورو اچھے رشتے کی بات کی تھی۔ اور فون

پر بات کرتے ہوئے انہیں ہرگز خبر نہیں تھی روشنی ان کی بات سن چکی ہوگی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ چوکھٹ پر ایستادہ تھی۔ یک ٹک انہیں تکتی ہوئی۔

”اس کا مطلب آپ میری ماں کو معاف نہیں کر سکتے“

اس کے سوال نے ابن زید جیسے بندے کو بھی سٹپٹا کے رکھ دیا تھا۔

”کیا مطلب“ وہ ٹھٹکے تھے۔

”اماں نے آپ سے جو گزارش کی تھی۔ اسے نہ ماننے کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے بھلا“

اس کا لہجہ غمگین اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”میں انہیں معاف کر چکا ہوں روشنی! بہت عرصہ قبل سے ہی“

انہوں نے جانا تھا وہ لڑکی اپنی ماں کے ماضی سے بے خبر نہیں تھی۔

”میں آپ پر ہرگز کوئی جبر نہیں چاہتا“

”آپ سے کس نے کہا یہ جبر ہے؟ میں نے ساری عمر اپنی ماں کو آپ کو کھو دینے کے پچھتاوے میں مبتلا پایا تھا تو بہت کڑھتی تھی مگر آپ کو دیکھنے کے بعد مجھے ان کے نقصان کی وجہ سمجھ میں آئی ہے۔ آپ چاہیں گے میری ماں کے بعد میں بھی اسی کڑھن کا شکار رہوں؟ کیا آپ مجھے اس قابل نہیں پاتے کہ میں آپ کی رفاقت کا شرف حاصل کر لوں؟“

اور ابن زید کے پاس انکار کا جواز ختم ہو گیا تھا۔ ان کا خیال غلط تھا۔ ضویا کی بیٹی واقعی یکسر مختلف سوچ کی مالک تھی۔ وہ اس کی طرح ان کی رفاقت پر شرمندگی نہیں فخر محسوس کر سکتی تھی۔ بی جان سے سکندر نے بات کی تھی اور ابن زید کی آمادگی جان کر بی جان پہ صحیح معنوں میں شادی مرگ طاری ہوئی تھی اور یوں چند دنوں کے اندر ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ ابن زید اپنے کمرے میں آئے تو گلابی جوڑے میں وہ چنبیلی کے پھولوں جیسی نازک لڑکی انہیں کی منتظر تھی۔

”آپ نے میری اس دن کی بات چیت سے میرے متعلق کہیں یہ قیاس تو نہیں کر لیا تھا ابن زید کہ میں بہت بے باک لڑکی ہوں“

انہیں روبرو پا کے اس نے پہلا سوال ہی یہی کیا تھا۔ ابن زید نے دھیان سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”میں ایسی ہرگز نہیں ہوں ابن زید؟ بس آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں تھا جبھی جانے کیسے یہ سب منہ سے پھسل گیا تھا“

اور ابن زید کو اپنے پندار کی حفاظت کرتی ہوئی وہ نازک لڑکی مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

''روشنی شادی کے بعد میں آپ کو کراچی لے کر چلوں گا۔ وہاں میں آپ کو اپنے بیٹے سے ملواؤں گا۔ غلام حسین سے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے''

''کیا مطلب! آپ کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی؟''

ابن زید ہنس دیئے۔ بڑی بے ساختہ ہنسی تھی۔

''وہ میرا بھتیجا ہے مگر مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔''

انہوں نے اسے رونمائی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا تو روشنی نے جھینپ کر سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔ دیا کا دل صبح سے ہی گھبراہٹ کا شکار تھا جانے کیوں دل واہمے اور خدشات لیے دھڑکتا تھا اور اسی وہم کی وجہ سے اس نے غلام حسین کو مختلف حیلوں بہانوں سے گھر روکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

''افوہ یار اتنا اہم کام ہے۔ آج تو بالکل نہیں رک سکتا۔ پرامس جلد آ جاؤں گا''

اس کا گال سہلا کر وہ دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا جب دیا نے بے اختیار اس کی کلائی تھام لی۔

''پلیز غلام حسین آج نہ جائیں۔ ایکچوئلی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے''

اور غلام حسین پھر خفا ہونے لگا۔

''تو ہم پرستی گناہ ہے دیا! کم آن یار''

وہ اسے بہلا کر، سمجھا کر بالآخر چلا گیا تھا۔ اور وہ پیچھے اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل کو سنبھالتی رہ گئی تھی پتا نہیں کیوں اسے رونا آنے لگا۔ حالانکہ وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر غم گلے میں اٹکتا جا رہا تھا۔

پاک سر زمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد

غلام حسین کے سیل فون پر نغمہ گونجا تب وہ زور سے چونکی۔ وہ عجلت میں اپنا سیل بھی گھر پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے تکیئے کے نیچے وائبریٹ کرتے سیل فون کو اٹھایا۔ اسکرین پر سویٹی کا نام جگمگا تا تھا۔ دیا جانتی تھی یہ وہی لڑکی ہے جو آج کل غلام حسین کی فیور میں ہے۔

دیا نے کال ریسو کر لی تھی۔

''محبّ!!! محبّ کہاں ہو تم؟''

نسوانی آواز پر گھبراہٹ و سراسمیگی کا غلبہ تھا۔

''محبّ تم سن رہے ہو۔ اگر تم گھر سے باہر نہیں گئے تو کہیں مت جانا پلیز لِسن محبّ! ان لوگوں کو سب پتا چل گیا ہے محبّ!!!

وہ چیخی تھی اور دیا ساکن رہ گئی۔

''وہ ابھی باہر نکلے ہیں''

''واٹ؟'' سویٹی زور سے وحشت بھرے انداز میں چیخی!

''مائی گاڈ! کیا وہ اپنا سیل گھر چھوڑ گیا ہے؟ اوہ نو''

اگلے لمحے رابطہ منقطع ہو گیا۔ دیا سیل فون ہاتھ میں لیے دل کو اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس کرتی وہیں بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ضدی تھا۔ وہ من مانی کرتا تھا۔ وہ جلد باز بھی تھا۔ یہ اس کے بارے میں سویٹی کے خیالات تھے۔ سویٹی کا خیال تھا محبّ کو اتنی جلدی یہ قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ مگر وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس وقت کے لیے اس نے پانچ سال کا طویل انتظار کیا تھا۔ اس نے اپنے نئے کالم میں اس گینگ کے سربراہ سے لے کر تمام ارکان کے نام اور ان کی تمام سرگرمیاں بھی آشکار کر دی تھیں صرف یہی نہیں حکومتی اعلیٰ عہدیداروں اور پولیس کے اعلیٰ احکام میں جو ان کے معاون و مددگار تھے ان سب کو بے نقاب کر دیا تھا۔ سویٹی کے خیال میں یہی اس کی غلطی تھی اور جلد بازی بھی، جو اس کے شدید نقصان کا باعث بن گئی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو احمق لڑکی میں نے جلد بازی سے کام لیا؟ اب بھی اگر میں ایکشن نہ لیتا تو پھر کب؟ کب آئے گا وہ وقت......؟ تمہیں پتا ہے میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے کچھ نہیں پتا میں کتنا جیوں گا۔ میں اپنا فرض ادا کر دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے بھی کہ مجھے ابھی اور بھی بہت سے کام نپٹانے ہیں''

سویٹی بھاگم بھاگ اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ایک کوشش کر لینا چاہتی تھی گو کہ یہ بہت مشکل تھا۔ مگر وہ تشنگی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اسے پتا تھا محبّ اسے کہاں مل سکتا تھا۔ اسے گھر سے نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے اپنا حلیہ بدلتا تھا پھر اخبار کے آفس جایا کرتا تھا وہ گمنام سپاہی تھا۔ وہ منظر پر آئے بغیر ہی سارے کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے حساب لگایا اب تک وہ اپنے اس کوارٹر سے چینج کرنے کے بعد نکل چکا ہوگا۔ اس کے گینگ کے لوگ محبّ کی ایک ایک

منٹ کی مصروفیت سے آگاہ تھے۔ اس نے اندازہ کرنا چاہا۔ وہ ابھی اخبار کے دفتر کے راستے میں ہوگا۔ اس نے شارٹ کٹ اختیار کیا وہ محبّ سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ شکاری کتوں کی طرح محبّ کے خون کی بو سونگھنے وہاں پہلے سے گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے۔

''پتا نہیں قدرت کو کیا منظور تھا۔ پتا نہیں محبّ آج ہی گھر پر سیل فون کیوں بھول گیا تھا''

اسے بہت ساری باتیں سوچ کر رونا آنے لگا۔ معاً اس کی نگاہ ٹھٹکی تھی ''ہنڈا جی ایف سیون ٹی'' پر وہ محبّ عبدالقدوس ہی تھا اس کے گلے میں بازو کے نیچے سے ہو کر کمر سے لگا اس کا چمڑے کا مخصوص بیگ اس کی شناخت کو کافی تھا پھر وہ تو اسے لاکھوں کے مجمع میں بھی ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کھوج سکتی تھی۔ وہ ٹھٹک گئی اس نے پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کر کے اسے آواز دی۔ ٹریفک اور ہارنز کے شور کے باوجود محبّ تک اس کی آواز یقیناً پہنچی تھی کہ دیگر راہ گیروں کے ساتھ اس نے بھی چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''محبّ!''

وہ یونہی اسٹارٹ گاڑی اور کھلا دروازہ چھوڑ کر اس کی جانب بھاگی تھی۔ اس نے وہ گاڑی بھی دیکھ لی تھی جس میں وہ منحوس و مکروہ آدمی محبّ کے لیے مسلح ہو کر گھات لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔

''محبّ! محبّ......!'' رک جاؤ''

وہ اندھا دھند اس کی جانب بھاگنے لگی وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسے اپنے وجود میں چھپا لینے کی متمنی تھی۔ وہ خود اس پر دیوانہ وار نثار ہو کر اسے بچا لینے کی خواہش مند تھی۔ مگر اس کی تمام خواہشیں اس کی محبت کی طرح سے تشنہ رہ گئیں کلاشنکوف سے نکلی آتشیں گولیوں نے محبّ تک پہنچنے سے قبل ہی اسے تڑپا کر زمین پر گرا دیا تھا۔ بغاوت اور سرکشی کی سزا پا کر وہ خاک و خون میں مل گئی۔ غلام حسین جو یہ سب کچھ دیکھ کر ششدر تھا خود کو سنبھالتے ہوئے بائیک چھوڑ کر اس کی جانب بھاگا تھا اور عین اسی پل جب وہ سویٹ سے دو قدم کے فاصلے پر تھا اس کے سینے اور سر پر تڑ تڑ گولیاں آ کر لگی تھیں اور وہ تیورا کر گرتا چلا گیا تھا۔ معروف شاہراہ پر پل بھر میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی نے خوف و ہراس اور افراتفری مچا دی۔ خاک و خون میں لت پت دو لاشے تڑپ کر ساکت ہو گئے تھے۔ سفید مرسڈیز غائب ہو گئی تھی اور فضا میں اپنی اڑان بھول جانے والے پرندے اس قوم کی بے حسی پر ماتم کناں تھے جنہوں نے ایک اور عظیم محسن کو کھویا تھا اور قیامت کی سی نفسا نفسی کے ہمراہ بے حسی اوڑھے پاس سے گزرتی جا رہی تھی۔ ایک کہانی ختم ہو گئی تھی۔ غلام حسین کی موت صرف اس کی موت نہیں تھی اگر سمجھا جاتا

تو یہ ایک ''خواب'' کی موت تھی ایک سپنے کی بھی موت تھی۔ ایک تبدیلی کے خواہاں نے اپنے حصے کا فرض ادا کر کے آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

اے قلم ٹوٹ جا!
اے سخن رشتہء حرف جسم و جان سے چھوٹ جا
آج کوئی بہانہ نہیں چاہیئے
بلبل باغ افکار خاموش ہے
آج شامِ غزل بھی سیاہ پوش ہے

ایک قیامت تھی جو ٹوٹ پڑی تھی۔ کوئی طوفان تھا جو آ کے گزر گیا تھا۔ مگر اپنے پیچھے تباہی کے سب آثار چھوڑ گیا تھا۔ 2 مئی 2011ء کا دن محبّ عبدالقدوس کی شہادت کا دن تھا جس نے میڈیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ابنِ زید کو یہ خبر سرتاپا لرزا کے رکھ گئی تھی۔ مگر ان کی نمناک آنکھوں میں مسکراہٹ بھی بکھری تھی۔

''الحمدللہ!'' آپ مبارک باد کے مستحق ہیں بھائی! غلام حسین نے اپنی منزل پا لی ہے۔ اس کا شمار ان خوش بخت لوگوں میں ہوا جو چنے ہوئے لوگ ہیں اور موت جن پر فخر کیا کرتی ہے''

عبدالعلی صبر و استقامت کی تصویر تھے۔ اس کی شجاعت اور اس کے کارنامے قابل فخر بات تھی ان پر تو اس کی شہادت کے بعد اس کی حقیقت کھلی تھی۔ کتنے شاکی رہا کرتے تھے اس سے......

انہوں نے محبّ کی مما کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''رونا نہیں ہے آپ کو...... آپ کے بیٹے نے اس مقام کو پایا ہے جس کی لوگ آرزو کرتے ہیں اور یہ ہر کسی کا نصیب نہیں بنتا۔ آپ رب العزت سے دعا کریں۔ خدا اس کی اس قربانی کو قبول فرمائے، آمین!''

ان کی نگاہیں غلام حسین کے سینے کے زخموں پر تھی۔ جن سے ابھی تک خون بہہ بہہ کر سفید کفن کو بھی تیزی سے رنگین کرتا جا رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے نور کی کرنیں سی پھوٹتی تھیں اور اس کے جسم سے انوکھی خوشبو آتی تھی۔ ابن زید نے جھک کر اس کی پیشانی پر آخری بوسہ ثبت کیا تھا پھر آہستگی سے سرگوشی کی۔

''مبارک ہو بھتیجے! تم ایک بار پھر اپنے چاچو سے جیت گئے ہو''

پھر وہ پوری آن بان شان کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ جو کہا کرتا تھا۔

مجھے پتا ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں ہٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے رو ٹکڑوں سے
فصیلِ دشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں میرا شعلہ
چمک کے ذوقِ غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا
میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی کی سحر نہ ہوگی
مگر میں پھر بھی
سیاہ شب کا غبار بن کے نہیں جیوں گا۔

اس نے اپنا کہا نبھا دیا تھا۔ ابن زید کو لگتا تھا اس کی آواز کی بازگشت فضاؤں میں سرسرا رہی ہو۔ جب وہ اپنی مخصوص سنجیدگی اور متانت سمیت گنگنایا کرتا تھا۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم
اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
اے درد بتا کچھ تو ہی پتہ
ہم سے تو یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بے تاب پنہاں
یا آپ دلِ بے تاب میں ہم

اس کی آواز کا درد ہر سو پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ رات بہت بوجھل تھی۔ مگر ایک ویران علاقے میں اوپر مشرقی پہاڑیوں کی بلندی پر بنے گلابی ریسٹ ہاؤس میں مقیم ملک دشمن گروہ نے ''محبِ عبدالقدوس'' کی شہادت کی خبر پا کر رات بھر ''بلیک ہارس'' اور ''رائل سیلوٹ'' کی بوتلیں کھول کر بھرپور جشن منایا تھا۔ یہ خوبصورت ریسٹ ہاؤس جو بے شمار گلابی خودرو پھولوں میں گھرا ہونے کی وجہ سے گلابی ریسٹ ہاؤس کہلاتا تھا۔ جہاں ''غلام حسین'' نے قید ہونے کے بعد ٹارچر سیل میں ایک کٹھن وقت بہت جوانمردی سے گزارا تھا اس ساری رات اس ریسٹ ہاؤس

میں قہقہے گونجتے رہے تھے۔ جبکہ کراچی میں غلام حسین کے گھر میں اہل خانہ افراد کی آنکھیں اس کی یاد میں بار بار نم ہوتی رہیں۔ لیکن بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو وہ پلکوں پر آنے سے روک دیتے کہ شہدا مرا نہیں کرتے۔ لیکن بادل ساری رات روئے تھے۔

☆☆☆

ساتھ چلنے والے جب
ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
وقت تھم نہیں جاتا
کوئی مر نہیں جاتا
کوئی مر بھی جائے تو
زندگی نہیں رکتی
راستوں کو چلنا ہے
راستے تو چلتے ہیں
یار دوست ملتے ہیں
زخم ایسے سلتے ہیں
گرد گرد لمحوں میں
عمر کٹ ہی جاتی ہے
کچھ مسافروں کو بس
منزلیں نہیں ملتیں

سکندر نے ایک گہرا یاسیت آمیز سانس بھرا اور جھکا سر اٹھا کر شاکی نظروں سے ابنِ زید کو دیکھا تھا......

''آپ کو اندازہ نہیں ہے ابن زید آپ میرے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکے ہیں'' کیا حرج تھا بھلا اگر اس دن آپ مجھے ذرا سا اشارہ ہی دے دیتے کہ غلام حسین ہی درحقیقت محب عبدالقدوس ہے''

سکندر کو کل واپس کشمیر چلے جانا تھا وہ جانے سے قبل ابن زید سے ملنے آیا تھا تو ساری بات کھلنے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ابن زید سے خفا ہو گیا تھا۔

''غلام حسین کو یہ بات پسند نہیں تھی اسے اپنا صالح عمل ظاہر کرنا پسند نہیں تھا۔ سکندر

بابا! وہ حسینؓ کا غلام تھا۔ وہ انہی کے انداز میں حق کے سامنے ڈٹ جانا چاہتا تھا۔ باطل کے سامنے جھکنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبھی وہ ڈٹ گیا تھا۔ اگر ہم سمجھیں، اگر ہم سوچیں تو اس میں ہمارے لیے ہماری قوم کے لیے آئندہ نسلوں کے لیے پیغام ہے...... دنیا سے ابھی اچھائی ختم نہیں ہوئی ہے سکندر بابا! ہر جنم لینے والے بچے کی پیدائش اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ابھی دنیا والوں سے مایوس نہیں ہوا"

اور سکندر نے پوری آمادگی سمیت سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ اور جب وہ وہاں سے اٹھ کر اسوہ کے پاس آیا تو اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستگی و نرمی سے بولا تھا۔

"تمہیں غلام حسین نام کیسا لگتا تھا ہے اسوہ؟"

پھر اس کا جواب سنے بغیر بولا تھا۔

"پھر تو اسوہ حسینؓ کا مرتبہ اور مقام کتنا اعلیٰ ہے۔ اس نام کی نسبت ہی ہے جو مسلمان کو شجاعت و دلیری اور حق کے لیے ڈٹ جانے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ایک واقعہ سناتا ہوں تمہیں۔ مسٹر برائن امریکیوں کا سامان لادنے میں مصروف رہا۔ اور مسلمانوں کو اہمیت نہ دی۔ درمیان میں کیپٹن غلام حسین نے ایک دو بار اسے توجہ دلائی کہ "پاکستانیوں کا سامان بھی لوڈ کرا دے" لیکن اس نے ان سنی کر دی۔ جب فارغ ہوا تو اس نے سامان کے وزن کی جمع تفریق کے بعد بے پروائی سے کیپٹن غلام حسین سے کہا "پاکستانی تو اس پرواز سے نہیں جا سکتے"

"کیوں نہیں جا سکیں گے" کیپٹن غلام حسین نے مسٹر برائن کی ناک سے ناک ملا کر دانت پیستے ہوئے پوچھا۔ ایک تھرڈ ورلڈ ملک کے ایک جونیئر فوجی سے مسٹر برائن کو قطعاً اس اشتعال انگیز رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ترلے منتیں کروانے کے بعد وہ پاکستانیوں کو آئندہ کسی پرواز سے بجھوا دے گا۔ لیکن غلام حسین سیاست دان تو تھا نہیں اس نے ایک پاکستانی کو آواز دی۔

"بہار ذرا یہ اسٹین گن دینا مجھے!"

یہ ذات شریف جن کا نام بہار تھا بڑے مستعد ثابت ہوئے۔ انہوں نے اسٹین گن کا رخ آسمان کی طرف کیا، اسے کاک کیا، سیفٹی کیپ اتارا اور کیپٹن غلام حسین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

Gun Load, Cocked Safty Catch Removed

غلام حسین نے اسٹین گن پکڑتے ہوئے مسٹر برائن سے پوچھا۔

"ہاں مسٹر برائن پاکستانی کیوں نہیں جا سکتے اس فلائٹ سے"

مسٹر برائن نے دور اک نظر گوروں کی طرف دیکھا جو کتوں اور لڑکیوں کی چاپلوسی میں مصروف تھے۔ اور پھر پاکستانی فوج پر نظر کی جو پاس ہی نظم و ضبط سے اپنے افسروں کے اگلے احکامات کے منتظر کھڑے تھے۔

تب ان کی بے پروائی کافور ہو گئی۔ انہوں نے گھبرا کر کہا تھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو جائیں گے، جائیں گے، اسی فلائٹ سے جائیں گے"

پورے واقعہ میں چند سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ دو اہم ملکوں کی خارجہ پالیسی کن نشیب و فراز سے گزر گئی"

اسوہ میرے کہنے کا مقصد تم پر یہ واضح کرنا ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ کے نام کی نسبت اور ان کی غلامی کے صدقے کی کرامات ہیں کہ وہ انسان جری اور بہادری کی اضافی خوبیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں......"

آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی اپنے بیٹے کا نام غلام حسین رکھیں۔ اس لیے کہ آپ کو حسینؓ ابن علیؓ سے عشق ہے آپ کو غلام حسین یعنی محبّ عبدالقدوس سے محبت ہے۔ ہے نا؟"

وہ مسکرائی تو سکندر نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

"ڈونٹ وری سکندر ہم اپنے بیٹے کا نام غلام حسین ہی رکھیں گے۔ انشاء اللہ وہ بھی جہاد کرے گا۔ اور حسین ابن علیؓ کی نسبت سے خدا ہمارے بیٹے کو بھی بے خوفی اور حق کے لیے ڈٹ جانے کی خوبیوں سے مالا مال فرمائے گا"

انشاءاللہ! امین۔

سکندر نے صدق دل سے کہا تھا اور نم آنکھوں سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا بچہ اس کی گود میں آیا تھا اس نے غلام حسین کی خواہش پر بچے کو اسامہ کا نام دیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی تھی۔ زینب اور مستقیم جو عبدالرحیم تھا کی سادگی سے شادی کر دی گئی تھی۔ غلام حسین کے بعد مستقیم اسی راز داری سے اس اخبار کو چلا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سہی سب سنبھل گئے تھے بس وہی تھی جسے صبر کرنا نہیں آ رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کا طریقہ بھول گیا تھا۔ وہ چلا گیا تھا اس پر اپنی لازوال محبتوں کو آشکار کر کے۔ کتنے روپ تھے اس کے اور ہر روپ پہلے سے زیادہ دلکش اس نے بھیگتی آنکھوں کے گوشوں

کو صاف کیا تھا اور آنکھیں موند لیں۔ غلام حسین کے لہجے کی گھمبیرتا اس کی سماعتوں میں اترنے لگی۔ وہ اکثر اسے سنایا کرتا تھا۔

شب کے سب اسرار تمہارے
طاقت ساری آپ کے بس میں
ساری ذہانت آپ کی ہے
ہم مجبور نہتے سارے
پھر بھی ساتھ ہمارے ہیں
سب تاریخ کے دھارے
شب کے سب اسرار تمہارے
صبح کا نور ہمارا ہے
گم رستوں پر خون کے چھینٹے
راہ دکھاتے تارے ہیں
صبح کا نور ہمارا ہے

اس کے آنسو ایک بار پھر بہنے لگے۔

ہاں صبح کا نور ہمارا ہے انشاء اللہ! ہمارے اسامہ کی صورت، مستقیم بھائی کی صورت سکندر بابا کی صورت ابن زید کی صورت اور لاکھوں مجاہدین کی صورت جو اپنی اپنی جگہ پر حق اور سچ کی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

یہ امید روشن رہے گی تب تک جب تک نیک مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ جب تک امن نہیں ہو جاتا۔ انشاءاللہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہوگا۔ اور ہمارا پیارا وطن پاکستان ہمیشہ تابندہ سلامت رہے گا۔ انشاءاللہ!

وہ پاکستان جس کے قیام سے برسوں قبل ''حضورِ پرنور ﷺ نے ''قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ'' کے خواب میں آ کر نصیحت فرمائی تھی کہ آپ آزادی کی تحریک لڑیں'' یہ وہ پاکستان ہے۔ پھر دشمن کیسے اسے مٹانے کا سوچ سکتے ہیں۔ اگر خدا نے اسے مٹانا ہوتا تو مسلمانوں کو ستائیس رمضان المبارک کو تحفہ کے طور پر پیش نہ کرتا۔ پاکستان انشاءاللہ سلامت تا قیامت سلامت رہے گا۔ انشاءاللہ!

......❀......